

WWW.PAKSOCIETY.COM

# متاع دل

WWW.PAKSOCIETY.COM

نویسنہ: امیر راجہ



نام کتاب	.....	متاع دل
مصنف	.....	نبیلہ ابرار راجہ
ناشر	.....	گل فرزا احمد
مطبع	.....	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
پروف ریڈنگ	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کیوزنگ	.....	محمد زاہد ملک
سن اشاعت	.....	ساجدہ انیس احمد
قیمت	.....	جنوری 2013ء
	.....	500/-

بہترین کتاب چھوانے کیلئے رابطہ کریں: 0300-9450911

## متاع دل

رات کا دوسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آملہ کی تکلیف و اذیت اور کرب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ شریں اُس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ایک تجربہ کار دانی بھی اُن کے پاس موجود تھی وہ اپنے تئیں ہر کوشش کر رہی تھی جو آملہ کو اس تکلیف سے جلد نجات دلا سکے۔

”بھابھی آپ عمر کون کر دیں شہر میں۔“ دانت پدانت جہا کے تکلیف برداشت کرتے ہوئے اُس نے منت ریز نگاہوں سے شریں بھابی کی طرف دیکھا تھا۔ ”شریفاں بڑی تجربے کا رہے۔ اس سے بھی مشکل کیس ماس نے منٹوں میں نمٹائے ہیں۔ ویسے بھی رات کا وقت ہے عمر بھائی کو آتے آتے بھی چار پانچ گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ اور گنزیب یہاں ہوتے تو پریشانی کی بات نہیں تھی پر عین وقت پہ وہ بھی عمر بھائی کے ساتھ نکل گئے۔ خیر میں کچھ کرتی ہوں۔“ شریں اُسے پریشانی سے دیکھتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

آملہ کی زچگی کا وقت قریب تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر کے بتائے گئے حساب کے مطابق ابھی اُس کے ہاں ڈیلیوری میں بیس سے بچیس دن باقی تھے۔ یہی اطمینان تھا جس کی وجہ سے عمر زیب اور گنزیب بھائی کے ساتھ کاروباری معاملات نمٹانے شہر گئے ہوئے تھے۔ اگر انہیں پتہ ہوتا تو وہ ہرگز نہ جاتے۔ کیونکہ ڈاکٹر نے آملہ کے طبی معائنے کے بعد عمر زیب سے کہا تھا کہ ڈیلیوری کے کم سے کم دس بارہ دن پہلے آملہ کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا دینا ہے۔ عمر زیب جانے سے پہلے یہ کام کرنا چاہتے تھے۔ مگر آملہ نے خود ہی سہولت سے منہ کر دیا تھا کہ آپ واپس آئیں گے تو میں تب ہاسپٹل ایڈمٹ ہو جاؤں گی۔

پر اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی۔ عمر زیب کو گئے دوسرا دن تھا جب آملہ کو لیبر پین شروع ہوئی۔ رات کا وقت شہر گھنٹوں کی مسافت یہ تھا۔ شریں شریفاں دانی کو لے آئی۔ دیہات میں اُس کی بڑی شہرت تھی۔ چھوٹے موٹے کیس وہ آرام سے نمٹا لیتی تھی۔ پر آملہ کا کیس پیچیدہ تھا۔ شاہ زیب کی پیدائش کے بعد آملہ کے ساتھ کوئی پیچیدگی ہوگی تھی جس کی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔ تکلیف اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ شریفاں اُلٹے پاؤں باہر نکلی تاکہ شریں کو صورتحال بتا سکے۔

وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ حواس باختہ شریفاں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بھی اُس کے اطمینان میں سرفورق نہ آیا ”بی بی جی یہ مسئلہ میرے بس سے باہر ہے آپ چھوٹی مالکن کو شہر لے جائیں“ اُس نے اپنے تئیں صورتحال

..... ملنے کے پتے

وکیلیم بک پورٹ	رشید نیوز ایجنسی
اُردو بازار، کراچی	اخبار مارکیٹ اُردو بازار، کراچی
خزینہ علم و ادب	مشاق بک کارز
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور	الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی	کتاب گھر
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی
کلاسیک بکس بوہڑ گیٹ، ملتان	کشمیر بک ڈپو، تلہ گنگ روڈ، چکوال
رائل بک کمپنی	مکتبہ رشید یہ چھتر مارکیٹ
نیل داد پلازہ، کمیٹی چوک راولپنڈی	چکوال فون: 0301-5785262

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متنق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کیوزنگ طباعت، صحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

لے حساب۔ سے درست مشورہ دیا تھا۔ اور سنی ویب ہے شریں کا لہجہ بہت معنی نیر تھا۔ جو اب میں شریفاں نے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ اچھا تم جاؤ میں ڈرائیور کو جگاتی ہوں ساتھ ہی عمر بھائی کو فون کر کے بتاتی ہوں۔ وہ بیڈ سے اٹھ گئی اور اُسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ شریفاں حکم کی تعمیل میں دوبارہ آنکھ کے پاس واپس آ گئی۔ جو درد و اذیت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ایک ٹائیے کے لیے شریفاں کا دل لرز سا گیا۔ کیونکہ شریں بی بی کے ارادے اور تیور کچھ اور ہی لگ رہے تھے جبکہ ہر گزرنے والے منٹ کے ساتھ آنکھ کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اگلا پورا گھنٹہ شریں نے بظاہر بڑے ہنگامی اقدامات میں گزارا۔ عمر زب اور اورنگزیب کو فون کیا۔ دونوں بھائی سوئے ہوئے تھے۔ شریں نے فون کرنے میں پورا آدھا گھنٹہ لگایا۔ فون کے بعد ڈرائیور دلدار کو حکایا۔ ادھر عمر زب شریں بھابھی کی کال ریسیو کرنے کے بعد سے سخت مضطرب تھا۔ اُس نے بار بار بھابھی سے تاکید الیفاظ میں کہا کہ آنکھ فوراً ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کریں۔ اورنگزیب بھائی بھی جاگنے لگے تھے۔ عمر زب نے آنکھ کا کیس ہینڈل کرنے والی لیڈی ڈاکٹر کو فون کر دیا تھا۔ اُس کا اپنا جدید سہولیات سے آراستہ ہاسپٹل تھا۔ آنکھ ایک بار خیریت سے ہاسپٹل تک جاتی تو باقی کا مسئلہ نہیں تھا۔

☆☆☆

عمر زب مضطرب انداز میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ موسم میں اچھی خاصی خشکی تھی مگر وہ لا پرواہ تھا۔ اس وقت اُس کی ساری حیات سمٹ کر آنکھ کی طرف متوجہ تھی۔ آنکھ اُس کی عزیز از جان محبوب بیوی اُس کے دکھ سکھ کی ساتھی۔ اُس کے پیارے سے بیٹے کی ماں۔ وہ دوبارہ تخلیق کے کربناک مراحل سے گزر رہی تھی اور اس سے وہ اُس سے بہت دور تھا۔ وہ اکیلے دکھ، درد اور اذیت جھیل رہی تھی۔ وہ اُس کے پاس ہوتا تو اذیت اور تکلیف میں کمی تو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اُس کی ڈھارس تو بندھا سکتا تھا۔ اپنی محبت سے اس اذیت اس کرب کو کم تو کر سکتا تھا۔ اُس نے انوس سے ہاتھ ملے۔ ایک پرانا منظر زندہ ہو گیا تھا جب آنکھ رخصت ہو کر اُس کے پاس آئی تھی۔ تب عمر نے زندگی بھر دکھ درد میں اُس کا ساتھ دینے کا عہد کیا تھا۔ اور آج وہ اکیلی تھی۔ کاش وہ نہ آتا آنکھ کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا کے آتا۔ مگر اُس وقت آنکھ نے ہی بڑی سہولت اور نرمی سے انکار کر دیا تھا۔ وقت گزر رہی نہیں رہا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں بھی جیسے رک رک کے چل رہی تھی۔ اورنگزیب جاتی اُس کی حالت دیکھ کر خود پریشان تھے۔ عمر زب انہیں سونے کا بول کر خود داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ آسمان پہ بادل جمع ہو رہے تھے۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اُس نے ایک نظر آسمان کو دیکھا جہاں بادل برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ ”الہی خیر“ جانے کیوں اُس کا دل سکڑ سا گیا۔ اُس نے دوبارہ کمرے میں آ کر جیکٹ پہنی اور حویلی فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ آنکھ کو ابھی کچھ دیر پہلے شریں بھابھی کے ساتھ گھر سے لے جایا گیا ہے۔ اُسے سخت غصہ آیا۔ شریں بھابھی نے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے فون کر کے اطلاع دی تھی۔ اس حساب سے انہیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے تھا اور کال ریسیو کرنے والی ملازمہ بتا رہی تھی کہ وہ لوگ ابھی ابھی روانہ ہوئے ہیں۔ اُس نے غصے سے ریسیور کر ڈیل پر پٹھا۔

”کاش کاش میں شہر نہ آتا۔“ اُس نے سر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔

☆☆☆

گاڑی نارمل رفتار سے سیاہ کولتار کی سڑک پر اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ سپید سحر نمودار ہونے کی تیاری میں تھا۔ آنکھ کی گاڑی مائل رنگٹ پہ مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اب بالکل خاموش تھی۔ وہ تھے وقتے سے اب اُس پہ غشی طاری ہو رہی

ہاسپٹل کے باہر عمر زب بے تابانہ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ ساتھ اورنگزیب بھی تھا۔ آنکھ کو فوراً آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ ”بھابھی آپ اتنی دیر سے کیوں لائیں آنکھ کو“ عمر زب کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔ ”وہ گاڑی میں عین دقت پہ خرابی ہوگی ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی“ اورنگزیب بھی تھی گھر میں صرف ایک گاڑی ہی تو نہیں تھی ناں.....“

یوں لگ رہا تھا عمر ابھی رودے گا۔ شریں چپ سی ہوگی۔ ”میں نے اپنی طرف سے کوئی کمی اور کسر نہیں چھوڑی یہ شریفاں ساتھ تھی اُس نے ہر ممکن طور پر آنکھ کا ساتھ دیا بس آنے سے کچھ دیر پہلے ہی آنکھ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔ ورنہ پہلے سب ٹھیک تھا۔“ شریں کا لہجہ غلط بیانی کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں لڑکھڑایا نہ کمزور ہوا۔ عمر زب کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ طویل کوریڈور میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پہ بیٹھ گیا۔ اورنگزیب بھائی نے بازو اُس کے کندھے پر پھیلا دیا۔ ”حوصلہ کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔ آنکھ بھابھی کے لیے صحت و زندگی مانگو“ وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اس وقت اُس کا رواداں رواداں آنکھ کے لیے دعا گو ہے۔ خاصی دیر گزر چکی تھی۔ آنکھ کو آپریشن تھیٹر میں لے جائے ہوئے۔ عمر زب کو اپنی ہر آتی جاتی سانس بوجھ لگ رہی تھی۔ اُس کو اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں وقت کیا دکھانے والا تھا۔

یوں لگ رہا تھا وہ پل صراط پہ کھڑا ہے اور بس اُس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ انہی خیالات میں غلطیاں تھا وہ جب نرس کے ساتھ ڈاکٹر روبینہ اُن تینوں کی طرف آئی۔ عمر زب میکا کی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر روبینہ کا چہرہ سنجیدگی و افسردگی کی تصویر بنا تھا۔ ”اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے آپ کو۔ مگر فی الحال آپ اُسے نہیں دیکھ سکتے کیونکہ بیٹی ”انکو بیڑ“ میں ہے اُس کی حالت جیسے ہی تسلی بخش ہوتی ہے اُسے لے جائے گا۔ اور ایم سوری عمر صاحب ہم آنکھ کو نہیں بچا سکتے۔ آپ انہیں بہت دیر سے لائے اگر کچھ گھنٹے پہلے لے آتے تو شاید اللہ کرم کر دیتا۔ میں نے آنکھ کے حوالے سے ان تمام پراہمز سے آپ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اتنا لمبا سفر پھر آپ کی سز کی کنڈیشن۔ ہم کچھ نہیں کر پائے۔ اسی وجہ سے بیٹی کی حالت بھی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس وقت ڈاکٹر روبینہ کا چہرہ ایک پروفیشنل ڈاکٹر کا چہرہ ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ یہ چہرہ تو ایک مہربان عورت کا تھا۔

عمر زب کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا اُس نے ایک لفظ نہیں سنا ہے۔ اگر سنا بھی ہے تو یقین نہیں کیا ہے۔ بھلا آنکھ کیسے اُسے چھوڑ کے جاسکتی ہے۔ اُس نے تو وعدہ کیا تھا میں ہر حال میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ پھر اتنی جلدی وہ کیسے بھول گی سب کچھ۔

شریں کی آنکھوں سے چکتے آنسو، غم و الم کی تصویر بنا اورنگزیب کا چہرہ اور شریفاں کے بین عمر زب کو یہ حقیقت باور کرا چکے تھے۔ آنکھ کو سچ سچ اُسے چھوڑ کے جا چکی ہے۔ کویت میں جنم لینے والی آنکھ کا سفر پاکستان میں آ کر ہمیشہ کے

عمر زیب سرزمین پنجاب کے ایک روایتی چوہدریوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ پر اپنے خاندانی مزاج سے بالکل الگ اور غیر روایتی۔ اُن کے خاندان میں نوکری نہیں کی جاتی تھی۔ جدی پشتی زمیندار تھے اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ عمر زیب نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوکری کرنے کی ٹھانی تو بڑے چوہدری صاحب روایتی جلال میں آگے۔ پر عمر زیب بھی اُنہی کا بیٹا تھا اُس نے مخالفتوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک غیر ملکی کمپنی میں نوکری کرنی اور پانچ سال کے کنٹریکٹ پہ کویت آ گیا۔ اس کمپنی کا مالک شیخ عمار بن حیان تھا۔ آئلہ حیان اُس کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اکثر و بیشتر آفس آتی جاتی رہتی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس کی مڈ بھیڑ عمر زیب سے نہ ہوتی۔ وہ عیاش طبع اور دل پھینک نہیں تھا پر آئلہ میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ دل اُس کے نام کی مالا چھنے لگا تھا۔ اُس کی نگاہوں کا خاموش پیغام آئلہ حیان تک پہنچ چکا تھا۔ عش کی آگ دونوں طرف بھڑک رہی تھی۔ شیخ عمار بن حیان بے خبر نہیں تھا۔ اُس نے آئلہ کو روکنے کی کوشش کی پر اس چڑھتی ندی کے آگے بند باندھنا مشکل تھا۔ محبت کی جیت ہوئی اور آئلہ عمر زیب کی بیوی بن گئی۔

اس شادی کے لیے عمر زیب کو کتنے پاپڑ بیٹنے پڑے اُسے ہی پتہ تھا۔ پاکستان میں کوئی اس شادی کے لیے راضی نہیں تھا۔ پر عمر زیب بھی اڑ گیا۔ بڑے چوہدری صاحب کو بادل نخواستہ ہار ماننا پڑی۔

یہ شادی کویت میں سرانجام پائی۔ اور اپنی روایتوں کا سراو نچا رکھنے کی خاطر عمر زیب آئلہ کو ایک ہفتے کے لیے پاکستان بھی لایا۔ یہ ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اور اُسے دوبار کویت جانا پڑا۔ کیونکہ اُسے کاروباری معاملات کو بھی دیکھنا تھا۔ آئلہ کی شادی کے چار ماہ بعد شیخ عمار بن حیان اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اگر عمر زیب جیسا مخلص ہم سفر نہ ہوتا تو آئلہ کو باپ کی دائمی جدائی کے صدمے کو برداشت کرنا بہت مشکل ہوتا۔ خصوصاً اس حالت میں جب وہ ماں بننے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ آئلہ کی ماں تو پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ اب اُس کے لیے عمر زیب ہی سب کچھ تھا۔

شاہ زیب اُن کی محبت کی نشانی کویت میں ہی پیدا ہوا۔ عمر زیب پہ پاکستان واپس آنے کے لیے وباؤ بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ ادھر آئلہ کے رشتہ دار بھی اُس سے ناراض تھے کہ اُس نے ایک غیر ملک کے توجوان کو شریک سفر چنا ہے۔ عمر زیب واپسی کا سامان باندھ چکا تھا۔ کمپنی کا سارا انتظام و انصرام آئلہ اُس کے سپر کر چکی تھی۔ منیجر بہت قابل بھروسہ تھا۔ عمر زیب عارضی طور پر معاملات اُس کے حوالے کر کے ڈھیروں خواب لیے آئلہ اور ننھے شاہ زیب کے ساتھ واپس پاکستان آ گیا۔

اُن کا ویسا والہانہ استقبال نہیں ہوا جو اُن کے تصور میں تھا۔ اس سے پہلے آئلہ صرف چند دن کے لیے پاکستان آئی تھی۔ اُس وقت اُس کی ساس زندہ تھی سب کی نگاہوں میں اُسے پیاری نظر آیا۔ یہ بھی محض اُس کی نظر کا دھوکا تھا۔ اب مستقل طور پر یہاں رہنا پڑا تو ایک ایک کر کے سب خوبصورت خواب چھنا کے سے ٹوٹتے چلے گئے۔

شریں بھابھی کی چھوٹی بہن بیٹا کا رشتہ بزرگوں کی ایما پر عمر زیب سے بہت شروع سے طے تھا۔ وہ آئلہ کی محبت میں ہر روایت کو توڑ بیٹھا پھر اب نفرتیں اُس کی منتظر تھیں۔ بیٹا کے گھر والے اُس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے شریں اس گھر میں اپنی بہن کی آمد کے سنے دیکھ رہی تھی جو عمر کی بغاوت نے چکھ چور کر دیئے۔ آئلہ ایک اٹل حقیقت تھی ویسے بھی بڑے چوہدری صاحب ابھی حیات تھے اُن کی وجہ سے دلوں میں چھپا زہر کھل کے سامنے نہ آسکا۔ عمر زیب کو

پاکستان آئے تیسرا ماہ ہو رہا تھا جب بڑے چوہدری صاحب جیسا مضبوط سہارا بھی اُس سے چھین گیا۔ لب وہ چاروں طرف سے مخالفتوں میں گھرا ہوا تھا۔ انہی حالات میں آئلہ دوسری بار امید سے ہوئی تو ڈاکٹر نے اُس کے معائنے کے بعد بتا دیا کہ اس بار بہت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ بازی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ گھریلو حالات اور نفرتوں کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ عمر زیب کا سہارا ہی اُس کے لیے سب کچھ تھا پر اُسے بھی غم دوران نے اتنی فرصت نہیں دی تھی کہ سکون سے آئلہ کے دل کی بات جان پاتا۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔

وہاں کویت میں اتنا بڑا برنس تھا پر اورنگ زیب بھائی اور شریں بھابھی نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ وہ وہاں جا ہی نہیں پارہا تھا۔ ورنہ دل اُس کا بھی کرتا تھا کہ آئلہ کو یہاں سے لے کر بہت دور چلا جائے۔ پر اورنگ زیب بھائی ہی اب خاندان میں بڑے اور کرتا دھرتا تھے اُن کا حکم ماننا بھی لازم تھا۔ ویسے بھی آئلہ اور عمر زیب کے ساتھ اُن کا رویہ بہت نرم تھا۔

وہ تو کہتے تھے کہ آئلہ اب اس گھر کی بہو ہے ہمارے گھرانے کی عزت ہے اسے ہماری روایتوں کا امین ہونا چاہیے۔ عمر زیب بھائی کا کہا کیسے ٹال سکتا تھا۔ اُس نے آئلہ سے کہا تھا کہ میں اب ساری عمر ادھر ہی گزاروں گا تم بھی سب رشتے بھول جاؤ۔ وہ شوہر پرست عورت سب کچھ بول کر شوہر کی خوشی میں خوش تھی۔ عمر زیب دل ہی دل میں کچھ پلان کر رہا تھا۔ آئلہ بہت بڑی جائیداد کی مالک تھی۔ وہ اُن کے سارے خاندان سے زیادہ دولت مند تھی۔ اس خوبی کی بنا پہ نوکیلی زبانوں نے آہستہ آہستہ ہر اُگلنا بند کر دیا تھا۔ اس کا کریڈٹ آئلہ کو ہی جاتا تھا جس نے اس پر اذیت ماحول میں بے مثال صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی تھی۔

عمر زیب سارا کاروبار پاکستان سیٹل کرنے کی فکر میں تھا۔ آئلہ نے کمپنی کے سارے شیئرز فروخت کرنے کو کہا تھا۔ اس سلسلے میں عمر کی کچھ اور کمپنیوں سے بات بھی ہو چکی تھی۔ آئلہ کی ڈیوری قریب تھی۔ وہ ابھی تک گاؤں میں ہی رہائش پذیر تھے۔ عمر شہر میں گھر بنوا رہا تھا جو تعمیر کے آخری مراحل میں تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ آئلہ نئے مہمان سمیت نئے گھر میں قدم رکھے۔ پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

آئلہ اپنے ابدی گھر روانہ ہو چکی تھی۔

آئلہ کو یہ دنیا چھوڑے تین ماہ گزر چکے تھے۔

شریں بھابھی، اورنگ زیب بھائی اور خاندان کے دیگر افراد نے عمر کی بھرپور لوجوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ آئلہ کی آخری نشانی کو عمر زیب نے متاع جاں بنا لیا تھا۔ بڑے چاؤ سے اُس کا نام "ڈریکٹا" رکھا تھا۔ شریں بھابھی نے شاہ زیب اور ننھی دریکٹا کو بہت اچھے طریقے سے سنبھالا تھا۔ اُن کی مدد کرانے کی خاطر بیٹا بھی حویلی آ جاتی۔ اُسے دریکٹا سے بہت پیار تھا۔ اُسے اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ آئلہ کی جگہ خالی تھی اور یہ خلا پُر ہونا ہی تھا۔ یہ اٹل حقیقت تھی کیونکہ اورنگ زیب بھائی عمر زیب کو بارہا دوسری شادی کا بول چکے تھے۔ وہ نہ انکار کرتا نہ اقرار بس خاموش ہو جاتا۔ اُس کی خاموشی میں ہزار ہا معنی چھپے ہوئے تھے۔ شاہ زیب ابھی صرف ڈھائی سال کا تھا اور ننھی دریکٹا چند ماہ کی۔ دونوں بچوں کو ماں کی آغوش کی ضرورت تھی۔

”عمر کیا سوچا ہے تم نے“ اور نگزیب بھائی اُسے بغور دیکھ رہے تھے۔ بیٹا بھی پاس موجود تھی اور دریکتا کو گود میں لٹائے لاڈ کر رہی تھی۔ ”بھائی جان میں شہر میں سیٹل ہونے کی پوری تیاری کر چکا ہوں۔ کمپنی کے سارے شیئرز میں نے فروخت کر کے ایک اور کارڈ ہار میں لگا دیئے ہیں۔ مجھے اب بزنس کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اپنے بچوں کو بھی دیکھنا ہے۔ فی الحال میں نے شادی کا سوچا ہی نہیں ہے۔ یہی بچے میری کائنات ہیں۔“ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر بول رہا تھا۔ شریں کی نگاہوں میں غصہ اُبل رہا تھا۔ اُسے مرکا فیصلہ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ بیٹا چار ماہ سے شاہ زیب اور دریکتا کو سنبھال رہی تھی۔ راتوں کی نیندیں حرام کر رہی تھی اور عمر نے یہ صلہ دیا تھا۔ وہ شہر جانے کی بات کر رہا تھا۔ اور واقعی اُس نے اپنا کہا پورا کر دیا۔ دو ماہ کے مختصر عرصے میں سب کچھ سمیٹ کر گاؤں کی حویلی خالی کر گیا۔

بیٹا ایک بار پھر روتی تڑپتی رہ گئی۔

اب اُس کی ساری اُمیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ گھر والوں نے اُس کا رشتہ زبردستی طے کر دیا۔ لڑکا کراچی میں سیٹل تھا اور بیٹا کی دور پرے کی خالہ کا بیٹا تھا۔ کھانا پیتا گھرانہ تھا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوا۔ حمزہ احمد کی بیوی ایک حادثے کا شکار ہو کر اپنے دو سالہ بچے باسٹا کو چھوڑ گئی تھی بیٹا نے مجبوراً حمزہ احمد کو قبول کیا۔

☆☆☆

عمر زیب نے شاہ زیب اور دریکتا کے لیے گورنس رکھ دی تھی مگر دوست احباب مشورہ دیتے کہ شادی کر لو۔ اس طرح بچوں کو ماں کا پیار بھی ملے گا۔ اور گھر کے لیے عورت کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے دوستوں کی مانتے ہوئے شادی کر لی۔ راحیلہ بہت اچھی بیوی اور ماں ثابت ہوئی۔ ایک بار پھر عمر زیب کی زندگی میں گھریلو سکون اور خوشیاں لوٹ آئیں۔ راحیلہ شاہ زیب اور دریکتا کی پرورش سگی ماں کی طرح کر رہی تھی۔ عمر کو ہر طرح کا سکون میسر تھا۔

اُس کی دوسری شادی نے شریں بھائی اور اورنگزیب بھائی کو ناراض کر دیا تھا۔ انہوں نے اُس سے ملنا جلنا ہی ختم کر دیا۔ عمر خود ہی ڈھیٹ بن کر گاؤں جاتا پر ان میں گرجوٹی ختم ہو گئی تھی۔ شریں کے اپنے شکوے تھے اب تو اورنگزیب بھی اُس کے ہمنوا بن چکے تھے۔

عمر زیب کی دوسری زندگی کی خوشیوں کا دور بھی مختصر ثابت ہوا۔ راحیلہ کو بلڈ کنسر تھا۔ اور آخری اسٹیج پہ تھا۔ شو منی قسمت کہ راحیلہ کے بطن سے عمر زیب کی کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔ شادی کے آٹھ سال بعد وہ بھی اُس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ شاہ زیب اور دریکتا سمجھدار تھے۔ خاص طور پہ دریکتا سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ حساس بھی تھی۔

راحیلہ نے اُن دونوں بہن بھائی کو ماں کا پیار دیا تھا۔ اُن کی پرورش، دیکھ بھال، تعلیم و تربیت میں اپنا تمام تر خلوص اور محبت صرف کی تھی۔ راحیلہ عمر زیب کی پسند یا محبت نہیں تھی۔ مگر اُن کے بھائی، بھابھیاں اس بات پہ ناراض تھے کہ عمر نے ایک بار پھر خاندان سے باہر کی لڑکی کو چنا ہے۔ شریں بھائی کو اپنا غم کھائے جا رہا تھا کہ عمر نے جینا کو دوسری بار ٹھکرایا۔ بڑھتے بڑھتے اُس کے دل کا یہ زخم ناسور بن چکا تھا۔ عمر کی دوسری شادی کے بعد اُس نے اورنگزیب کے دوسرے دو بھائیوں اور اُن کی بیویوں کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ عمر گاؤں آتا راحیلہ کے ساتھ دونوں بچوں کو بھی لاتا پر اُن سب کا رویہ اجنبیوں اور بیگانوں والا ہوتا۔ کوئی سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ راحیلہ ہنس ہنس کر اُس کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کرتی۔ اُس نے ہر طرح عمر کا بھرپور ساتھ دیا۔ اب شاہ زیب اور دریکتا دونوں دودھ پیتے بچے نہیں تھے۔ پاشور تھے۔ عمر

کی اس منزل پہ تھے کہ اپنا خیال خود رکھ سکتے تھے۔ مگر اُس کی دائمی جدائی عمر کے ساتھ ساتھ اُن دونوں بہن بھائیوں کے لیے بھی کسی سانچے سے کم نہیں تھی۔ یہ راحیلہ ہی تھی جس نے عمر زیب کو گھر کی طرف سے بے فکر کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے اُس نے اپنے بزنس کو بھرپور ترقی دی تھی۔ کیونکہ راحیلہ نے بچوں کی ماں کی کمی پوری کر دی تھی۔ شاہ زیب اور دریکتا نے پرسکون نارمل گھریلو ماحول میں پرورش پائی تھی۔ کوئی اور عورت شاید یہ سب نہ کر پاتی جو راحیلہ نے کیا تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو ماں کا پیار دیا تھا۔ بیٹا کی ساری توجہ اس بات پہ تھی کہ کسی طرح وہ ایک بار عمر کی بیوی بن جائے بعد کی بعد میں دیکھی جانی تھی۔ اسی وجہ سے تو وہ دریکتا کو اٹھائے اٹھائے پھرتی کہ عمر کی نگاہوں میں سما جائے۔ پر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُس کی تمام تر کوششوں کے باوجود اُس کی جگہ راحیلہ عمر کی ہم سفر بن گئی تھی۔ پر یہ صدمہ شریں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ عمر نے ایک بار پھر بیٹا کو ٹھکرایا تھا۔ اُس نے روتے دھوتے شادی کے لیے ہاں کی تھی۔ اپنے شوہر سے اُس کے لڑنے جھگڑنے کی خبریں ایک تو اتر سے شریں تک پہنچتی رہتی تھیں اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی۔ اب تو راحیلہ بھی نہیں رہی تھی۔ بچے جوان ہو رہے تھے۔

☆☆☆

سیٹی پہ شوخ سی دھن بجاتے ہوئے وہ آئینے میں خود کو دیکھتا بالوں میں برش کر رہا تھا۔ برش کرنے کے بعد اُس نے پر فیمو اٹھایا اور خود پہ اسپرے کیا۔ مکمل طور پر اپنی تیاری سے مطمئن ہونے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ڈاننگ نیبل پہ اُس کا انتظار ہو رہا تھا۔ عمر زیب نے فخر سے لمبے چوڑے شاہ زیب کو دیکھا۔ قد کاٹھ شکل دصورت میں وہ ہو سوان کی کاپی تھا۔ اُنہی کی طرح یونانی دیوتاؤں کا سا حسن سمیٹے اور مغرور کھڑی ناک روشن ہنسیں۔ ”اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے“ عمر زیب نے اپنی نظر لگنے کے ڈر سے ایک ٹاپیے کے لیے اپنی نگاہیں اُس کی طرف سے موڑ لی تھیں۔ ”بھائی جلدی کرو نا۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ دریکتا نے خفگی سے اپنی ستواں ناک سکیڑی۔ تب تک شاہ زیب کرسی گھسیٹ کر اُس کے مقابل بیٹھ چکا تھا۔

وہ جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ کالج پہنچنے کی جلدی تھی۔ دریکتا ادیول کر رہی تھی۔ ڈرائیور اُسے پہلے ڈراپ کرنے کے بعد پھر شاہ زیب کو کالج چھوڑتا۔ شاہ زیب ڈرائیونگ سیکھ چکا تھا۔ پر عمر نے ابھی تک اُسے ڈرائیونگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ مجبوراً وہ ہائیک چلا کر اپنا شوق پورا کرتا۔ عمر زیب اُس کے علم میں لائے بغیر ایک گاڑی اُس کے لیے پسند کر کے ادا کی بھی کر چکے تھے۔ چند دن بعد اُس کی سالگرہ تھی یہ تحفہ اُس مومنتے پر شاہ زیب کو ملنا تھا۔

☆☆☆

دریکتا اُسی کے انتظار میں تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔ واپسی ویر سے ہوئی۔ دریکتا اُس کے انتظار میں گیٹ کے آس پاس ٹہل رہی تھی۔ ”ابھی تک جاگ رہی ہو“ شاہ زیب نے پیار سے اُس کے سر پہ چپٹ لگائی۔ ”بھائی پپا گاؤں جا رہے ہیں“ اُس نے گیٹ کے ساتھ بنی پختہ روش پہ چلتے چلتے اُسے بتایا تو وہ رُک گیا۔ ”تمہیں کس نے بتایا؟“ ”بھائی خود پپا نے بتایا ہے کہ اُن کا گاؤں جانے کا بہت دل کر رہا ہے پچھلے دو سال سے وہ جانہیں پائے ہیں۔“ ”اچھا یہ تو نئی بتائی ہے تم نے“ چلتے چلتے شاہ زیب اپنے بیڈروم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ اندر آ کے دونوں بیٹھ گئے۔ ”بھائی میرا دل بھی کر رہا ہے جانے کو پپا کے ساتھ۔“ ”تو چلی جا ناں۔“ اُس نے جوتے اتارتے ہوئے مشورہ دیا۔ ”بھائی

تم بھی جاؤناں میرے ساتھ۔ اُس کے لہجے میں بے انتہا لالچا جنت تھی۔

”میں نہیں جاتا۔ پاپا پسند نہیں کرتے۔ میں تو آخری بار شاید چار سال پہلے گیا تھا گاؤں“ اُس نے حساب لگا کر بتایا۔ ”نہیں اگر ہم دونوں مل کر پاپا کو کہیں گے تو وہ مان جائیں گے“ بہت خوب تم اس لیے میرے انتظار میں تھی“ شاہ زیب فوراً معاہدے کی تہہ تک پہنچ گیا۔

وہ اُس کی چالاکی بھانپ چکا تھا۔ پپانے جانے کیوں اُن کا گاؤں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ کبھی کھل کر انہوں نے اس موضوع پر اظہار خیال بھی تو نہیں کیا تھا ناں۔

عمر زیب نہیں چاہتے تھے کہ رشتہ داروں کی اندرونی مخالفتیں اُن کی اولاد پہ عیاں ہوں۔ گزشتہ کچھ سالوں سے اُن کا گاؤں جانا نہ جانے کے برابر تھا۔ آخری بار جب وہ گئے تھے تو تینوں بھائیوں میں سے کسی نے بھی سلام دعا کے علاوہ اُن سے اور بات نہیں کی تھی۔ شریں بھابھی کا رویہ سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مجبوراً وہ آملہ کی قبر پہ فاتحہ خوانی کر کے لوٹ آئے تھے۔

اب اتنے سال بعد انہوں نے گاؤں جانے کا قصد کیا تو دیکھتا ہے بھی دے دے لہجے میں جانے کی بات کی تھی۔ ادھر سے کسی نے بھی ان ڈھائی سالوں میں چکر نہیں لگایا تھا۔ عمر زیب کا دل پھل رہا تھا اپنوں سے ملنے کو۔ اُن کے دل میں تو سب کی محبت موجود تھی۔ یہ محبت ہی تھی جو انہیں دہاں لے جاتی تھی۔ ادھر سے تو جیسے سب نے نہ آنے کی قسم کھالی تھی۔ اب دُر یکتا شاہ زیب کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ بھی پپا سے بات کرے تاکہ وہ راضی ہو جائیں۔

☆☆☆

عمر زیب نے باری باری اُن دونوں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں دُر دُر تک کسی ریا کاری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ دُر یکتا کے ساتھ ساتھ شاہ زیب نے بھی کہا تھا کہ وہ اُن کے ساتھ گاؤں جانا چاہتا ہے۔ اب فرار کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً وہ مان گئے۔ وہ کس طرح مانے تھے اُن کا دل ہی جانتا تھا۔

پہلے صرف اورنگ زیب ہی شریں کے کہنے میں آ کر اُس سے ناراض ہوئے تھے بعد میں باقی دونوں چھوٹے بھائی بھی اُن کے ہم خیال ہو گئے تھے۔ عمر زیب ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ سگے رشتوں کی یہ سفاک حقیقتیں اُن کی اولاد پہ عیاں ہوں۔ پردر دُر یکتا ضد کر رہی تھی اور ساتھ بھائی کو بھی ملا لیا تھا۔ ”تم دونوں اپنے کپڑے اور ضروری سامان رکھ لو۔ ہمیں کل صبح نکلنا ہے“

عمر زیب نے بالآخر حای بھر ہی لی۔ ”ادھ پاپا زندہ باد“ دُر یکتا اٹھ کر اُن سے لپٹ گئی۔

شاہ زیب بھی مسکرانے لگا۔

عمر زیب انہیں خوش دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھول گئے تھے۔

☆☆☆

کچا راستہ شروع ہو چکا تھا۔ گاڑی ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔ پُر ڈرائیور بہت ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔ عمران دونوں کو اپنی زمینوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ کچے میں ایک متروک کنواں تھا اُس پہ نظر پڑتے ہی عمر کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اُس سے کچھ آگے اُجڑا ہوا ڈیرا تھا جہاں کبھی بڑے چوہدری صاحب ٹھہلیں سجاتے تھے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ۔ اب تو کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔

دیر سے سے چھانے والے کا مکان پر اُن کی حضور دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ دُر یکتا اور شاہ زیب نے بھی اُن کی تقلید میں کھول کر نیچے اترے۔ وہ قبرستان کے داہلی دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ دُر یکتا اور شاہ زیب نے بھی اُن کی تقلید میں قدم اُن کے ساتھ ملا دیئے۔ عمر نے سب کی قبروں پر پہ فاتحہ خوانی کی۔ واپسی پر اُن کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ خود دُر یکتا کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔

ڈرائیور نے دوباراً گاڑی اشارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ اب سرسبز کھیت سامنے تھے۔ راستہ اب بھی کچا ہی تھا پر ہریالی نظروں کو بھار رہی تھی۔ دُر یکتا بڑی دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ بالآخر یہ طویل سفر لوہے کے بلند وبال اگیٹ کے سامنے اختتام پذیر ہوا۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا تو اندر سے چھوٹا اگیٹ کھول کر چوکیدار باہر نکلا۔ عمر زیب کو دیکھتے ہی ایشن شین ہو گیا زور دار سلام جھاڑا اور اگیٹ کھول دیا گاڑی اندر آ گئی۔ کبھی اس گھر کے درو دیوار کی ایک ایک اینٹ میں اپنائیت کی مہک تھی پر آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہوتا گیا۔ اب بس یادیں تھیں۔ عمر نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ادھر ادھر دیکھا۔ اُن کی آمد کی اطلاع گھر کے مکینوں تک پہنچ چکی تھی۔

ایک دراز قد گوری رنگت والی لڑکی اندرونی رہائشی دروازے سے باہر نکلی۔ اُس کا رخ انہی کی طرف تھا۔ کچھ ہی دیر میں اور بھی چہرے آنے والے مہمانوں کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ نوجوان نسل کی دلچسپی دُر یکتا اور شاہ زیب میں تھی۔ کچھ ہی دیر میں عمر چچا اور اُن کے لہجے چوڑے خوب روٹیے اور نازک سی بیٹی کی آمد کی خبر گھر کے ایک ایک مکین تک پہنچ چکی تھی۔

دُر یکتا اور شاہ زیب نے کافی عرصے بعد اپنے ان کزنز کو دیکھا تھا خاص طور پر دُر یکتا کا لگاؤ واضح طور پر محسوس کیا جا رہا تھا۔ اُن سب کا رویہ دوستانہ تھا۔ البتہ خاندان کے کرتا دھرتا ہنوز دل میں پرانی نفرت کے بیج اُگائے بیٹھے تھے۔ جن کی بھر پور فصل پک کر تیار تھی۔ اس نفرت کی فصل میں زہریلے نوکیلے کانٹے دار پھل تھے۔ جن کا ذائقہ دُر یکتا اور شاہ زیب نے فی الحال چکھا نہیں تھا۔

شریں اور گھر کی دیگر عورتوں کا رویہ مناسب ہی تھا۔ چچا لوگوں نے بھی سر پر ہاتھ پھیر دیئے تھے۔ تایا اور نگ زیب نے اپنے پورشن میں اُن تینوں کے لیے تینوں کمرے تیار کروا دیئے تھے۔ یہ سب ہنگامی حالات میں ہوا تھا۔ کیونکہ عمر نے اپنے آنے کی پیشگی اطلاع نہیں دی تھی۔ پھر بھی عمر کے نزدیک اُن کا رویہ غنیمت تھا۔

ہمارے رات کو دُر یکتا اور شاہ زیب کے لیے خود دودھ کے گلاس لے کے آئی۔ شریں چچی کی اس بیٹی کا رویہ اُن کے ساتھ باقی کزنز کی نسبت بہت ہی نرم اور خصوصی تھا اس وجہ سے دُر یکتا کو وہ اچھی بھی لگی تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب اور دُر یکتا ایک ہی کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مائے کو بھی دُر یکتا نے پاس بٹھالیا۔ ”آپ کیا کرتی ہیں مائے“ شاہ زیب نے پہلی بار پوری توجہ سے اُس کی سمت دیکھا۔ کیسی گھور نشلی روشن آنکھیں تھیں مائے نے نظر جرائی۔ میں کالج کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ایف ایس سی فرسٹ ایئر میں ہوں۔ اصل میں مجھے اس وقت تک ایف ایس سی کلیئر کر لینا چاہیے تھا مگر مجھے ایڈمشن لینے میں دیر ہوگی پھر میں یہاں کی تعلیم کے معیار سے مطمئن نہیں ہوں۔ ایک قریبی شہر کے کالج میں ایڈمشن لیا ہے۔ آتے جاتے ہی کافی نام لگ جاتا ہے۔ اُس نے تفصیل سے بتایا اور چہرے پہ آئے بال پیچھے کیے۔ مائے شاہ زیب سے کچھ چھوٹی ہی تھی اس لیے دُر یکتا اُسے آپ جناب کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ ”آپ ہمارے ساتھ

گزرتے شریں نے بھی سن لیا۔ وہ ادھر ہی آ رہی تھی۔ یہ بات سن کر اُس کے ہونٹوں پر معنی خیزی مسکراہٹ آ گئی۔  
ہلکے سے دروازہ بجا کر وہ اندر داخل ہوئی۔ شاہ زیب اُنہیں دیکھ کر مژدب ہو گیا۔ ”اور سناؤ کسی چیز کی  
ضرورت تو نہیں۔ ماڑہ کو بتا دو لے آئے گی۔“ اُن کے لہجے میں یکا یک در آنے والا پیار بے سبب نہیں تھا۔ ”نہیں تائی  
جان کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ ڈر یکتا اُنہیں درمیان پا کر خوش ہوگی۔ ”پھر تم لوگ باتیں کرو میں جا رہی ہوں۔  
دن بھر ہونے والی بھاگ دوڑ مجھے تھکا دیتی ہے۔“ وہ اُنہیں اس طرح باتیں کرتا جھوڑ کر اٹھ گئیں۔ ماڑہ رات ایک بجے  
کے بعد اپنے بیڈروم میں آ کر لیٹی۔ وہ بھی ایسے کہ اُس کی آنکھوں میں دردور تک نیند کے آثار نہیں تھے۔

ادھر در یکتا بھی شاہ زیب کے پاس سے اٹھ آئی تھی۔ اُسے پاس دل ہی دل میں کچھ شکوے ہو چلے تھے۔ کہ  
وہ اُنہیں اتنے عرصے بعد کیوں گاؤں لائے۔ یہاں تو سب کزنز شریں تائی سب کتنی محبت سے پیش آرہے تھے۔ تائی نے  
شکوہ بھی کیا کہ عمر جانے کیوں تمہیں گاؤں نہیں لاتا ہے اس لیے ہم بھی شہر اُس کے پاس نہیں جاتے کہ جب وہ خود یہاں  
آنا پسند نہیں کرتا تو ہماری آمد بھی اپنے گھر اُسے پسند نہیں آئے گی۔ در یکتا دل ہی دل میں کسی حد تک اُن سے متفق تھی۔  
شاہ زیب بھی دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔ معاً اپنے پاؤں کے نیچے اُسے کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا۔ وہ  
اٹھ کے بیٹھ گیا اور لائیٹ جلا کے دیکھا۔ یہ نازک سی پائل تھی۔ اُسے یاد آ گیا کہ یہ ماڑہ کی ہے کیونکہ وہی ادھر بیٹھی تھی۔  
اسی کی پائل تھی۔ لاک کھل جانے سے وہ اُس کے پاؤں سے اتر گئی تھی۔ در یکتا تو جیولری پسند ہی نہیں کرتی تھی یہ پائل  
ماڑہ کی ہی تھی۔ شاہ زیب نے ہاتھ میں پکڑ کر بغور دیکھا۔ یہ بہت نازک سی پائل تھی۔ جس میں چھوٹے چھوٹے نگ  
جزاے تھے۔ بعد میں شاہ زیب کو خود ہی ہنسی آئی کہ وہ کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ اُس نے سائینڈ نیبل کے پاس رکھ دی کہ  
صبح ماڑہ کے دے دے گا۔ بہت جلد وہ نیند کی وادیوں میں اتر تھا۔

☆☆☆

اُس کا دروازہ ہولے سے ناک ہوا۔ اجنبی جگہ پہ رات گزری تھی پھر بھی نیند اچھی آئی تھی۔ ہوش سنبھالنے سے  
پہلے ہی وہ پاپا کے ساتھ گاؤں سے کوچ کر گیا تھا۔ پھر کبھی کبھی آنا ہوتا۔ ہر رات ایسی مد ہوشی کی نیند سو یا کہ دن گیارہ بجے ہی  
دروازہ ناک کرنے پہ آنکھ کھلی۔ شاید ان درد دیوار میں اپنائیت مانوس سی تھی تب ہی تو وہ آرام سے سویا تھا۔ ورنہ اپنے  
کمرے اور بیڈ کے بغیر اُسے بڑی بے آرا ہی ہوتی تھی۔ اُس نے سلپنگ گاؤں پہن کر دروازہ کھول دیا سامنے ماڑہ کھڑی  
تھی۔ ”جاگ جائیے کزن۔ ناشتہ تیار ہے جلدی آئیے اور ہاں ویر مت کیجیے گا۔“ اُس کے لبوں پہ پُرکشش مسکراہٹ تھی  
تھی۔ شاہ زیب کو کھڑکی سے اندر آتی دھوپ یکا یک بہت ہی دل فریب سے محسوس ہوئی تھی۔ ”او کے میں آتا ہوں لیکن  
آپ کی ایک چیز میرے پاس ہے“ وہ وہیں سے مڑا۔ ماڑہ اُس کے پیچھے کھلے دروازے سے اندر آئی۔ شاہ زیب نیبل پہ  
پائل ڈھونڈ رہا تھا۔ پردہ وہاں نہیں تھی۔ ”کون سی چیز ہے میری“ وہ بھی شاہ زیب کے پیچھے متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہی  
تھی۔ ”اسے رات کو یہ نیبل پہ ہی تو رکھی تھی کہاں گی۔“

سائینڈ نیبل کے پائے کے ساتھ کچھ چمک رہا تھا۔ شاہ زیب نے ہاتھ بڑھایا۔ اُس کی مطلوبہ پائل مل گئی تھی۔  
”یہ بی بی آپ کی پائل۔“ رات کو آپ یہاں بیٹھی نہیں غالباً اس کا لاک کھل گیا تھا جب ہی یہ گر گئی ہوگی۔ شاہ زیب نے  
پائل اُس کی طرف بڑھائی۔ ”میں صبح سے ڈھونڈ رہی تھی شکر ہے مل گئی۔ یہ پائل بہت پسند ہے مجھے۔ آؤ رہے ہو انی تھی۔“

اُس نے بے تابی سے پائل شاہ زیب کی سی سی اٹھائی اور پھر وہی ناک کا پاپا اٹھا کر پاس ادھر ہی بیٹھے۔ شاہ زیب  
نے آنکھ چرائی۔ ماڑہ کے تراوڑر کے پانچے خاصے کھلے تھے وہ اس طرح کر رہی تھی جیسے کمرے میں اکیلی ہو۔ اُس کی  
صاف شفاف دودھی پنڈلی بڑی دل فریب سی لگ رہی تھی۔ بالآخر وہ پائل پہن کر سیدھی ہوئی تو شاہ زیب قدرے دور  
ہٹ گیا۔ ”تھینکس کزن میں جاتی ہوں فریش ہو کے آپ فوراً آؤ۔“ ماڑہ خوش دلی سے بولتی دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔  
شاہ زیب شاد لیتے ہوئے اُسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماڑہ کی ننھے ننھے عکوں والی پائل اور شفاف  
دودھی پنڈلی اُس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھی۔

☆☆☆

ناشتے میں خاصا اہتمام تھا۔ مگر شاہ زیب قدرے شرمندہ تھا کیونکہ وہ خاصی دیر سے بیدار ہوا تھا۔ وہ اور ماڑہ  
ڈائننگ ٹیبل پہ اکیلے تھے۔ اُس نے پاپا کا پوپچھا تو ماڑہ نے بتایا کہ وہ زینوں کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ وہ ناشتہ کر کے  
فارغ ہوا تو شریں تائی آ گئیں۔ ماڑہ بھی بیٹھ گئی۔ پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔  
ماڑہ نے ہی آفر کی کہ باغ میں چلتے ہیں پھر آپ کو ٹیوب ویل کی طرف لے جاؤں گی۔ در یکتا ایسے کاموں  
میں بڑی خوشی خوشی حصہ لیتی تھی جھٹ تیار ہوگی اور شاہ زیب کو بھی آمادہ کر لیا۔ اُن کے ساتھ باقی کزنز بھی تھے۔ جانے  
کیوں سب کو تیار ہوتا دیکھ کر ماڑہ کا منہ سا بن گیا تھا۔ پیدل ہی یہ قافلہ روانہ ہوا۔

زائے میں جگہ جگہ سبزہ تھا۔ آنکھوں کو تراوٹ سی مل رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک جگہ رک کر گہرے گہرے  
سانس لیے۔ جیسے اس ماحول اور اس فضا کی ساری تازگی کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہو۔ ماڑہ اُس کے پیچھے ہی تھی۔  
”کزن آپ کو یہ سب اچھا لگ رہا ہے۔“ اُس نے غور سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بہت اچھا میں پیچھتا رہا  
ہوں کہ اتنے عرصہ گاؤں کیوں نہیں آیا۔“ ”ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جانے کیوں عمر چچا آپ کو گاؤں لانے سے  
کتر اتے رہے حالانکہ ہم سب لوگ آپ کو ہمیشہ سے مس کرتے رہے۔“ ماڑہ کا بات کرنے کا انداز بہت سادہ سنا تھا مگر  
شاہ زیب کے ذہن میں اُس کا جملہ اٹک سا گیا کہ ”جانے کیوں عمر چچا آپ کو گاؤں لانے سے کتر اتے رہے۔“ واقعی پاپا  
کیوں ایسا کرتے رہے۔ کل سے اب تک اُس نے سب کے رویوں میں گرنجوشی محسوس کی تھی۔ تاپا اور نگزیب کے ساتھ  
ساتھ اُن کی اولادیں، دونوں چچا اُن کی بیویاں بچے سب اتنی محبت سے پیش آرہے تھے۔ کچھ ایسے ہی خیالات در یکتا کے  
بھی تھے کہ پاپا خواہ مخواہ نہ خود اتنا عرصہ گاؤں آئے نہ انہیں آنے دیا۔  
وہ اپنوں کی محبت سے سرشار تھی۔

☆☆☆

ٹیوب ویل کے پاس بیٹھ کر ماڑہ نے دونوں پاؤں ٹھنڈے تازہ پانی میں ڈبو دیئے۔ پل بھر میں ٹھنڈے پانی  
نے ناگوں اور پاؤں کے ساتھ ساتھ تراوڑر کے پانچوں کو بھی بھگو دیا۔ ایک بار پھر اُس کی پنڈلیاں شاہ زیب کے سامنے  
تھیں۔ اچھی خاصی ٹھنڈی پروہ نہ جانے کس مٹی سے بنی تھی اُسے سردی کا پتہ ہی نہیں تھا۔ مزے سے پانی کے ساتھ کھیل  
رہی تھی۔ شاہ زیب کو ایک بار پھر نظر چرانا ہی پڑی۔

ماڑہ کی معصوم سی بیباکی اُسے عجیب سی لگ رہی تھی۔ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہ ہو جیسے اُس نے اس دنیا میں پہلی  
بار قدم رکھا ہو۔ اُس کا کزن کہہ کر مخاطب کرنا شاہ زیب کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ باقی لڑکے لڑکیاں اُس کا نام لے رہے

تھے۔ پروہ صرف کزن کہہ رہی تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر ماہرہ کا اہمیت دینا اچھا لگ رہا تھا۔

شام کو وہ لوگ گھر لوٹے تو مختلف لوازمات سمیت کھانا اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ شاہ زیب تھک چکا تھا۔ کھانا کھا کر سو گیا۔ مغرب کے بعد دریکٹا نے بڑی مشکل سے اُسے اٹھایا۔

آج اورنگزیب تایا نے سب بھائیوں کی دعوت کی تھی۔ رات کا کھانا اُن کی طرف تھا۔ لمبے سے ڈائننگ ہال میں بڑی رونق تھی۔ صبح عمر زیب اور اُن دونوں بہن بھائی نے واپس شہر جانا تھا۔ ایک طرح سے آج اُن کی الوداعی دعوت تھی۔ باتوں اور کھانوں کا سلسلہ اکٹھے اکٹھے چل رہا تھا۔ شریں بھابھی نے روئے سخن عمر کی طرف موڑا۔ ”عمر بھائی ماہرہ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے یہاں کے کالج کا آپ کو پتہ ہے ایک سال اس کا ضائع ہو گیا ہے اب قریبی شہر کے ایک کالج میں داخلہ لیا ہے تو وہاں آنے جانے میں ہی اچھا خاص وقت لگ جاتا ہے جب سے آپ لوگ آئے ہیں یہ کہہ رہی ہے کہ میں نے بھی وہاں ہی داخلہ لینا ہے۔ ہوسٹل میں رہ لے گی آپ بس اس کا داخلہ کر دینا۔“ شریں بھابھی کا رویہ حد سے زیادہ پُر تکلف تھا۔ عمر کو ہوسٹل والی بات بہت بُری لگی۔ ”میں ماہرہ کا ایڈمشن کروادوں گا مگر میرے ہوتے ہوئے یہ ہوسٹل میں کیوں رہے۔ جیسے دریکٹا میری بیٹی ہے اس طرح ماہرہ بھی ہے۔ بیٹا تم اپنا ضروری سامان پیک کر لینا۔ کل تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو۔“ اب اُن کا مخاطب ماہرہ تھی۔ خوشی سے اُس کا مُردہ حال تھا۔ اتنی آسانی سے سب کچھ ہو جائے گا اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اُس نے ہی شریں کو سب سے پہلے بتایا تھا کہ دریکٹا کہہ رہی ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو اور ادھر ہی کسی اچھے سے کالج میں ایڈمشن لے لو۔ اورنگزیب کے آگے اسی رات شریں نے یہ تجویز رکھی تھی۔ آئیڈیا برا نہیں تھا۔ ویسے بھی عمر اُن کا بھائی تھا۔ ”اگر ماہرہ اُس کے گھر رہ کر تعلیم حاصل کرتی تو برائی ہی کیا تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پہ جان بوجھ کے شریں نے سب کے سامنے وہ بات چھیڑی تھی۔“

ادھر گاؤں میں سب کچھ تھا۔ دولت، جائیداد، کھانے پینے کی فراوانی۔ پر شہر والی تیز رفتاری اور چکا چوند نہیں تھی۔ شریں چاہتی تھی کہ ماہرہ ادھر رہ کر سب میمز سیکھ لے۔ شاہ زیب کو دیکھتے ہی اُس کے ذہن میں ایک پرانی خواہش نے سر اٹھایا تھا۔ اُسے کوئی مشکل ہی نہیں ہوئی۔ عمر بہت خوش ہوا کہ ماہرہ کو پڑھنے کا اتنا شوق ہے۔

اُس نے بہت خوشی خوشی اپنا بیگ تیار کیا تھا۔ صبح اُسے عمر چچا کے ساتھ اُن کے گھر چلے جانا تھا۔ اُسے اچھی طرح پتہ تھا کہ باقی دونوں بچیاں اور اُن کی بیٹیاں دل ہی دل میں جل رہی ہوں گی کہ وہ عمر چچا کے ساتھ اُن کے گھر جا رہی ہے۔ وہیں رہ کر پڑھے گی۔ سو اُس نے اپنی طرف سے اُن سب کو جلانے کا پورا پورا انتظام کر لیا تھا۔

☆☆☆

عمر چچا کا گھر بہت خوبصورت اور ویل ڈیکورٹڈ تھا۔ پوری طرح شہری مزاج سے ہم آہنگ۔ ماہرہ کو دریکٹا کے ساتھ والا کرا دیا گیا۔ اگلے کچھ دنوں میں ماہرہ کا ایڈمشن بھی ہو گیا۔ اب شاہ زیب خود ڈرائیونگ کرتا اور اُن دونوں کو بھی ڈراپ کر دیتا۔ شہر آ کر ماہرہ نے خود کو پہلے سے زیادہ سنوار لیا تھا۔ بال سنپس میں کٹوا لیے۔ جدید فیشن کے مزید ملبوسات خرید لیے وہ گاؤں کی پروردہ نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میں سیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ پھر آنے سے پہلے شریں نے اُسے بہت سی ہدایات بھی دی تھیں جن کو وہ پوری طرح فالو کر رہی تھی۔ اُس کا رنگ روپ مزید نکھر جا رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت نہیں تھی پر اُسے خوبصورت نظر آنے کا گڑ آتا تھا اور اس کا استعمال اُس نے بہت خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ شریں جیسی ماں کے زیر سائے پروان چڑھی تھی بیباک، نڈر اپنی طرف موڑنے اور

متوجہ کرنے کے سارے طریقے اُسے آتے تھے۔

☆☆☆

شاہ زیب شام کو گھر لوٹا تو بڑی خاموشی تھی۔ حالانکہ اس وقت پاپا اور دریکٹا شام کی چائے پہ اُس کا انتظار کر رہے ہوتے کہ کب وہ گھر لوٹے۔ پھر خوب ڈسکشن ہوتی ہر موضوع پہ۔ پر آج لان میں بڑی چیخ زخالی تھیں۔ البتہ لیونگ روم میں ماہرہ مل گی وہ کوئی فیشن میگزین دیکھنے میں لگی ہوئی تھی۔ ”پاپا ابھی نہیں آئے اور یہ دریکٹا کہاں ہے۔“ ”چچا تھوڑی دیر پہلے کسی دوست کی طرف گئے ہیں اور دریکٹا آئی زیبا کی طرف گئے ہیں کہہ رہی تھی انہوں نے میلا وہ پہن لیا ہے۔“ اُس نے پڑوسیوں میں سے ایک کا نام لیا۔ آئی زیبا کا گھر تین گلیاں چھوڑ کر تھا۔ کافی اچھے تعلقات تھے اُن کے ساتھ اس لیے آنا جانا لگ رہا تھا۔ ”تم نہیں گئی۔“ ”اصل میں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے سو نہیں گئی۔“ وہ میگزین رکھ کر اُس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اب اُن میں اچھی خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی پر شاہ زیب ایک حد میں ہی رہتا۔ خود بھی اُسے کزن یا آپ کہہ کر ہی بلاتی تھی۔ پر اُس کے ایک ایک عمل اور انداز سے خاص توجہ کا اظہار ہوتا تھا۔ شاہ زیب سے بھی لوٹ کے گھر آتا تو اُسے چائے پانی کا پوچھتی۔ اگر وہ رات کو لین آتا تو اکثر جاگ رہی ہوتی اُسے کھانے کا کہتی نہ کھایا ہوتا تو اُس کے لیے کھانا گرم کر کے لے آتی۔ اُس سے چھوٹے موٹے کاموں کا پوچھ لیتی۔ یہ سب شاہ زیب کو بہت عجیب بھی لگتا اور اچھا بھی کیونکہ ماہرہ کا تعلق اُس خاندان سے تھا جہاں کی لڑکیاں پانی بھی ملازموں سے منگوا کے پیتی ہیں اور خود ماہرہ اُس کی خدمت کے لیے بے قرار نظر آتی۔ یہ سب باتیں ایک خاص جذبے کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ شاہ زیب پہ کچھ واضح نہیں تھا مگر وہ انجان بھی نہیں تھا۔

”آپ چائے پیو گے۔“ ماہرہ کچن کی طرف جا رہی تھی اُسے بھی پوچھ لیا۔ ”ہاں بنواؤ۔“ شاہ زیب نے جیکٹ اتار کر پاس پڑے صوفے پہ اچھال دی۔ ماہرہ چائے کا کہہ کر واپس آ گی۔ آج پہلی بار دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ ریڈ ککر کے ٹراؤزر شرٹ میں وہ شعلہ جوالہ لگ رہی تھی۔ سردی اور فلو کی وجہ سے آنکھیں اور ناک بھی سرخ سرخ سی نظر آ رہی تھی مگر اس عالم میں وہ شاہ زیب کو پہلے سے بڑھ کر اچھی لگ رہی تھی۔ ”طبیعت زیادہ خراب ہے کیا۔“ اُس نے ہمدردی سے پوچھا۔ ”ہاں بس فلو ہے اس وجہ سے سر میں بھی درد ہے۔“ ”تو آرام کروانا۔“ اُس نے مشورہ دیا۔ ”آرام ہی تو کر رہی ہوں۔“ ماہرہ کے لہجے میں عجیب سی یاسیت رہتی تھی۔ شاہ زیب کو محسوس ہوا کہ جیسے کچھ ہے آج سے پہلے اُس نے کبھی ماہرہ کو اس طرح نڈھال سا نہیں دیکھا تھا۔ ”کوئی پرابلم ہے تو بتاؤ۔“ شاہ زیب اُس کی طرف قدرے جھکا عین اُسی وقت ماہرہ نے اپنا سرا پر اٹھایا تو اپنی دھن میں اُس کا سر شاہ زیب سے لکرایا۔ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ شاہ زیب نے غیر ارادی طور پہ اُس کے لبوں پہ ہاتھ رکھا تو ماہرہ نے دوسرا ہاتھ اُس کے کندھے پہ رکھ دیا۔ جیسے سہارا لینا چاہی ہو۔ پل بھر کا تصادم تھا دونوں ایک دوسرے کی دھڑکنیں تک سن سکتے تھے۔ باہر دروازے پہ آہٹ ہوئی شاید کوئی ہوا کا جھونکا تھا جو دروازے سے چھیڑ خانی کر رہا تھا مگر شاہ زیب بہت تیزی سے دور ہوا۔ سارا فسوس جھٹکا کے سے لوٹا۔ اُس کے بعد وہاں رُکا نہیں اپنے بیڈ روم میں آ کے ہی دم لیا۔

ماہرہ کو اُس رات تیز بخار تھا۔ پر شاہ زیب بھی بے قرار تھا۔ وہ دوبار بہانے سے اُس کے پاس آیا دریکٹا ماہرہ کے پاس ہی تھی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلا گیا۔ پر تھوڑی دیر بعد پھر آ گیا۔ اب کی بار ماہرہ اٹھ کے بیٹھی ہوئی تھی اور دریکٹا کچن میں اُس کے لیے سوپ لینے لگی تھی۔ ”کیسی طبیعت ہے۔“ بے قراری اُس کے لہجے سے عیاں تھی۔ ”اب ٹھیک ہوگی



ایسے لگ رہا تھا جیسے چوری کر رہا ہو اور ننگے ہاتھوں پکڑے جانے کا ڈر ہو۔ کچھ بھی تھا سہی مگر اُسے کچھ نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

مازہ دو ماہ کے عرصے میں پہلی بار گاؤں گئی تھی۔ شریں اور اورنگزیب اُسے سن کر رہے تھے۔ اورنگزیب اُسے خود لینے آئے تھے۔ وہ چلی آئی۔ حالانکہ دل نہیں کر رہا تھا۔ شاہ زیب بھی گھر نہیں تھا۔ ابو نے پیشگی اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی بس اچانک اُسے لینے آئے تھے۔ ناچار وہ اُن کے ساتھ چلی آئی۔ شریں نے کتنی بار اُسے لپٹا یا پیار کیا۔ رات کو ذرا فرصت ملی تو اُسے باتیں پوچھیں۔ ”عمر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟ شریں نے راز دارانہ انداز میں پوچھا۔ ”بہت اچھا وہ بہت خیال رکھتے ہیں میرا“۔ دریکتا کی سناؤ ”وہ بالکل بہنوں کی طرح ہے“۔ ”اور شاہ زیب“ شریں کے الفاظ ولجہ بہت معنی خیز تھا ”وہ بھی ٹھیک ہے“۔ ”یہ تو اچھی بات ہے“۔ شریں مطمئن سی تھی۔

”میری بات یاد رکھنا“۔ یاد ہے مازہ قدرے خفگی سے گویا ہوئی۔ ”یاد رکھنا تم نے عمر کی بہو بننا ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارا حال بھی بینا خالہ کی طرح ہو“۔ ”آپ بینا خالہ کی بات مت کریں میں اُن کی طرح کمزور نہیں ہوں“۔ چلو اچھی بات ہے اگر تم کمزور نہیں ہو۔ ویسے بھی شاہ زیب تمہارے چچا کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جان ہے عمر کی اُس میں۔“ (ای شاہ زیب کی جان عنقریب میرے پاس ہوگی) مازہ نے بڑے غرور سے یہ جملہ دل میں کہا تھا۔

بینا خالہ کے ماضی کے بابت اُسے ایک ایک بات ای سے معلوم ہوئی تھی۔ بسے چوڑے شاہ زیب کو دیکھتے ہی ذہن میں کچھ باتیں گڈ بٹھوئی تھیں۔ عمر زیب چچا نے پہلی شادی اپنی پسند سے کر کے بزرگوں کی روایات کو توڑا۔ پھر آئندہ چچی کے بعد پھر اپنی مرضی سے دوسری شادی کی پر بینا خالہ کے آنسو اور محبت انہیں نظر نہ آئے۔ انہیں دوسری بار ٹھکرایا۔ ٹھکرائے جانے کی یہ اذیت بیٹا کے ساتھ ساتھ پورے گھرانے نے بھی جھیلی تھی۔ ان میں شریں بھی شامل تھی۔ عمر زیب کا یہ جرم ناقابل معافی تھا۔ اب تو اورنگزیب بھی بیوی کا ہم خیال بن چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی عمر کے ساتھ رکھائی سے پیش آنے لگا۔ راحیلہ کی موت بھی اس رکھائی اور سردمہری کی دیوار کو نہ گرا سکی۔ آہستہ آہستہ باقی چھوٹے بھائیوں کی نگاہیں بدلنے لگیں وہ خود ڈھیٹ بن کر اُن کے پاس گاؤں آتا۔ آخری بار تو کسی نے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ مجبوراً وہ آئندہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر لوٹ آیا۔

اتنے برسوں میں شریں نے اپنی اولاد کو یہی یاد دہرایا تھا کہ عمر چچا نے زیادتی کی ہے۔ اس بار عمر چچا اکیلے گاؤں نہیں آئے تھے۔ وہ لہبا چوڑا غضب کی وجاہت سمیٹے شاہ زیب بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ شریں بہت محبت سے ملی۔ اورنگزیب کا دل بھی بھائی کی محبت سے لبریز ہوا تھا۔ دریکتا اور شاہ زیب آخر تھے تو انہی کا خون۔ بل بھر میں دلوں کی دوری ختم ہوئی تھی۔ مگر یہ سب عارضی تھا۔

☆☆☆

مازہ کے شہر جانے کے بعد دونوں چچیاں دل ہی دل میں عمر زیب سے ناراض تھیں کہ عمر نے اُن کی اولادوں کو تو بالکل بھی نہیں پوچھا اور مازہ کو ساتھ لے گیا ہے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھی کہ کس طرح دریکتا اُن کی بہو بن جائے تو وہ بھی شریں کے سامنے سر اٹھا کے بات کر سکیں۔ فوزیہ نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے اجند کے حوالے سے فیصلے

کے لیے تھے۔ اجند ہوسٹل میں رہ کر ہاتھوں بہت تنگ جانا چاہتا تھا مگر زیب چچی اس کی منزل میں سب کچھ حاصل کر لینے تک تھی۔ اگر عمر کا داماد بن جاتا تو یہ منزل بڑی آسانی سے حاصل ہوجاتی۔ فوزیہ مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ جب اجند کے رشتے کے لیے عمر سے بات کرے۔

فرح چچی کی سوچ فوزیہ سے ذرا لگتھی وہ مازہ کے شہر جانے کے بعد اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔ اگر عمر اُن کے بیٹے کو گھر داما بنا لیتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ دریکتا کے ساتھ ساتھ بہت ساری دولت بھی ملتی۔ فوزیہ اور فرح دونوں نے اپنے اپنے مجازی خداؤں اور عمر زیب کے بھائیوں سے بھی بات کر لی تھی۔ انہیں بھی اس رشتے میں کوئی برائی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آخر کو عمر چھوٹا بھائی تھا وہ اگر اُسے نہ پوچھتے تو کون پوچھتا۔ خونی رشتوں کا حق تو ہوتا ہے اور وہ اپنا فرض نبھانا چاہتے تھے۔

اس بار عمر کو گاؤں آنے کی دعوت وہ خود دے رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً شہر کے چکر بھی لگا رہے تھے۔ عمر بہت خوش تھا کہ بالآخر اُس کے بھائیوں کو اُس کا احساس ہو ہی گیا ہے۔ برسوں کی دوریاں ختم ہوگی ہیں اور برف پگھل گئی ہے۔

☆☆☆

مازہ کہیں بھی نہیں آ رہی تھی۔ شاہ زیب کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ اُس سے زیادہ دیر رہا نہیں گیا دریکتا سے پوچھ بیٹھا۔ ”مازہ کہاں ہے کافی دیر سے نظر نہیں آئی ہے“۔ ”بھائی وہ تو تاپا ابو کے ساتھ صبح گاؤں چلی گئی ہے۔ وہ لینے آئے تھے کہ سب گھر والے اُسے یاد کر رہے ہیں“۔ دریکتا نوٹ بک پہ جھکے جھکے لہ لی۔ وہ شاہ زیب کے چہرے پہ پھیلی اداسی کے رنگوں کو نہ دیکھ پائی تھی در نہ بہت کچھ جان جاتی۔

☆☆☆

مازہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اب اُسے واپس چھوڑ گئے تھے اور عمر چچا کے ساتھ ساتھ دریکتا اور شاہ زیب کے لیے بہت کچھ لائے بھی تھے۔ شاہ زیب کالج سے آنے کے بعد دوستوں کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ آج کل کم ہی گھر نکلتا تھا کلب کے بعد دوست ہوتے یا پھر بائیک۔ آج بھی وہ اسی شغل میلے میں لگا ہوا تھا۔ مازہ کو مایوسی ہوئی وہ گھر نہیں تھا۔ وہ اصل میں اُس کے تاثرات جانچنا چاہ رہی تھی کہ اُس کی آمد پہ اُسے دیکھ کے شاہ زیب کس طرح ری ایکٹ کرتا ہے۔ جب وہ گئی تھی تب بھی شاہ زیب نہیں تھا اور ابھی آئی تھی تو تب بھی نہیں تھا۔ خیر اُس نے آنا تو گھر ہی تھا۔ مطمئن سی ہو کر اُس نے اپنے کپڑے الماری میں لٹکائے اور سفر کی دھول مٹی سے پیچھا چھڑانے کی خاطر شاد رہنے لگی۔

دریکتا اُسے دوبارہ اپنے درمیان پا کر بہت خوش ہوئی۔ اورنگزیب اُسے یہاں چھوڑ کر زیادہ دیر نہیں رکے گاؤں میں کچھ مسائل تھے وہ اُسے چھوڑ کر ذرا سیور کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے۔ دریکتا نے خود اُس کے لیے چائے بنائی۔ دونوں نے لان میں بیٹھ کے پی۔ شاہ زیب ہنوز غائب تھا۔ مازہ نے خود سے اُس کا نہیں پوچھا۔ احتیاط لازم تھی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی وہ اُس کا کزن تھا وہ اُس کے بارے میں پوچھ سکتی تھی۔ دریکتا نے بھلا کیا کہا تھا۔ پر مازہ کے اپنے دل میں چور تھا جو اُسے روک رہا تھا۔

☆☆☆

مازہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی تھی شاہ زیب اُسے دیکھ کر خوشگوار حیرت سے دو چار ہوا۔ ”کب واپس آئی اور اپنے جانے کا بتایا ہی نہیں۔ بے مزد توں کی طرح چلی گئی۔ میں نے کون سا روک لینا تھا“ ایک دبا دبا سا شکوہ



شہ زہیب کے لبوں پہ آہی گیا۔ وہ ایک سانس میں بول گیا۔ ”آپ روک لیتے تو میں کبھی نہ جاتی۔“ وہ رک رک کر بہت آہستہ آواز میں بولی تھی۔ شاہ زہیب حیرانی سے اُسے تنکے لگا۔ ماثرہ نے نظر نہیں چرائی۔ جانے ابھی اُس پہ اپنے محسوسات کا کون سا درواہ ہوا تھا وہ جان ہی نہیں پایا۔ ”اچھا یہ بتاؤ گاؤں میں سب کیسے ہیں۔“ وہ فوراً سنبھل گیا تھا۔ ”ٹھیک ٹھا کر اے دن ہیں سب۔ اور امی نے آپ کے لیے کچھ چیزیں بچھوائی ہیں میں آپ کے کمرے میں رکھ دوں گی۔“ وہ بھی ناراض ہو گئی تھی۔ ”ٹھیک ہے میں ذرا فریش ہولوں پھر بات ہوتی ہے۔“ شاہ زہیب اُسے کچھ سوچتا چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

بہت خوبصورت موسم تھا۔ لاتعداد بدلیاں آسمان پہ جمع ہو کر بھاگتی پھر رہی تھیں ماثرہ برآمدے میں بیٹھی منہ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دریکتا اندر سوئی ہوئی تھی۔ شاہ زہیب بھی کالج سے آنے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ عمر زہیب آفس میں تھے۔ موسم کی خوبصورتی جولانی پہ دیکھ کر ماثرہ باہر آئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں گریں اور پیاز دھرتی کا سینہ سیراب ہونے لگا۔ ماثرہ برآمدے سے صحن کی میزھیاں اتر کر نیچے آگئی۔ بارش اُس کے پاؤں کو بھگونے لگی۔ شاہ زہیب کی آنکھ بارش کی بوندوں سے کھلی۔ اُس نے گلاس دنڈو سے پردہ اٹھایا۔ سامنے کا منظر واضح تھا۔ چیز بارش سے نہا رہی تھی۔ ماثرہ اس دلفریب منظر کا حصہ بنی برآمدے کے پلر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ شاہ زہیب چھلانگ مار کر بیڈ سے اُترا۔ اگلے چند سیکنڈز میں وہ بھی ماثرہ کے پاس کھڑا تھا۔ ”کیا ہو رہا ہے۔“ ”موسم انجوائے ہو رہا ہے۔“ وہ دلکشی سے مسکرائی۔ اس سے شاہ زہیب کو وہ موسم کی طرح ہی الیبلی نظر آئی۔ بارش کی بوندوں نے اُسے کہیں کہیں سے بھگو ڈالا تھا۔ کچھ قطرے اُس کے سر کے بالوں میں بھی اگلے نظر آرہے تھے۔ کہیں دور آسمان کی لامتناہی دستوں میں بجلی لڑکنے کا زور دار چھنا کا ہوا ماثرہ کے لبوں سے بڑی زوردار چیخ برآمد ہوئی اور اُس نے شاہ زہیب کو اس خوف سے بچنے کے لیے ڈھال بنا لیا۔ اُس کی نازک گداز بانہوں نے شاہ زہیب کا سہارا غیر ارادی طور پر لیا تھا۔ یہ لمس یہ احساس یہ گرفت یہ مہک شاہ زہیب کے لیے بڑی انوکھی اور دلکش سی تھی۔ اُس کے دل نے بے اختیار یہ خواہش کی تھی کہ کاش ماثرہ اسی طرح اُس کی بانہوں کی گرفت میں محفوظ رہے۔ پر ایک لمحہ ہی تو تھا۔ ماثرہ کو بہت تیزی سے احساس ہوا کہ وہ اُس کے کس قدر قریب ہے۔ یہ احساس آنے کی دیر تھی ماثرہ اُسے چھوڑ کر منظر سے ہٹی اور اپنے بیڈروم میں آگئی۔

وہ کتنی دیر وہیں کھڑا ماثرہ کے اُس لمس اور اُس مہک کے احساس میں گھرا رہا۔ لمبے لمبے سانس لے کر اُس نے ماثرہ کی معدوم ہوتی خوشبو کو اپنے سینے میں بھرنے کی کوشش کی۔ شعور میں کسی کمی کا احساس ہوا تھا تو تکمیل کی تمنا بھی جاگ پڑی۔ ماثرہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اور دل شدت سے اُس کا متلاشی تھا۔ وہ اُس کے بیڈروم کے دروازے پہ رُکا پر اندر داخل نہیں ہوا۔ کچھ سوچ کے واپس مڑ گیا۔ دل انوکھی لے پھڑک رہا تھا۔ وہ دل میں چھپے جذبوں کو پہچان چکا تھا۔ ماثرہ اُس کی اولین چاہت و محبت و آرزو اور خواہش بننے کے مراحل میں تھی۔ وہ پھر رات کے کھانے پہ ہی نظر آئی۔ مگر اس طرح کے شاہ زہیب سے گریزاں اور نظر چرائے ہوئے۔ اُسے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ شاہ زہیب سے رہا نہیں گیا اُس کے راتے میں کھڑا ہو گیا ”مجھ سے ناراض ہو“ ماثرہ نے حیران شکوہ کناں نگاہیں اُدھر اٹھائیں اور نفی میں سر ہلایا ”پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی بھاگ کیوں رہی ہو مجھ سے۔“ وہ تھانے داروں والے انداز میں بولا تو ماثرہ کی آنکھوں میں بے بسی سے ڈلتی دکھائی دی ”مجھے نہیں پتہ۔“ ”کیوں نہیں پتہ۔“ ”بس نہیں پتہ ناں۔“ شاہ زہیب کو جانے کیوں اُسے تنگ کرنے میں لطف آرہا تھا۔ ”کس کو پتہ ہے۔“ ”آپ کو پتہ ہوگا۔“ وہ گریزاں گریزاں ہی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ”نہیں مجھے نہیں پتہ بتاؤ ناں۔“ ”آپ کو سب پتہ ہے۔“ شاہ زہیب حیران سا ہوا۔ سارے راز اُس ایک ٹائپ میں اُس پہ منکشف ہوئے۔ ایک دوسرے کی چاہت کا راز۔ ”بھلا مجھے کیا پتہ ہے۔“ وہ انجان بنے سے گویا ہوا تو ماثرہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی پر شاہ زہیب دیوار بن کے راستے میں حائل تھا ”ہائیں میں جاؤں۔“ ”اگر میں نہ ہوں تو“ شاہ زہیب کی چکیلی آنکھوں سے خود سری چٹکلی تو ماثرہ نے دونوں ہاتھوں سے اُسے آگے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ شاہ زہیب نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اس جرأت پہ وہ حیران ہوئی اتنے میں دریکتا اچانک ڈانٹنگ ہال سے باہر نکلی تو شاہ زہیب نے ماثرہ کے ہاتھ چھوڑ دیئے مگر وہاں سے جانے سے پہلے وہ اُسے سرگوشی میں کہنا بھولا نہیں تھا کہ ”میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ ماثرہ کی نگاہ اُس کے مضبوط قدموں پہ تھی۔

☆☆☆

نیم تاریک ریسنورنٹ میں دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ شاہ زہیب نے اپنے محسوسات، خیالات، اور آنے والی تبدیلی سب کچھ ماثرہ کی سماعتوں تک پہنچا دیا۔ اُس نے صاف سیدھے نپے تلے انداز میں چاہت کا اظہار کر دیا۔ ماثرہ کانی دیر خاموش رہی جیسے بولنے کے لیے الفاظ جمع کر رہی ہو۔ ”کیا ہماری محبت کو عمر چچا قبول کر لیں گے؟“ خاصی دیر بعد اُس نے خاموشی توڑی اور وہ عجیب سا سوال کیا۔ کم از کم شاہ زہیب کو تو وہ سوال عجیب ہی لگا تھا۔ ”کیوں اس میں برائی کیا ہے جو وہ قبول نہیں کریں گے بلکہ انہیں خوش ہونا چاہیے وہ اپنی فیملی سے رشتوں سے بہت محبت کرتے ہیں میں نے ایک تڑپ دیکھی ہے اُن میں اپنے رشتوں کی محبت کے لیے“ ماثرہ نے یقین نہ کرنے والے انداز میں اُسے دیکھا، آپ لوگ اتنا عرصہ گاؤں نہیں آئے بلکہ چچا آپ کو لائے ہی نہیں خود بھی ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ اور دونوں چچا ہم کزنز لوگ آپ سے ملنے کی آرزو ہی کرتے رہے۔ عمر چچا کو مگر لگتا ہے کہ پسند نہیں تھا کہ اپنی فیملی سے اپنے بھائیوں سے قریب ہوں۔ اُنہوں نے تو آپ دونوں بہن بھائی کو بھی نہیں آنے دیا۔“ ماثرہ کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ شاہ زہیب اُس کی کئی باتوں میں حقیقت ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”بہر حال میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اُس نے پل بھر میں فیصلہ کیا اور ماثرہ کو بتا بھی دیا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ چچا کبھی نہیں مانیں گے۔“ اُس نے شدت سے نفی میں سر جھٹکا۔ ”وہ مانیں گے ضرور مانیں گے۔“ شاہ زہیب کا انداز قطعی بے لچک تھا۔ ”آپ کہہ کر دیکھ لیں اُس کے بعد جو طوفان آئے گا آپ بھی دیکھ لیں گے۔“ ”ارے کون سا طوفان آئے گا پتہ نہیں کیا کیا بول رہی ہو۔ مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ شاہ زہیب مجھے ڈر لگ رہا ہے اُس وقت سے جب ہم دونوں کو اپنے اپنے ٹونے دل کی کرچیاں سمیٹنی پڑی گئیں۔ عمر چچا کی آنکھوں میں میں نے اپنے گھرانے کے لیے بیگانگی اور بے رُخی دیکھی ہے۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔“ وہ ماثرہ تمہاری غلط فہمی ہے یہ۔ پاپا اپنی فیملی سے اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔“ ”اگر وہ محبت کرتے ہیں تو اتنا عرصہ اُنہوں نے خود کو آپ لوگوں کو اپنوں سے دور کیوں رکھا۔ دوسری شادی کے بعد تو وہ گاؤں سے بالکل ہی کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اتنے عرصے بعد وہ آپ دونوں کو گاؤں لائے۔ کبھی سوچا ہے کبھی پوچھا اُن سے۔“ وہ ایک سانس میں بولے گی۔ شاہ زہیب کے ماتھے پر تنکرات کی لکیریں نمایاں ہونے لگی۔ ماثرہ پتہ نہیں کیا کیا بول رہی تھی جو بھی تھا شاہ زہیب سوچنے پہ مجبور ہو رہا تھا۔

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیک اور ریڈیو مائیک کے ساتھ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

اظہار محبت کے بعد وہ ہلکا پھلکا تو ہو گیا تھا پر ایک اور بوجھ ذہنِ دول پہ سوار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ڈیڑ بل لایا تو وہ پے کر کے اٹھ کھڑا ہوا ساتھ ہی مائرہ کو بھی اشارہ کیا۔ اُس کی تقلید میں مائرہ نے بھی جانب قدم بڑھائے۔

آج کا سارا دن شاہ زیب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ بہت مطمئن تھی۔ کتنی جلدی یہ مشکل مرحلہ بھی گیا تھا۔ شاہ زیب نے خود محبت کا اظہار کر کے اُس کے غرور میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ گاؤں کی پروردہ ایک عام عورت نے لے لے چوڑے خوب رو شاہ زیب کو اپنا اسیر بنا ہی لیا تھا۔ بیجا خالہ تو ناکام رہی تھی پر حیت اُس کے حصے میں آئی تھی۔ بھی خوشی مناتی کم تھی۔

پہلی نظر میں ہی شاہ زیب کو دیکھ کر اُس کا دل دھڑکا تھا۔ وہ نظر انداز کے لیے جانے کے قابل بھی تو نہیں اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ شاہ زیب اس طرح اُسے محبت کرنے لگے گا۔ خود شاہ زیب کے اپنے کارنامے ایک سے ایک خوبصورت اور طرح دار لڑکی تھی۔ اُس کا دل مائرہ پہ آیا۔ اُسے نسوانی لمس اور حدت سے روشناس کرانے مائرہ ہی تو تھی۔ یہ لمس یہ حدت یہ نرمی شاہ زیب کے لیے بہت اُنوکھی اور سربستہ ہی تھی۔ اور وہ روز بروز اُن میں اضافہ جاری تھی۔ شاہ زیب کا دل اُسے کھونچنے کے لیے مچلتا پر وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتی۔ اتنی عمر کی نہیں تھی پر کتنی اور نسوانیت کی قدر و قیمت سے آگاہ بھی تھی۔ تب ہی تو وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

کتنی بارتہائی میسر آئی تھی۔ اس عالم میں وہ شاہ زیب کو انجان پنہ میں چھو لیتی اور پھر بیگانگی سے جاتی۔ کہ جیسے اُسے کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ اُس کی دانستہ چشم پوشی اور بناوٹی مصنوعی معصومیت شاہ زیب کے دل پہ تیار ڈھاتی۔ وہ بہت مشکل سے ضبط کرتا۔ شوریدہ مچلتا گرم خون رگوں میں رواں تھا۔ وہ اپنے ہی جذبوں کی نبت تابی و سہ سے ہم جاتا اور ادھر مائرہ یوں ری ایکٹ کرتی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

☆☆☆

”دریکتا تیار ہو رہی تھی اُس کی فرینڈ کی برتھ ڈے تھی۔ شاہ زیب نے کہا تھا جب تیار ہو جاؤ مجھے اٹھالینا جب تک تھوڑی دیر آرام کر لوں۔“

سو وہ بے فکر تھی۔ اس لیے آرام دسکون سے تیار ہوئی۔ آہٹے میں خود کو دیکھا مطمئن سی تھی کہ اچھی لگے ہوں۔ اب شاہ زیب کو اٹھانا تھا اُس نے بھی تو چیخ کرنا تھا۔ اُس نے گنگتاتے ہوئے دروازہ ناک کیا تو وہ ہاتھ کے سے ایک دم کھل گیا۔ اندر کا منظر حیران کن تھا۔ مائرہ شاہ زیب کے بہت قریب کھڑی اُس کی نائی کی ناٹ باندھ رہی تھی۔ انداز میں جنم جنم کی بے تکلفی اور اپنائیت تھی۔ آہٹ سے وہ دونوں بیک وقت اُس کی طرف متوجہ ہوئے۔ مائرہ کے ہاتھ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ بھاگنے والے انداز میں دریکتا کے پاس سے گزر کر باہر آگئی۔ شاہ زیب بھی بہت شرمندہ لگتا تھا۔ گاڑی میں بھی وہ اس سے نظر نہیں ملا پارہا تھا۔

مائرہ خود ہی اُس کے بیڈروم میں آئی تھی۔ وہ چیخ کر کے پرفیوم اسپرے کر رہا تھا جب وہ اُس کے قریب بڑے آرام سے پرفیوم کی بوتل اُس کے ہاتھ سے لی اور خود اسپرے کرنے لگی۔ اُس کے بال برش سے سنوارے۔ مائرہ انداز بہت عام اور نارمل سا تھا۔ جیسے اس بات اور اس قربت کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ ”نائی کی ناٹ ڈھیلی ہے میں

کرتی ہوں۔“ نائی کی ناٹ باندھنے کے بہانے درری کچھ اور بھی کم ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب بے خود ہوتا آہٹ ہوئی اور وہ حواسوں میں واپس آ گیا۔ مائرہ بڑی تیزی سے باہر نکلی۔ وہ ندامت سے نگاہیں جھکا کے رہ گیا۔

”میں تمہیں نوبے تک پک کر لوں گا۔“ دریکتا کو ڈراپ کر کے گاڑی موڑ کر وہ فقط یہی کہہ سکا۔ دریکتا بہت چپ چاپ سی تھی۔ مائرہ کے انداز بہت عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ اکثر نوٹ کرتی۔ شاہ زیب کے کپڑے ڈھل کے آتے تو وہ پریس کرنے کھڑی ہو جاتی۔ وہ گھر میں ہوتا تو مائرہ پاس ہی بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھی چائے اور کبھی کھانے کا پوچھتی۔ اس کے ایک ایک عمل سے کوئی خاص چیز چھلکتی۔ دریکتا جسے کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔ اور آج اُس نے جو منظر دیکھا تھا وہ ہضم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنی قربت اتنی اپنائیت مائرہ کے انداز میں اتنا استحقاق جیسے جنم جنم کی بے تکلفی ہو۔ جب وہ یہاں شروع میں آئی تو اتنی چھپی چھپی سی رہتی خاموش خاموش۔ اُس کا یہ روپ دریکتا کے لیے حیران کن تھا۔

پارٹی میں بھی وہ اسی معاملے کو سوچتی رہی اور ٹھیک طرح سے انجوائے بھی نہ کر سکی۔ آج کل فائل ایگزامز کے بعد چھٹیاں تھیں۔ اُس کے بعد زلٹ متوقع تھا تب اُس نے سوچنا تھا کہ کیا کرے۔ اُس دوران وہ فارغ ہی تھی۔ مائرہ بھی ایگزام دے چکی تھی۔ پپانے کہا تھا کہ جب مائرہ گاؤں جائے تو تم بھی ساتھ چلی جاؤ۔ جب انہوں نے کہا تھا تب وہ خوش تھی پر اب دل بھجا بھجا سا تھا۔

☆☆☆

مائرہ واپسی کے لیے تیار تھی۔ عمر بھی دو دن کے لیے ساتھ ہی گاؤں جا رہے تھے۔ شاہ زیب بھی تیار تھا۔ اس لیے دریکتا کو اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ سو وہ بھی جا رہی تھی پر بیکل دل کے ساتھ۔

اس باران کا استقبال پہلے سے بھی بڑھ کر داہبانہ انداز میں ہوا۔ گرجوٹی سب کے رویوں میں نمایاں تھی۔ رات کا کھانا فرح چچی کی طرف تھا حالانکہ درنگ زیب نے کہا تھا کہ رات کا کھانا سب ادھر ہی کھائیں گے۔ پر بھائی اور بھادج کے سامنے اُن کی ایک نہیں چلی۔ فرح اور نوید بڑی محبت اور اصرار سے اُن تینوں کو اپنی طرف لے آئے۔

البتہ سونے کا انتظام تیار اور رنگ زیب کے گھر ہی تھا۔ فرح چچی نے کئی بار دریکتا سے اصرار کیا کہ رات اُن کے گھر ہی رہے پر مائرہ اُسے اپنے ساتھ لے آئی۔

☆☆☆

عمر زیب کے ساتھ باقی تینوں بھائی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے اچھے ماحول میں ہلت چیت ہو رہی تھی۔ اچانک ہی گفتگو کا رخ دریکتا اور شاہ زیب کی طرف مڑ گیا۔ ”کیا سوچا ہے دریکتا کے بارے میں“ یہ سوال نوید بھائی کی طرف سے آیا۔ ”بھائی نوید میں آپ کا سوال نہیں سمجھ پایا ہوں۔“ عمر زیب نے سمجھ آنے والے انداز میں انہیں تکنے لگے۔ ”ارے بھائی میرا مطلب ہے کہ دریکتا خیر سے سیانی ہوگی پنے خیر سے اُس کی شادی کے بارے میں بھی سوچا ہے کہ نہیں۔“ اب کے انہوں نے کھل کے اپنا سوال و ہرایا۔ ”ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے جب تعلیم سے فارغ ہوگی تو دیکھا جائے گا۔“ عمر نے سکون سے جواب دیا۔ ”بیٹیاں سیانی ہو جائیں اور جب رشتے موجود ہوں تو اس فریضے کو جلدی ادا کر لینا چاہیے۔“ یہ بارون بھائی بولے تھے۔ ”کبر لوں گا پہلے پڑھ لکھ تو جائے۔“

عمر نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”کوئی مشکلی وغیرہ کوئی بات تو بچی کر لو۔ پڑھائی کا کیا ہے بعد میں چلتی رہے





مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا اور کہاں اب بچوں کے رشتے طے کرنے کی بات ہو رہی ہے۔ میرے بچے میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں نے اپنیوں کی نفرتیں اور بیگانگی سہی ہے نہیں چاہتا اس کا نشانہ میری لاوا دے۔“ بونلے بولتے عمر جذباتی ہو گئے اور آواز بھی بھرا گئی تو طاہر نے اپنا بازو اُس کے کندھے کے گرد حائل کر دیا۔ ”نی الحال خاموش رہو اور دیکھو۔ تمہاری اولاد ہے تمہیں اپنی اولاد کے معاملے میں پوری طرح اختیار اور آزادی ہے۔ جہاں تمہارا دل چاہے اُس کے مستقبل کا فیصلہ کرو۔ اور پریشان مت ہو مرو بنو کیا عورتوں کی طرح ٹسوے بہانا شروع کر دیئے ہیں۔“ طاہر نے جان کر طنز کیا اور واقعی عمر نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ”اور سناؤ اشعر کیسا ہے بات ہوتی ہے تمہاری۔“ ”ہاں ہوتی ہے ٹھیک ہے وہ بھی۔ اپنی جاب میں مصروف ہے کہتا ہے ادھر آ کر پونیس ڈیپارٹمنٹ ہی جوائن کرے گا۔“ ”یہ تو اچھی بات ہے اشعر بہت سمجھدار اور بہادر ہے خطروں سے بے نیاز اور نڈر۔ اُس کے لیے یہی مناسب ہے۔“ عمر نے سراہا۔ طاہر نے بونلے سے سرکواشات میں ہلا دیا۔ طاہر نے چائے کے ساتھ خاصا اہتمام کر لیا۔ یہی وجہ تھی جب عمر زیب گھر واپس آئے کھانے کی حاجت ہی نہیں تھی۔ دریکٹانے اکیلے ہی کھانا کھایا۔

☆☆☆

مازہ چھینوں کے بعد گاؤں سے آگئی تھی اور شاہ زیب پہ زور دے رہی تھی کہ عمر چچا سے اپنے اور اُس کے رشتے کی بات کرے۔ کیونکہ اُس کی بیوا خالدہ بھی اپنے بیٹے کے لیے اُس کا رشتہ مانگ رہی تھی۔ باسٹ ماڑہ سے تین سال بڑا تھا۔ بیوا کی بڑی آرزو تھی کہ ماڑہ اُس کی بہو بنے۔ مگر شریں کا ارادہ کچھ اور تھا۔ اُس کی نگاہ شاہ زیب پہ تھی۔ ادھر ماڑہ نے باسٹ کے رشتے کا بتا کر شاہ زیب کو پریشان کر دیا تھا۔ ماڑہ نے کہا تھا کہ ای ابو ہاں کر دیں گے اگر آپ کی طرف سے خاموشی رہی۔ ”میں آج پپا سے بات کرتا ہوں۔“ وہ ماڑہ کو تسلی دے کر پپا کے بیڈروم کی طرف آ گیا مگر وہ وہاں نہیں تھے۔ معاً اُسے یاد آیا کہ اس وقت وہ اسٹڈی روم میں ہوں گے۔ اُس نے ادھر کا ہی رُخ کیا۔ وہ مطالعے میں مگن تھے۔ شاہ زیب اُن کے سامنے رُکا تو وہ چونک گئے۔ جانے کیا بات تھی جو اس وقت وہ اُن کے پاس آیا۔ کیونکہ جب وہ اسٹڈی روم میں ہوتے تو سختی سے کہتے کہ مجھے ڈسٹرب مت کیا جائے۔ شاہ زیب کے چہرے پہ بے پناہ سنجیدگی اور اضطراب تھا۔ عمر پریشان ہو گئے اور کتاب بند کر کے رکھ دی۔ ”پپا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کچھ چمکیا ہٹ کا شکر ہونے لگا۔ ”خیریت تو ہے اس وقت کون سی بات کرنی ہے جو تم نے صبح ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اور کہتے ہوئے گھبرا بھی رہے ہو۔“ ”پپا میں ماڑہ سے محبت کرتا ہوں اور اُس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

اُس نے تمام تر حوصلہ جمع کر کے کہہ ہی دیا۔ ادھر عمر حیران حیران نگاہوں سے اُسے تکتے رہ گئے جیسے یہ توقع نہ کر رہے ہوں کہ وہ بھی یہ بات کر سکتا ہے۔ باہر اسٹڈی روم کے دروازے کے ساتھ ماڑہ چپکے سے کھڑی تھی۔ وہ شاہ زیب کے پیچھے آئی تھی۔ وہ خود اپنے کانوں سے سنا چاہتی تھی سب کچھ۔ شاہ زیب نے اپنی بات کر دی تھی اب اندر خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔ ایک موٹی بھی گرتی تو آواز آتی۔ ”تمہارے ذہن میں یہ بات کیسے آئی اور ابھی تمہارا عمر ان باتوں کے قابل نہیں ہے۔ بیس سال کے بھی نہیں ہوئے ہو پورے اور شادی کی بات کر رہے ہو۔“ عمر زیب بڑے تلخ انداز میں گویا ہوئے۔ باہر کھڑی ماڑہ سر تاپا سلگ اٹھی۔ ”عشق عاشقی کے چکر سے نکل آؤ اپنی تعلیم پہ توجہ دو اور جاؤ اپنے بیڈروم میں۔“ عمر قطعی بے چک اور ٹھوس انداز میں بولے۔ شاہ زیب کے کندھے جھک سے گئے وہ تھکے تھکے قدموں سے باہر نکلا۔ ماڑہ تیزی سے دروازے کی اوٹ میں ہوگی۔ شاہ زیب اُس کی دہاں موجودگی سے بے خبر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ اپنے کمرے

میں گھسنا ماڑہ تب دروازے کی اوٹ سے باہر نکلی۔ اُس کے تو پورے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ عمر چچا نے شاہ زیب کی اچھی خاصی انسلٹ کر دی تھی اور اُس کی زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا تھا۔ ”بزدل کہیں گا۔“ اُس نے بڑے مغز سے یہ لفظ ادا کیے۔ وہ ابھی اور اسی وقت شاہ زیب سے اس بزدلی کی بابت بات کر کے شرم دلانا چاہتی تھی مگر رات کافی ہو گئی تھی اور اُسے غصہ بھی بہت زیادہ آیا ہوا تھا۔ وہ بات کرتی تو لازماً اُس کی آواز اونچی ہو جاتی اور پھر کوئی نہ کوئی جاگ جاتا۔ سب کو پتہ چلتا اور بات بڑھتی۔ وہ ہرگز ایسا نہیں چاہتی تھی بلکہ خاموشی سے سب کام انجام ہوتا دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ گھر میں شاہ زیب سے بات نہیں ہو سکتی تھی اس موضوع پہ۔ کیونکہ دریکٹا اور پھر عمر زیب موجود ہوتے۔ اس بات کو کرنے کے لیے سکون فراغت اور تنہائی درکار تھی۔ سو اس کے لیے باہر ہی کوئی جگہ مناسب تھی۔ جہاں کسی کے نکل ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی کیونکہ نیند تو آ کے نہیں دے رہی تھی۔ دوسری طرف عمر زیب اور شاہ زیب بھی جاگ رہے تھے۔ عمر کی پریشانی اپنی جگہ تھی۔ شاہ زیب نے اُس کے سامنے کھڑے ہو کر محبت اور شادی کی بات کی تھی۔ شاہ زیب کی پریشانی اپنی نوعیت کی تھی کہ پپا نے اُس کی بات ہی نہیں سنی ہے اُلٹا انسلٹ کر دی ہے۔ تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ خود کو حق بجانب تصور کر رہے تھے۔

☆☆☆

ماڑہ اور شاہ زیب کا لُح جانے کے بجائے قریبی رشتہ داروں میں آنکے بیٹھ گئے۔ یہاں فیملی کیسین بھی تھے۔ وہ دونوں بھی ایک ایسے ہی کیسین میں موجود تھے۔ دریکٹا کو ڈراپ کر کے دونوں نے یہاں بیٹھ کر بات کرنے کا پروگرام بنایا۔ ماڑہ بہت پریشان پریشان ہی لگ رہی تھی۔ شاہ زیب کی اپنی حالت اُس سے مختلف نہیں تھی۔ رات بھر اُسے نیند نہیں آئی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ماڑہ نے اُس پہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ رات عمر چچا اور اُس کے مابین ہونے والی گفتگو وہ سن چکی ہے۔ ”آپ نے چچا سے بات کی رات کو.....“ شاہ زیب نے سر جھکا لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماڑہ اُس کے چہرے کے تاثرات میں موجود شکست کی کوئی تحریر پڑھ سکے۔ ”ہاں کی تھی“ خاصی دیر بعد وہ گویا ہوا۔ ”کیا کہا آپ نے اور پھر چچا نے کیا جواب دیا؟“ وہ ایک بار پھر نگاہیں چرانے لگا۔ ”میں نے بات کی پپا سے وہ کہتے ہیں ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔“ وہ کہتے ہوئے بہت شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ ماڑہ کے لبوں پہ طنز یہ مسکراہٹ رہنے لگی۔ ”شاہ زیب میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ عمر چچا کبھی نہیں مانیں گے۔ مجھے اُن کے انداز میں اپنی ساری فیملی کے لیے ایک عجیب اور بے نام سی نفرت نظر آتی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کبھی مانیں گے۔ ٹھیک ہے ای ابو باسٹ کے لیے ہاں کر دیں گے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ نے تو اپنی طرف سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ جو نقد بر میں لکھا ہے وہ ہو کے رہے گا۔ آپ شاید میری قسمت میں نہیں ہیں۔ اس لیے ابتدائی مرحلے میں ہی انکار ہو گیا ہے۔ ویسے بھی بیوا خالدہ امی کے پیچھے بڑی ہوئی ہیں کہ جلدی سے ہاں کر دیں۔“ شاہ زیب کے دل پہ باسٹ کے نام سے چھریاں ہی پھر گئیں جیسے تڑپ ہی تو اٹھا۔ ”پپا کو ماننا ہوگا۔ تم میری محبت ہو۔ تمہارے لیے مجھے اگر پپا کو چھوڑنا پڑا تو وہ چھوڑ دوں گا۔“ ”اتنا حوصلہ اور ہمت ہے آپ میں۔“ ماڑہ اُسے آزار ہی تھی۔ ”حوصلہ اور ہمت بہت ہے وقت آنے پہ تم بھی دیکھ لو گی۔“ اُس کے لہجے میں پختہ چٹانوں کا ساعزم تھا۔ ”اور کون سا وقت آئے گا بیوا خالدہ چکر پہ چکر لگا رہی ہیں اور ادھر عمر چچا مان ہی نہیں رہے ہیں۔“ وہ جھنجھلا اٹھی۔ ”کہاناں نہ پریشان ہو۔ بہت جلدی تم میری ہوگی۔ پپا کو ماننا ہوگا سب کچھ میں عاقل و بالغ ہوں۔ وہ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے نہ میں

ان کی مانوں گا۔ میری اپنی زندگی ہے اپنی خواہشات ہیں۔ کسی کو بھی اپنے ساتھ اپنے جذبات کے ساتھ کھینے یا تماشہ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا بے شک وہ پیاہی کیوں نہ ہوں۔ میں ان سے ان کی نفرت کا سبب بھی پوچھوں گا۔ اس سے وہ بہت خود غرض اور سنگدل سا نظر آ رہا تھا۔ سرشاری مارہ کی رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ منزل دور نہیں تھی۔ شاہ زیب چٹانی عزائم رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی منوا کے چھوڑنی تھی۔ مارہ کو یقین ہو چلا تھا۔

☆☆☆

در یکتا بے چینی سے شاہ زیب کا انتظار کر رہی تھی وہ اُسے ابھی تک لینے نہیں آیا تھا۔ چھٹی ہوئے بھی آدھ گھنٹہ ہو رہا تھا۔ اُس نے چوتھی بار رسٹ واپس پہ وقت کا اندازہ لگایا تھا۔ ادھر شاہ زیب ابھی تک مارہ کے ساتھ تھا۔ اُسے تیزی سے بھاگتے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا کہ در یکتا اُس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ مارہ نے ہی کہا کہ در یکتا کو چھٹی ہو چکی ہوگی۔ تب ہی اُسے ہوش آیا اور وہ تیزی سے کی چین اٹھا کر گاڑی کی سمت لپکا۔

در یکتا اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے تاخیر سے آنے کا سبب اُس نے نہیں پوچھا۔ بلکہ خاموشی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ مارہ خلاف توقع آج اگلی سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ ورنہ وہ بھی اُس کے ساتھ پیچھے ہی بیٹھتی تھی۔ واپسی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔ نہ مارہ نے کوئی بات کی اور نہ ہی در یکتا یا شاہ زیب میں سے کوئی بولا۔ شاہ زیب گاڑی میں چابی یونہی لگی چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ مارہ بھی بیک اٹھا کر اتر گئی۔ اُن دونوں کا رویہ در یکتا کو بہت عجیب اور پُر اسرار سا لگ رہا تھا۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کر پارہے تھے۔ رات جو کچھ ہوا در یکتا اُس سے لاعلم تھی۔ ورنہ شاید اس خاموشی کا سبب کسی نہ کسی حد تک وہ جان ہی لیتی۔

☆☆☆

شاہ زیب کے زور زور سے بولنے کی آواز پہ در یکتا نے بہت تیزی سے سلام پھیرا۔ اُس کا دل دہل سا گیا۔ پھر اُس سے دعا ہی نہیں مانگی گئی۔ اُس نے مصلے یونہی چھوڑا۔ اور اُلٹے سیدھے جوتے پہن کر باہر دوڑ لگائی۔ شاہ زیب آج سے پہلے کبھی اس طرح اونچی آواز میں نہیں بولا تھا۔ ٹی وی لاؤنج کا منظر در یکتا کے خاصا پریشان کن تھا۔ شاہ زیب پاپا کے سامنے اکڑ کر کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں سرکشی اور ہٹ دھری واضح تھی۔ وہ دروازے کا پتہ تھام کر ادھر ہی کھڑی ہو گئی۔ ”میں عاقل و بالغ ہوں مجھے اپنی پسند منتخب کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ مجھے میرے دین نے پسند کی شادی کا پورا حق دیا ہے۔“ وہ گویا ایک ایک لفظ چبا کر بول رہا تھا۔ ”گیٹ لاسٹ فرام میئر شاہ زیب۔“ عمر زیب پوری قوت سے دھاڑے۔ شاہ زیب ادھر ہی جما رہا۔ ”میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں نے شادی کرنی ہے تو صرف مارہ سے کرنی ہے۔“ میں جا رہا ہوں نی الحال لیکن پاپا یہ مت سمجھے گا کہ میں نے ہار مان لی ہے۔ آپ ٹھنڈے دل سے سوچ لیں پھر مجھے جواب دیں میں انتظار کر لوں گا ایسی بھی بے صبری نہیں مجھے۔“ اس وقت در یکتا کو شاہ زیب بہت خود غرض نظر آ رہا تھا۔ پاپا کے سامنے کس طرح بد تمیزی سے اکڑ کر کھڑا تھا۔ مارہ کا نام لیے جانے پہ اُس پہ ساری حقیقت کھل گئی کہ سارا جھگڑا اور اصل کس بات پہ ہے۔

شاہ زیب دھم دھم کرتا در یکتا کو ہاتھ سے پرے کرتا نکل گیا۔ وہ بھاگ کر پاپا کے پاس آئی۔ جو کرسی پہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے تھے۔

”پاپا آپ ٹھیک ہیں نا۔“ وہ اُن کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اُن کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو بچہ سرد سے

محسوس ہو رہے تھے۔ ”جاؤ میں ٹھیک ہوں۔“ اُن کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش صاف محسوس کی جا رہی تھی۔ در یکتا کے دل کو کچھ ہوا ”پاپا کیا ہوا ہے آپ کو..... اور بھائی اس طرح کیوں بول رہا تھا۔ مجھے بھی تو بنا کیں نا۔“ وہ سخت متوحش تھی۔ ”بیٹھو ادھر اوپر۔“ عمر زیب نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اُن کی پیشانی کی ایک رگ بار بار پھڑک رہی تھی۔ اور یہ اسی وقت ہوتا تھا جب وہ بہت پریشان ہوتے اور کسی سے کچھ کہہ نہ پاتے۔ آج ایسا لگ رہا تھا اگر انہوں نے دل پہ پڑا بوجھ نہ اتارا تو اُن کا دماغ، دل، وجود سب ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔ در یکتا اُن کے دونوں ہاتھ تھامے سخت پریشان کے عالم میں اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی پر اس کوشش میں وہ در یکتا کو پہلے سے بڑھ کر قابل رحم لگے۔ اُس کا دل کٹنے لگا اور آنکھوں میں نمی در آئی۔ ”وہ کہتا ہے کہ مارہ کے لیے میرا پروپوزل لے کر جائیں فوراً۔ ورنہ اُس نے دھمکی دی ہے کہ اگر اُس کی بات نہ مانی گی تو وہ کورٹ میرج کر لے گا۔ کچھ اٹلا سیدھا کر لے گا اپنے ساتھ۔“ عمر زیب یکدم برسوں کے بیمار نظر آنے لگے تھے۔ در یکتا اُن سے بڑھ کر پریشان تھی۔ یکا یک شاہ زیب کو کیا ہو گیا تھا کیسی باتیں کر رہا تھا وہ۔ پاپا کے سامنے اُس نے آنکھیں اٹھا کر بات نہ کی تھی اور آج خود اُس نے شاہ زیب کو کتنی بد تمیزی سے بات کرتے سنا اور دیکھا۔

مارہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ سارا دن اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ شاہ زیب دل کی بھڑاس نکال کر چاچکا تھا۔ در یکتا اور عمر زیب بالکل خاموش تھے۔ ایک طوفان نے اُس کے آشیانے کا رخ کر لیا تھا۔ یہ طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا لینے کے درپے تھا۔

”پاپا پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ در یکتا نے بھیگی آنکھوں سمیت مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اُنہیں تسلی دی تو وہ فقط سر کو ہلا کر رہ گئے۔

عمر زیب نے آنے والی وقت کی آہٹوں کو پہچان لیا تھا۔ شاہ زیب کے تیور ہار ماننے والے نہیں لگ رہے تھے انہیں ہی جھکنا تھا۔ ساری عمر خود کو خاندانی سازشوں کے تانے بانوں سے دور رکھا تھا پراتنی احتیاط کے باوجود ہونی ہو کر رہی تھی۔ اس بار جب وہ گاؤں گئے تو تینوں بھائیوں نے جس طرح رشتوں کی بات کی تھی تب سے وہ اندر ہی اندر کھٹک لگے تھے۔ مگر انہیں کچھ خوش فہمیاں بھی لاحق تھیں جو شاہ زیب کی سرکشی نے دور کر دی تھیں۔ مارہ بھائی کی بیٹی تھی اپنا خون تھا۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو اس میں مضائقہ بھی تو نہیں تھا۔ پر شریں نے مارہ کو مہرہ بنا کر آگے بڑھایا تھا۔ وہ اچھی طرح جان گئے تھے۔

☆☆☆

برآمدے اور بیرونی گیٹ کے علاوہ سارے گھر کی لائٹیں آف تھیں۔ شاہ زیب نے گاڑی ڈرائیوے میں کھڑی کر کے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سارا گھر خاموشی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پاپا کے بیڈروم کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک تانے کے لیے اُس کے قدم رے پر پھر فوراً ہی آگے بڑھ گئے۔ مارہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو جیسے شاہ زیب کی آمد کے انتظار میں دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اُس کے قدموں کی مخصوص چاپ کو پہچان کر اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ ملجلی سی روشنی میں اُس کا سراپا واضح تھا۔ اُس نے ہونٹوں پہ اُننگی رکھتے ہوئے شاہ زیب کو خاموشی کا اشارہ کیا۔ دونوں اندر آ کر بیٹھے گئے۔

مارہ کی رنجش کی گواہ آنکھیں سرخ سرخ نظر آ رہی تھیں جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔ شاہ زیب کو پاپا کے

کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے جو ملال ہوا تھا مائزہ کی آنکھیں دیکھ کر پل بھر میں مٹ گیا۔ ”تم نے کھانا کھایا؟“  
 ”نہیں“ مائزہ نے نفی میں سر ہلایا ”کیوں نہیں کھایا؟“ وہ فکر مندی سے بولا ”بس جی نہیں چاہتا تھا میرا چچا بہت آپ سیٹ  
 رہے ہیں۔ آپ نے اس طرح بول کر اچھا نہیں کیا ہے۔ بات منوانے کے ضد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔  
 اب وہ سوچ رہے ہوں گے اس کے پیچھے میری امی کا اور میرا ہاتھ ہے جس کی وجہ سے آپ ان سے یوں بولے۔ میں اپنی  
 فیملی اور اپنی عزت کے معاملے میں بہت حساس ہوں آپ کو پتہ ہونا چاہیے۔“ مائزہ کا لہجہ بہت مضبوط تھا۔ ”تمہاری عزت  
 میری عزت ہے چنانچہ کہہ کے تو دیکھیں۔ میں ان سے ابھی جواب مانگ لیتا پر وہ سو رہے ہیں کل دیکھوں گا۔ اور تم فکر  
 مت کرو۔ وہ نارمل ہو جائیں گے۔“ شاہ زیب نے اسے دائیں بازو کے گھیرنے میں سمیٹ لیا۔ کچھ پل اس کیفیت میں  
 گزر گئے مگر پھر بہت جلد مائزہ اُس سے دور ہو گئی۔ ”آپ جائیں آرام کریں رات کافی ہوگی ہے۔ اس طرح یہاں بیٹھنا  
 مناسب نہیں ہے۔“ کوئی بات نہیں بہت جلد تم میرے پاس ہوگی پھر دیکھوں گا کہاں بھاگ کے جاؤ گی مجھ سے۔“ شاہ  
 زیب ٹھنڈی سانس بھرتا پلٹ گیا۔

اگر وہ ایک بار پیچھے مڑ کے دیکھ لیتا تو اسے مائزہ کی آنکھوں میں انجانا سی خوشی اور کامیابی کی چمک صاف نظر آ جاتی۔  
 اُسے مائزہ کی آنکھوں کی سرخی تو نظر آ گئی تھی پر عمر زیب کے دل کا خون اُسے بالکل نظر نہیں آیا تھا۔ اُس کی  
 سرکشی کا گھاؤ بھرنے والا نہیں تھا۔ اپنی دلی خواہشات کے سامنے اُن کی تکمیل کے سامنے اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ محبت کی  
 کانی پٹی جوان آنکھوں پہ بندھ جائے تو پھر اپنی بھلائی بھی نظر نہیں آتی۔

☆☆☆

عمر شکست خود رہ نظر آرہے تھے۔ شاہ زیب آج بھی اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ پر آج اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی  
 تھیں۔ عمر نے ہار مان لی تھی اور مائزہ کے گھر رشتہ جلد لے جانے کا کہہ دیا تھا۔ ”تم فکر مت کرو۔ میں بہت جلد  
 اور نگزیب سے بات کروں گا۔ اب مائزہ کا اس طرح ہمارے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے جس لڑکی نے کل بہو بن کر ہمارے  
 گھر آنا ہے اُسے اپنے ماں باپ کے پاس موجود ہونا چاہیے۔“ شاہ زیب بہت شرمندہ تھا۔ پر عمر نے ہاتھ اٹھا کر اُسے  
 کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔ ”بس ٹھیک ہے میں غلطی پہ تھا۔ کچھ بھی سہی مائزہ میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ ایک طرح سے  
 میرا اپنا خون ہے۔ وہ میری بہو بن جاتی ہے تو اچھی بات ہے۔ اپنے خاندان کے ساتھ میرا رشتہ اور مضبوط ہو جائے گا۔  
 اچھا ہے میرے پاس اپنی برسوں پرانی غلطی کی تلافی کا سنہرا موقع ہے۔“ آخری جملہ انہوں نے بہت ہی آہستہ آواز میں  
 کہا۔ جو کوشش کے باوجود شاہ زیب نہ سن سکا۔ اُسے تو آج اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔ دلی مراد اتنی آسانی  
 سے پوری ہونے جا رہی تھی۔ اُس کے پاس مزید کچھ سوچنے کا نام ہی نہیں تھا۔ ہنستا مسکراتا وہ مائزہ کو یہ خوشخبری سنانے  
 کے لیے ڈھونڈنے لگا۔

☆☆☆

عمر زیب نے طاہر لغاری کو بھی گاؤں ساتھ جانے کے لیے کہا تھا۔ ہاں دریکتا اور شاہ زیب اس بار ساتھ نہیں جا  
 رہے تھے۔ صرف عمر زیب اور طاہر لغاری ہی جا رہے تھے۔ شاہ زیب کے لیے مائزہ کا رشتہ طلب کرنا تھا۔ رسم درواج کو  
 بھی تو دیکھنا تھا۔ مگر شاہ زیب کا بس چلنا تو مائزہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس لے آتا۔ ہمیشہ کے لیے۔  
 طاہر لغاری، عمر زیب کے ساتھ مائزہ بھی آئی تھی۔ وہ اپنی ساری چیزیں بھی سمیٹ کے لے آئی تھی۔ ایسا تو

مکان ہی نہیں تھا کہ وہ گھر میں ہونے والی سرگرمیوں سے بے خبر رہتی۔ پھر شاہ زیب اُسے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بتاتا  
 تھا۔ اس لیے وہ گاؤں واپسی پہ بہت خوش تھی۔  
 عمر زیب کے ساتھ طاہر لغاری اور مائزہ کو دیکھ کر شریں ٹھٹھک سی گی۔ مائزہ نے اشاروں میں اُن کی آمد کا  
 مقدمہ بتا دیا تھا۔ اُسے تو ہاتھ پاؤں پڑے گے۔ ہارون اور نوید تک بھی خبر پہنچ گی اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ دونوں کی بیویوں کو  
 پتہ نہ چلنا، ذرا سی دیر میں سب اُن کے ہاں جمع ہو گئے۔ عمر نے اپنی آمد کی غرض دعائیت بیان کر دی۔ اور نگزیب بہت خوش  
 ہوا۔ اٹھ کر بھائی کو گلے لگایا۔ ”مائزہ تمہاری بیٹی ہے اب یہ ہماری نہیں ہے نہ لیس یہ ہمارا کوئی حق ہے“ اور نگزیب کے لہجے  
 سے ہی اس کی خوشی محسوس کی جا رہی تھی۔

فرح اور نوذیہ قدرے الگ بیٹھی شریں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب کو مٹھائی کھلاتے ہوئے وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی  
 جیسے میدان مار لیا ہو۔

شاہ زیب اور مائزہ کی بات پکی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

فرح اور نوید میں بحث چل رہی تھی۔ ”میں کہتی ہوں اب آپ بھی بات کریں عمر بھائی سے اس سے پہلے کہ کوئی  
 اور یہ تیزی دکھا جائے آپ اپنے طور پہ کہہ دیں عمر بھائی سے۔ تاکہ سب کو پتہ چل جائے۔ ارے میں کیسے بات کر دوں  
 پچھلی بار اس موضوع پہ بات ہوئی تھی۔ تو عمر نے کہا تھا کہ ابھی دریکتا پڑھ رہی ہے۔ چھوٹی ہے۔ اُس کے بعد دیکھا جائے  
 گا۔“ نوید نے پرانی بات کے الفاظ رو بدل کے ساتھ پھر سے اپنی شریک سفر کے سامنے دہرائی تو وہ غصے سے آگ بگولہ  
 ہو گئی۔ ”ابھی آپ عمر بھائی کے پاس تو نہیں گئے ہیں نا۔ جب ہم اُن کے گھر جا کر اسجد کے رشتے کی بات کریں گے تو  
 پھر وہ یہ نہیں کہیں گے کہ ہماری بیٹی اچھٹی ہے۔ یہ تو ہر باپ کہتا ہے مگر ایک نہ ایک دن بیٹی ذات کو پرانے گھر رخصت تو  
 کرنا ہوتا ہے۔ عمر خوش ہوگا۔ ہمارا اسجد لائق فائق تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ عمر کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹی دینے میں۔  
 آخر کو اور نگزیب بھائی کی طرح آپ بھی اُس کے بھائی ہیں۔ شریں بھائی نے تو ایک بار بھی نہیں کہا کہ ہماری مائزہ چھوٹی  
 ہے۔ انہوں نے تو جیسے شکر ادا کیا۔ شاہ زیب کے رشتے پہ۔ آخر کو اتنی بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ راج کرے گی مائزہ۔“  
 فرح کے لہجے سے رشتہ دھند صاف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بول رہی تھی اور نوید خاموشی سے سن رہے تھے۔ دل میں بیگم کی  
 باتوں سے وہ بھی متفق تھے۔

☆☆☆

کچھ اسی طرح کے باتیں حویلی کے دوسرے حصے میں موجود نوذیہ اور ہارون میں بھی ہو رہی تھیں۔ نوذیہ تو  
 باقاعدہ شوہر سے لڑ رہی تھی۔ ”آپ منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور فرح نوید بھائی کے ساتھ رشتے کے لیے چلی جائے گی۔  
 آپ بھی عمر کے بھائی ہیں۔ اُس کی بیٹی پہ ہمارا بھی حق ہے۔“ میں دو تین دن تک جاؤں گا عمر کی طرف۔“ بالآخر ہارون  
 زیب نے فیصلہ کر ہی لیا۔ نوذیہ کی باچھیں خوشی سے کھل گئیں۔ ”میں بھی تو جاؤں گی نا۔ آخر کو قاسم کی ماں ہوں۔  
 صاف کہہ دوں گی عمر بھائی سے کہ دریکتا ہماری امانت ہے۔“ وہ ہاتھ نچا کے بولی۔ ہارون دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔  
 عمر نے تو کہہ دیا تھا کہ جب تک دریکتا تعلیم سے فارغ نہیں ہو جاتی اُس وقت تک وہ اُس کا رشتہ طے کرنے کے بارے  
 میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور نوذیہ نے ناک میں دم کیا ہوا تھا کہ جاؤ اور جا کے عمر بھائی سے بات کرو۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں



مرح اور کو میدان سے پہلے لڑنے میں بازی نہ لے جائیں۔

شریں بھابھی کی تیزی اور عقل مندی سے دونوں ہی خائف تھیں۔ اُس نے ماثرہ کو شہر عمر بھائی کے پاس پریشان کر کے لیے بھیجا تھا اور اب بالآخر وہ اسی گھر کی مالکن بننے جا رہی تھی۔ تیزی اور ہوشیاری اسی کو کہتے ہیں۔ اُن دونوں کو بات پتہ نہیں تھی کہ عمر زیب شاہ زیب کی ضد سے مجبور ہو کر گاؤں آئے ہیں۔

☆☆☆

ایک بوجھ عمر کے سر سے اتر گیا تھا۔ شاہ زیب کی ضد پوری ہو گئی تھی۔ اب بہن ہونے کی حیثیت سے دروازے کے اپنے ارمان تھے۔ وہ چارہ ہی تھی کہ دھوم دھام سے بھائی کی منگنی ہو۔ عمر اُس کی خواہش نال نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ منگنی کے دعوت نامے چھپوائے گئے۔ دوست احباب میں تقسیم ہوئے۔ ماثرہ کے لیے بوتیک سے زوق برق منگنی کا جوڑا لیا گیا۔ ساتھ جیولری۔ بہت دھوم دھام سے منگنی ہوئی۔ اب باضابطہ طور پر ماثرہ شاہ زیب کی منگنی بن گئی تھی۔ وہ آئے روز گاؤں پہنچا ہوتا یا پھر ماثرہ کے کالج۔ اپنے مستقبل اور پڑھائی کی طرف سے وہ بالکل لاپرواہ ہو گیا تھا، دل و دماغ میں ماثرہ سے ملنے کی دھن سمائی رہتی۔ باقی دنیا کی کسی چیز کی اُسے ہوش نہیں تھی۔ اُس کی دنیا ماثرہ سے شروع ہو کر ماثرہ پہ ہی ختم ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اُس نے شاہ زیب پہ کیا جادو کیا تھا جو اُسے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ بس وہ ہی وہ تھی۔

عمر زیب کی طبیعت گزشتہ نینتے سے خراب تھی۔ تھوڑا سا گلہ خراب ہوا اُس کے بعد زکام شروع ہوا پھر پورے جسم کو بخار نے جکڑ لیا۔ وہ کہیں آنے جانے کے قابل ہی نہیں رہا۔ گھر پہ بستر کا ہی ہو کے رہ گیا۔ طاہر لغاری ددوں پہلے آ کے دیکھ گئے تھے پھر اس کے بعد وہ بھی نہیں آئے۔ اُن کا بیٹا انگلینڈ سے آیا ہوا تھا وہ دوستوں رشتہ داروں اور ملنے ملائے والوں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اشعر انگلینڈ میں ہی مقیم تھا آج کل چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔ طاہر بہت خوش تھے۔ اشعر کے آنے سے پہلے وہ روز عمر زیب کے پاس آتے کانی دیر بیٹھتے۔ گپ شپ لگاتے۔ وہ نہیں آرہے تھے تو عمر بھی اداس اداس تھے۔ طاہر سے بات کر کے وہ اپنے مسئلے مسائل دکھ درد بھول جاتے۔

نویس دسویں دن اُن کی حالت میں کچھ بہتری ہوئی تو وہ خود گاڑی ڈرائیو کر کے طاہر کی طرف چلے گئے۔ وہاں خوشیوں کے سارے رنگ اترے ہوئے تھے۔ طاہر لغاری کے اکثر رشتے دار اشعر کی آمد کا سن کر آئے ہوئے تھے۔ جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔

طاہر لغاری سے حقیقی معنوں میں دوستی راحیلہ کی شادی کے بعد شروع ہوئی تھی۔ طاہر اُس وقت انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ اُن کے بیوی بچے وہیں تھے۔ طاہر کا اپنا بزنس تھا اور اُس میں وہ خاصے کامیاب تھے۔ راحیلہ کے ساتھ شادی پہ آمادہ وہ طاہر ہی کی وجہ سے ہوئے تھے۔ بعد میں طاہر پھر انگلینڈ واپس لوٹ گئے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وہیں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن کی بیگم ایک اتفاقی حادثے میں اللہ کو پیاری ہو گئی تو انہوں نے دیکھ بھال کر دونوں بیٹیوں کی شادی ابھر انگلینڈ میں ہی کر دی۔ اشعر دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ چار سال پہلے طاہر لغاری مستقل طور پر پاکستان لوٹ آئے۔ یہیں گھر بنایا۔ اُن کے اکثر رشتہ دار بھی اِدھر ہی تھے۔ سو لگتے لگتے دل لگ ہی گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اشعر نے بھی اُن کے پاس اوٹ آنا تھا۔ بیٹیاں بھی اکثر و بیشتر پاکستان اُن کے پاس چکر لگا جاتیں۔ وہ خوش تھے اور بے فکری زندگی گزار رہے تھے۔ فکر معاش سے آزاد تھے اس لیے بڑھاپے میں بھی عمر چور تھے۔ چہرے پہ تازگی اور

مسکراہٹ رہی۔ وہ ہنسنے ہنسانے والے انسان تھے۔ اسی بنا پہ عمر زیب کی ان کے ساتھ بہت ہی سی۔

عمر زیب کو دیکھ کر طاہر گرجوٹی سے اُس کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ اشعر بھی اُن کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا اور عمر سے ملا۔ وہ چند ٹاپے کے لیے اُسے دیکھتے رہ گئے۔ بہت شاندار صحت تھی اشعر کی۔ لہذا چوڑا کڑیل جوان، اُس کی گرفت میں مضبوطی اور سختی تھی۔ ”اللہ نظر بد سے بچائے۔“ انہوں نے دل ہی دل میں دعا دی۔ وہ اُن سے حال احوال پوچھ رہا تھا۔ بہت صاف اور رواں اُردو میں لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ انگلینڈ میں پلا پڑھا ہے۔ طاہر نے اپنی اولاد کو اپنی روایات اور ماحول سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ انگلینڈ میں رہ کر بھی پاکستانی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ویسے بھی اشعر پاکستان آتا جاتا رہتا تھا۔ یہاں کا کلچر رہن بہن، زبان، بولی، کچھ بھی اُس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

عمر زیب کانی دیر اُس سے باتیں کرتے رہے۔ اشعر کچھ کام مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں ہی رہنے کا خواہش مند تھا۔ آئندہ دو ایک سالوں میں اُس نے لوٹ آنا تھا۔ وہ بہت باشعور اور سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ اس لیے عمر کو اچھا ہی لگا۔ اُدھر اُن کا اپنا لاڈلا بیٹا تھا جسے آج کل کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اُسے بس گاؤں اور ماثرہ کے کالج کے چکر لگانے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ رات کا کھانا کھائے بغیر طاہر اور اشعر نے اُنہیں اُٹھنے نہیں دیا۔

☆☆☆

کالج کے باہر گاڑی لیے شاہ زیب ماثرہ کے ہی انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گیٹ سے باہر نکلی تو پہلی نگاہ شاہ زیب پر ہی پڑی۔ اُس کی ساتھی لڑکیوں نے کھی کھی کر کے ہنسا شروع کر دیا۔ ماثرہ شرمندہ سی ہو کر انہیں ڈانٹنے لگی۔ ”کیوں ہنس رہی ہو تم لوگ۔“ تمہارا دیوانہ آج پھر آیا ہوا ہے۔“ سمرن اُس کی گہری دوست چمک کر بولی۔ ”ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں۔“ وہ کچھ تک کر بولی تو سمرن حیرت سے اُسے نکلنے لگ گئی۔ شاہ زیب دولت مند اور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ماثرہ کو بے پناہ چاہتا تھا۔ ماثرہ بڑے فخر سے بتاتی تھی کہ شاہ زیب نے اُس کی خاطر اپنے پاپا سے ٹکری ہے اور لڑ جھگڑ کر اُسے اپنایا ہے۔ اس سچو ایشن میں کبھی کبھی سمرن کو اُس کی بیزاری سمجھ نہیں آتی تھی۔ حالانکہ ماثرہ شاہ زیب کے مقابلے میں اتنی حسین بھی نہیں تھی۔ وہ سب فرینڈز شاہ زیب کی پرسنالٹی اور اُس کی نت نئی مہنگی گاڑیوں سے خاصی متاثر تھیں پر ماثرہ کی تیوریاں چڑھی ہی رہتیں۔

شاہ زیب نے گاڑی کا اگلا دروازہ اُس کے لیے کھول دیا۔ خود ماثرہ کا ڈرائیور کالج گیٹ سے کچھ ہٹ کر مالکن کے انتظار میں تھا۔ شاہ زیب نے پیسے دے کر اُس کا منہ بند کیا ہوا تھا۔ ماثرہ کے ساتھ کچھ وقت گزار کر وہ اُسے گیٹ کے پاس چھوڑ دیتا۔ جہاں سے وہ اپنی گاڑی میں گھر جاتی۔ کچھ دن گزرتے ہی وہ گاؤں پہنچ جاتا۔ رات گزار کر اگلے دن گھر لوٹتا۔ اُس کی دارلنگی کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ کل سے بیٹا خالہ اپنے بیٹے باسط کے ساتھ حویلی آئی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے ماثرہ جلدی گھر لوٹنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ جھنجھلائی ہوئی روٹھی روٹھی سی لگ رہی تھی۔ اُس کا دھیان بھی شاہ زیب میں نہیں تھا۔ اُس نے بہت جلدی اُس کی یہ ذہنی غیر حاضری پکڑ لی۔ ”کیا بات ہے کن خیالوں میں گم ہو۔“ شاہ زیب گاڑی موڑ کر مین روڈ سے اتر آیا تھا۔ پاس ہی تھوڑی سی آبادی تھی۔ اُس نے گاڑی ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر دی۔ اب ماثرہ مکمل طور پر اُس کے سامنے تھی۔ ”شاہ زیب روز روز اس طرح ملنا ٹھیک نہیں ہے۔ امی ابو کو آپ کا آئے روز گاؤں چلے آنا بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی ہی روایات کو بھول رہے ہیں۔ اس سے میری عزت پہ حرف آتا ہے۔ ماثرہ غصے میں تھی۔ شاہ زیب بھی غصے میں آ گیا۔ چابی انکیشن میں گھما کر گاڑی سٹارٹ کی اور واپس ہولیا۔ ماثرہ کو کالج کے پاس کھڑی اُس



یہ رہی ہے پاس ڈراپ کرے وہ دن سے لیں لیا۔ اس دوران نہ نو ماہ کے اس سے بات کی نہ روکنے کی کوشش کی۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ باسٹھ نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ”آہ آگئی ہو واپس“ وہ اس سے تین سال بڑا تھا۔ پر قد کاٹھ ڈیل ڈول ایسا تھا کہ ماہ سے کم سے کم چار پانچ سال بڑا نظر آتا۔ عمر کے مقابلے میں اس کے چہرے پر چنگلی تھی۔ ماہرہ آپ جناب کا تکلف کے لیے بغیر دھڑلے سے تم کہہ کر مخاطب کرتی۔ ”ہاں تم سناؤ کیا ہو رہا تھا۔“ وہ بیگ رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”ہونا کیا تھا تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ آؤ تو گپ شپ لگاؤں تم سے۔ پتہ ہے یہاں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے۔“ ”نہیں مجھے نہیں پتہ۔“ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”یہاں میری دلچسپی کی سب سے بڑی وجہ تم ہو صرف تم۔“

ماہرہ کا دل دھڑک اٹھا۔ اصولی طور پر باسٹھ کے منہ سے یہ بات سن کر اسے خفا ہونا چاہیے تھا۔ روکنا چاہیے تھا۔ مگر اسے حیرت انگیز طور پر جانے کیوں یہ بات بالکل بڑی نہیں لگی۔ ”خالہ کو بہت جلدی تھی ناں تمہاری مگنی کی۔ آخر تمہارے چچا کا بیٹا بہت امیر ہے جائیداد کا مالک ہے۔ اس کے سامنے ہم غریبوں کی دال کہاں گنئی تھی۔ پیسے والے جیت گے اور ہم غریب دل والے منہ دیکھتے رہے گے۔ ان نے بہت طنز یہ انداز میں یہ سب باتیں کی تھیں۔ ماہرہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔ ایک بار بھی اسے نہیں ٹوکا۔ ”کہا بھی تو اتنا کہ“ میں یونیفارم تبدیل کر لوں۔ پھر خالہ سے اور تم سے بات ہوتی ہے۔“ اسے وہیں کچھ سوچتا چھوڑ کر ماہرہ اندر غائب ہوگی۔

☆☆☆

شاہ زیب بہت ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے گھر پہنچا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنے بیڈروم میں آکر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ دل میں ماہرہ کی بے زحنی نے آگ لگا دی تھی۔ اوپر سے رہ رہ کر اس کی باتیں ذہن پہ تھوڑے برسار ہی تھی۔ ”شاہ زیب روز روز اس طرح ملنا ٹھیک نہیں۔ امی ابو کو آئے روز آپ کا گاؤں چلے آنا بھی پسند نہیں۔ آپ اپنی ہی روایات کو بھول رہے ہیں۔ ایسے میری عزت پر حرف آتا ہے۔“ شاہ زیب نے غصے میں بیڈ پر پڑے تمام ٹکیے کارپٹ پر دے مارے۔ غصہ کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کتنا فاصلہ طے کر کے موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر اسے دیکھنے اور ملنے کے شوق میں آئے روز جاتا اور اسے پروا ہی نہیں تھی۔ گویا شاہ زیب اس کی انسلٹ کر رہا تھا۔ آج تو اس نے بیگانگی کی حد کر دی تھی۔ ایک بار بھی اسے روکا نہ منایا۔ بس غصے میں بیٹھی دیکھتی رہی اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ دریا لٹا پریشان ہی ہوگی کہ جانے کیا بات ہے جو شاہ زیب اس طرح کمر بند کیے پڑا ہے۔ اس نے دروازے پر زور دار انداز میں دستک دی۔ چند سیکنڈز کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ عجیب بکھرا بکھرا سا حلیہ تھا اس کا۔ آنکھیں سرخ چہرے پر یاسیت جیسے برسوں کا مریض ہو۔ ”بھائی کیا ہوا ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے جو شام سے اس طرح لینے ہوئے ہیں۔“ اس کی محبت نے جوش مارا۔ ”نہیں کسی نے کیا کہنا ہے بس ایسے ہی دل دل چار ہا تھا کیلے رہنے کو۔ خیر تم چائے بناؤ ایک کپ میں ادھر ٹی وی لاؤنج میں ہی آ رہا ہوں بیٹا اور تمہارے پاس۔“ وہ سر ہلانی کچن کی طرف آگئی۔ چائے لے کر جب وہ ٹی وی لاؤنج میں آئی تو شاہ زیب پیپا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے دن بعد آج وہ اس طرح پیپا کے پاس بیٹھا نظر آیا تھا۔ اسے بہت اچھا لگا۔ بڑا بھر پور منظر تھا مکمل گھریلو منظر۔ بھائی، بہن اور باپ۔ ہلکی پھلکی گپ شپ ہو رہی تھی جب باتوں کے درمیان شاہ زیب اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کی خاموشی بڑی معنی خیز تھی جانے اس کے پس منظر میں کیا راز تھا۔ بالآخر راز کھل ہی گیا۔ ”پاپا میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ عمر کے ساتھ ساتھ دریا لٹا بھی حیران ہوئی۔ ”وقت آنے پہ شادی بھی ہوگی۔“

جائے کی۔ ”عمر خاصے محل سے کام لے رہے تھے۔“ لیکن پیپا میں بہت جلد شادی کرنا چاہتا ہوں ایک دو ماہ کے اندر اور میں نے پلان بھی کر لیا ہے۔“ اس کا انداز حتمی تھا۔ ”ابھی تمہاری تعلیم مکمل نہیں ہوئی ہے کم سے کم چار پانچ سال لگیں گے اس کے بعد شادنی کا سوچا جائے گا۔“ ”پاپا میں نے شادی کرنی ہے بس۔ مزید تعلیم میں نے حاصل نہیں کرنی۔ آپ کے ساتھ بزنس میں ہیلپ کرنی ہے آفس میں بیٹھنا ہے۔“ وہ پھر روایتی ضد پر اتر آیا تھا۔ عمر نے اسے سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی۔ ”تمہاری عمر ابھی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تم شادی کے بارے میں سوچ سکو۔ بیس اکیس سال کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔“ ”پاپا میں سمجھ رہا ہوں۔ شادی کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہوں۔ بس جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ کل سے آپ کے ساتھ آفس جاؤں گا۔“ عمر سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ یہ اب نئی دھن اس کے دماغ میں ساگی تھی۔ شاہ زیب کا منہ بند کرنے کی خاطر انہیں اور نگزیب بھائی سے بات تو کرنی تھی۔ انہیں پتہ تھا بھائی نے اتنی جلدی ماہرہ کی شادی نہیں کرنی ہے۔ وہ بھی پڑھ رہی تھی۔ کم سے کم شاہ زیب تک ان کا جواب تو پہنچ جاتا۔ اسی طرح اس کے ساتھ نمٹا جاسکتا تھا۔

وہ اور نگزیب بھائی سے بات کرنے کی سوچ رہے تھے کہ وہ خود ہی چلے آئے۔ عمران سے پتاک سے ملے۔ سب کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد دونوں بیٹھ گئے۔ ”شاہ زیب کہیں نظر نہیں آ رہا ہے کہاں ہے۔“ ان کی متلاشی نگاہیں بے چین سی لگ رہی تھی۔ ”دوستوں کی طرف گیا ہے۔ آپ سنا میں کیسے آنا ہوا ہے۔“ ”بس ایک کام تھا تم سے اس لیے آیا ہوں۔ اصل میں ماہرہ نے اپنی ماں سے بات کی ہے کہ شاہ زیب ہر تیسرے دن اس کے کالج چلا آتا ہے۔ اس کا یہ عمل مناسب نہیں ہے ابھی یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے مگر جب کھل گئی تو میری بیٹی کی کتنی بدنامی ہوگی۔ یہ بات کسی نے نہیں سوچی ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں کہ اسے سمجھاؤ یہ چیز اچھی نہیں ہے۔“ عمر کا دل چار ہا تھا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ شاہ زیب نے اپنی حرکتوں سے انہیں اور خاندان کو بدنام کرنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انہوں نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ یہ وقت ہوش سے کام لینے کا تھا نہ کہ جوش سے۔ ”بھائی جان میں آپ کی طرف آنے کی سوچ رہا تھا اچھا ہوا آپ خود چلے آئے۔ میرا دل ہے کہ شاہ زیب اور ماہرہ کی شادی کر دی جائے۔ ہماری بہتری اسی میں ہے۔ شاہ زیب جوان خون کا مالک ہے۔ جذبات پر بند نہیں باندھے جاسکتے۔ آپ دو تین ماہ میں تیاری کریں میں بھی کرتا ہوں اور ماہرہ کو رخصت کرا کے لے آتا ہوں۔ اس مسئلے کا یہ سب سے اچھا حل ہے۔“ عمر کی بات پہ اور نگزیب خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگے۔ ”چلو ٹھیک ہے میں گھر جا کر شریں سے بات کرتا ہوں۔ میرے خیال سے تمہاری بات ٹھیک ہے شادی کر دینی چاہیے۔“ ان کی نگاہیں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ عمر نے سکون کا سانس لیا۔ یہ مسئلہ تو حل ہوا تھا۔

☆☆☆

فوزیہ نے نوید کا پیچھالے لیے تھا کہ آپ عمر بھائی سے رشتے کی بات جلدی کریں۔ ماہرہ اور شاہ زیب کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی اس کے سینے پہ سانپ لوٹ رہے تھے کہ اس کے مجازی خدا فضول میں تاخیر کر رہے ہیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں کوئی اور دریا لٹا کا رشتہ نہ ماگ بیٹھے۔ فرح کی باتیں انہوں نے اپنے کانوں سے سنی تھیں وہ اپنے بیٹے قاسم کو گھر داماد بنانے کے چکر میں تھی اور اس کی پلاننگ بڑے دور تک کی تھی۔

☆☆☆

چھٹی کے دن عمر زیب دیر سے ناشتہ کرتے تھے۔ ان کے ساتھ دریا لٹا اور شاہ زیب بھی ہوتا۔ دریا لٹا صرف چھٹی کے دن ہی ناشتہ کرتی باقی دن اپنے کالج پہنچنے کی جلدی ہوتی اور وہ ناشتے کے نام پہ چائے یا دودھ ہی پیتی۔ آج

شاہنگ وہ خود کر رہا تھا۔ ماڑہ کے لیے "برائیدل" خالصتا اس کی چوائس تھی۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا اس کا اشتیاق بے قراری اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

ماڑہ سے بات بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ جب سے شادی کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس نے پورا کے ڈانٹنے پہ گاؤں جانا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے ماڑہ فون پہ بات بھی کم ہی کرتی۔ ویسے بھی شادی کے دن قریب تھے اس نے کافی حد تک برداشت کا مظاہرہ کیا تھا۔ دریکتا خریدی ہوئی چیزیں کھانے کے بیٹھ جاتی، کپڑے، جوتے، جیوری، جانے کیا کیا ابلاتا۔ پر اسے بہت اچھا لگتا۔ وہ پپا سے ایک ایک چیز پہ رائے لیتی اور شاہ زیب سپنوں اور رنگوں کی دنیا میں کھرتا جاتا جہاں ماڑہ اس کے ہمراہ ہوتی کوئی رکاوٹ اور دوری نہ ہوتی۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہا تھا اسے ارمان کے ساتھ آج اپنی شادی کی خصوصی شاہنگ کے لیے جانا تھا۔ پپا نے نوکا بھی آرام سے کھاؤ۔ "پپا ارمان آ رہا ہے میں لیٹ کر جاؤں گا"۔ اس نے دودھ کا گلاس آدھاپی کر باقی چھوڑ دیا اور ٹپکن سے ہاتھ صاف کر کے اٹھ گیا۔

دریکتا نے ناشتے کے بعد تمام برتن اٹھوائے۔  
عمر زیب طاہر لغاری کو فون کرنے لگے۔ اشعر نے اگلے ہفتے انگلینڈ واپس جانا تھا۔ وہ چارہ تھے کہ اشعر کی زبردستی دعوت کی جائے۔ "السلام علیکم" فون دوسری طرف سے طاہر نے ہی ریسو کیا اور سلام کیا۔ "وعلیکم السلام کیا کر رہے ہو"۔ انہوں نے پوچھا۔ "کچھ خاص نہیں نی وی دیکھ رہا ہوں۔ اس عمر میں اور کیا کرنا ہے"۔ طاہر نے اپنے مخصوص گفتگو انداز میں قہقہہ لگایا تو عمر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ "اشعر کی واپسی کب تک ہے"۔ "یار اس نے بارہ تاریخ کو جانا ہے رات کی فلائیٹ ہے"۔ طاہر نے فوراً حساب لگا کر بتایا۔ "تو ایسا کرو کہ میں دس تاریخ کو تمہیں اور اشعر کو دعوت پہ انوائٹ کر رہا ہوں آ جانا"۔ نیکی اور پوچھ پوچھ میں سر کے بل آؤں گا۔ کانی ٹائم ہو گیا ہے اچھا سا کھانا کھائے ہوئے۔ "طاہر نے بات کے اختتام پر پھر قہقہہ لگایا"۔ میں تمہیں اچھا سا کھانا ہی کھلاؤں گا۔ چلو بعد میں بات ہوتی ہے۔ "عمر نے سیل فون بات ختم کر کے سائیز ٹیبل پہ رکھ دیا انہوں نے جیسے ہی فون رکھا ملازم اندر داخل ہوا۔ صاحب جی گاؤں سے مہمان تشریف لائے ہیں میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا ہے"۔ "ٹھیک ہے جاؤ میں ادھر ہی آ رہا ہوں"۔ وہ سوچتا رہے تھے کہ شاید اور نگریب بھائی اور شریں بھابھی ہوں گے پر ان کے سامنے نوید بھائی اور فوزیہ بھابھی مہمانوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ نوید بھائی نے انہیں گلے لگا لیا حال احوال پوچھا۔ فوزیہ بھابھی نے بھی خوش اخلاقی سے ان کا حال دریافت کیا۔ پھر اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد عمر نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

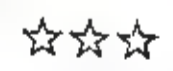
دریکتا کو بھی ان کی آمد کی اطلاع مل گی وہ سیدھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ فوزیہ چچی نے اسے بہت پیار سے گلے لگایا۔ اکٹھے تین چار بوسے اس کے رخساروں پہ ثبت کیے۔ "کیسی ہے میری بیٹی تم نے تو گاؤں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کانی عرصے سے چکر نہیں لگایا ہے۔" دیکھو ایڈ پب اسجد بھی آیا تھا تمہارا پوچھ رہا تھا۔ فارینہ کہہ رہی تھی آج تمہیں ساتھ لے کر آؤں۔" انہوں نے اپنی چھوٹی بیٹی کا نام لیا۔ دریکتا محبت کے اس پُر خلوص مظاہرے سے بہت متاثر ہوئی۔ "جاؤنگی ناں گاؤں میرے ساتھ"۔ وہ پُر امید نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کا سر خود بہ خود ہی میکا کی انداز میں اثبات میں ہلا۔ "چچی میں آؤں گی ضرور لیکن ابھی نہیں میرے کوڑے ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد آؤں گی"۔ "ہاں ہاں ضرور آنا سب بہن بھائی تمہارا پوچھتے ہیں"۔ دریکتا کا دل محبت سے سرشار ہو گیا کہ اس کے کزنز اس سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر

ان کے پاس بیٹھ کر کچن کی طرف آئی تاکہ خاناماں کو کھانے بارے میں بتائے۔ چچا اور چچی آئے تھے اہتمام لازمی تھا۔

"بھائی جان ہم آپ کے پاس خاص کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔" اور یکتا کے جانے کے بعد فوزیہ چچی نے بات کرنے کے لیے تمہید باندھی تو عمر کو ایسا لگا کہ جیسے وہ خاص کام دریکتا کے سلسلے میں ہو۔ انہوں نے بے اختیار پہلو بدلا۔ فوزیہ نے نوید کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ باقی بات تم کرو۔ نوید فوراً نگاہوں کا اشارہ سمجھ گیا۔ "عمر میں تمہارے پاس اپنے بیٹے اسجد کے رشتے کے لیے آیا ہوں۔ تم دریکتا کو ہماری بیٹی بنا دو۔ بس ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بات کر کے اب عمر کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جس پہ اچانک پریشانی کے سائے پھیل گئے تھے۔ "ابھی دریکتا پڑھ رہی ہے چھوٹی ہے میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا ہے۔" عمر بولتے تو رہے تھے مگر انہیں لگ رہا تھا جیسے ان کی آواز کسی کنوئیں سے نکل رہی ہو۔ اس موقع پہ فوزیہ نوید کی مدد کے لیے آگے بڑھی۔ "ابھی اسجد بھی پڑھ رہا ہے ہم کون سا کہہ رہے ہیں کہ ابھی شادی کریں۔ کوئی رسم کر لیتے ہیں تاکہ سب کو پتہ چل جائے۔ جب دریکتا پڑھائی سے فارغ ہو جائے تو پھر شادی کر لیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ نی الحال اسجد اور دریکتا کا نکاح کر دیا جائے۔ رخصتی بعد میں ہوتی رہے گی۔ اب ماڑہ کو ہی دیکھ لیں۔ دریکتا سے ڈھائی تین سال ہی بڑی ہوگی۔ اس کی شادی بھی تو ہو رہی ہے۔ لڑکیاں جلدی سیانی ہوتی ہیں۔ عمر بھائی میں دریکتا کو بیٹی بنا کے رکھوں گی۔ آپ بس ہاں کر دیں۔" عمر پریشانی سے بھائی اور بھادج کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں نکاح والی بات بھی چھ رہی تھی۔ جانے کیوں پس منظر میں انہیں کسی منفی صورتحال کا احساس ہو رہا تھا۔

انہیں اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا کہ دریکتا کا رشتہ ان سے ضرور طلب کیا جائے گا۔ دریکتا کا رشتہ طلب کرنے کے پیچھے ان کی اپنی غرض پوشیدہ تھی اس لیے عمر زیب پریشان تھے۔ "میں آپ کو کچھ دن بعد جواب دوں گا"۔ بالآخر انہیں ایک جواب سوجھ ہی گیا۔ جانے کیوں وہ خود کو اتنا کمزور محسوس کرنے لگے تھے جو صاف انکار ہی نہیں کر پائے تھے۔ "ٹھیک ہے عمر بھائی آپ سوچ لیں پر جواب ہاں میں ہونا چاہیے۔ شاہ زیب کی شادی بھی قریب ہے۔ میرے دل میں بھی اسجد کے لیے بہت ارمان ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ شاہ زیب کی شادی کے موقع پہ سینکڑوں مہمانوں کی موجودگی میں دریکتا کو منگنی کی انگوٹھی پہناؤں۔ عمر بھائی یہ میری خواہش ہے۔ امید ہے آپ ہمارا خیال کریں گے۔" آخر میں فوزیہ چچی کا لہجہ لجاجت سے بھر گیا۔

عمر بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے۔  
انہیں پریشانی اور سوچوں کے سپرد کر کے فوزیہ بھابھی اور نوید بھائی چلے گئے۔ رات عمر کو نیند ہی نہیں آئی۔ جانے کیوں دل بیکل سا تھا۔



سیل فون مسلسل سریلی آواز میں گنگنائے جا رہا تھا عمر نے نمبر دیکھا گھر سے کال تھی۔ انہوں نے آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف رحیم دار تھا ان کا گھریلو ملازم۔ اس نے بتایا کہ گاؤں سے ہارون صاحب اور ان کی بیگم آئے ہیں۔ آپ گھر تشریف لے آئیں۔ عمر نے فون بند کر کے رکھا تو چہرے پہ پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ "الہی خیر"۔ "پتہ نہیں اب ہارون بھائی کیوں آئے ہیں"۔ وہ آہستہ سے بڑبڑائے اور نیکل بجا کر بیون کو بلایا۔ اس نے ان کا بریف کیس اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔ ہارون کی شو فر نے وردا زہ کھولا۔ ان کے بیٹھے ہی گاڑی اشارٹ ہو کر جانے بیچانے راستوں پہ دوڑنے لگی۔ فقط دو دن پہلے ہی تو نوید بھائی فوزیہ بھابھی کے ساتھ آئے تھے۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ اپنی

خیالات کی رو میں بستے ہوئے گھر پہنچے۔ ہارون بھائی اور فرح بھائی انہی کے انتظار میں تھے۔ سلام و دعا سے فارغ ہوتے ہی اپنی آمد کا مدعا بیان کر دیا۔ ”عمر میں قاسم کے لیے دریکتا کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔ تم ہمارے چھوٹے بھائی ہو۔ میرے بیٹے پہ سب سے زیادہ حق تمہارا بنتا ہے۔ اور میں ناں نہیں سنوں گا بتادوں کیونکہ دریکتا مجھے بہت پیاری ہے۔ بیٹیوں کی طرح۔“ عمر کو لگ رہا تھا جیسے ابھی صبر کھودیں گے۔ کیا انداز تھا رشتہ مانگنے کا۔ جیسے رشتہ مانگنے نہ آئے ہوں دھمکی دینے آئے ہوں۔ اُن کی مرضی وہ ہاں کریں یا ناں۔ ”عمر بھائی مجھے پتہ ہے آپ دریکتا سے بہت محبت کرتے ہیں آخر کار وہ آئندہ کی نشانی ہے۔ شاہ زیب کی شادی کریں گے مائزہ بہو بن کے آئے گی اور اسی طرح دریکتا کو بھی رخصت ہو کے جانا پڑے گا میں نے ہارون نے یہی سوچا ہے کہ شادی کے بعد قاسم آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اس طرح دریکتا بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ رخصت ہو کے بھی آپ کے ساتھ رہے گی۔ میں بھی بیٹی کی ماں ہوں نہیں چاہتی کہ دریکتا کی شادی کر کے آپ اکیلے ہو جائیں۔ یہ فیصلہ آپ کی تنہائی اور بیٹی سے آپ کی محبت دیکھ کر ہم دونوں نے کیا ہے، فرح یہ اس طرح بول رہی تھی جیسے اُسے عمر زیب کی بھلائی سب سے زیادہ عزیز ہو۔ ”ہاں عمر اب ہاں کر دو ایسا رشتہ اور کہاں ملے گا۔“ ہارون بھائی نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر خود قریب کر لیا۔ اُس نے بڑی آہستگی سے ہارون بھائی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔ جانے انہوں نے اس کی خاموشی سے کیا نتیجہ اخذ کیا تھا۔ ”اچھا آرام سے سوچو پھر بتانا مگر شاہ زیب کی شادی کے موقعے پہ کوئی رسم ضرور ہونی چاہیے۔ کیونکہ فرح تم بھی تو بولو۔“ انہوں نے اپنا چہرہ فرح کی طرف کر لیا تھا۔ جہاں خاموشی تائید نظر آرہی تھی۔ خوشی اُس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی کیونکہ ہارون اُن کے مجازی خدا نے بہت اچھے طریقے سے بات کی تھی عمر زیب نے ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ نیم رضا مند تھے۔ عمر بالکل خاموش بیٹھے تھے درمیان میں بھائی اور بھادج کی کسی بات پہ محض سر ہلارہے تھے۔

دریکتا کالج میں تھی۔ فی الحال وہ ان سرگرمیوں سے لاعلم ہی تھی۔ دوسرے عمر زیب نے بھی اُس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ شاہ زیب کی شادی کی تیاری میں لگی تھی۔ کالج سے آنے کے بعد سارا وقت ادھر ہی خرچ ہوتا۔ اُسے نہیں پتہ تھا کہ اندر ہی اندر کیا فیصلے ہو رہے ہیں۔ جوں جوں شادی کے دن قریب آرہے تھے اُس کی خوشی بھی بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

طویل ڈرائیو دے میں وہ شاندار سی گاڑی آکر رُکی۔ دریکتا نے پکن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ طاہر انکل کے ساتھ وہ لمبا چوڑا نوجوان جو اندر کی طرف آرہا تھا اُس کے لیے مکمل طور پہ اجنبی تھا۔ آج طاہر لغاری اور اُن کے بیٹے کی اُن کے گھر دعوت تھی۔ وہ پکن میں موجود خود مختلف کھانوں کی تیاری کا جائزہ لے رہی تھی۔ کیونکہ پپانے کہا تھا کہ کہیں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ طاہر لغاری کا بیٹا پہلی بار اُن کے گھر آرہا تھا۔

اس لیے خانساں کے سر پہ کھڑے ہو کر اُس نے سب کام کر دیا تھا۔ پپانے اُسے کہا تھا جب مہمان آجائیں تو ڈرائنگ روم میں آ کے مل لینا۔ سو اُن کے حکم کی تعمیل میں وہ ڈرائنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ اندر داخل ہوتے وقت وہ رُک سی گی۔ انکل طاہر کا بیٹا پہلی بار اُن کے گھر آیا تھا اس سے پہلے اُس کا سامنا نہیں ہوا تھا اس لیے وہ جھجک سی گی۔ طاہر انکل نے بڑی محبت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اُن کا بیٹا کھڑا ہو گیا اور بڑے مہذبانہ طریقے سے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ بمشکل وہ تین چار سنٹ وہاں رکی۔ طاہر انکل آتے جاتے رہتے تھے پُر اُن کا بیٹا پہلی بار آیا تھا اور اُسے اجنبیوں سے نامعلوم ہی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ جیسی اس وقت طاہر انکل کے بیٹے سے ہو رہی تھی۔

اس نے شکر کیا کہ ڈرائنگ روم سے باہر آئی۔ عمر، طاہر اور اشعر تینوں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں شاہ زیب بھی آ گیا اور اُن کے ساتھ شامل ہو گیا۔

کھانا دریکتا نے ہی سرو کیا۔ عمر نے اُسے بھی کھانے میں شامل ہونے کو کہا پُر اُس نے معذرت کر لی۔ کھانے کے بعد عمر نے طاہر سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائنگ روم میں اشعر اور شاہ زیب ہی تھے۔ طاہر عمر کے ساتھ ہو لیے۔ وہ اُسے لے کے قدر کھلی فضا میں آگے۔ ”ہاں بھئی کیا بات ہے جو اس طرح مجھے یہاں لے آئے ہو؟“ طاہر لغاری اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں بولے۔ ”خاص بات ہی ہے تب ہی یہاں لایا ہوں۔“ اس بار انہوں نے اپنی پریشانی چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ طاہر اُس کے مزید بولنے کے انتظار میں تھے۔ ”میں پہلے ہی شاہ زیب کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے پریشان تھا اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ پہلے نوید بھائی اپنے بیٹے کے لیے دریکتا کا رشتہ مانگنے آئے اور اس کے دو دن بعد ہارون بھائی آگئے۔ وہ مجھ پہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ میں فوراً ہاں کر دوں تو وہ کوئی چھوٹی موٹی رسم کر لیں بلکہ وہ نکاح کا بول رہے ہیں۔ عجیب سی دھونس اور دھمکی تھی اُن کے انداز میں۔ بلکہ فرح بھائی کہہ رہی تھیں کہ میں قاسم کو گھر دبا دینا اس طرح میری بیٹی میری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ اب دو بھائی ہیں دونوں کی ایک ہی خواہش ہے۔ میں سخت پریشان ہوں ایک کو ہاں کرتا ہوں تو دوسرا ناراض ہوتا ہے دوسرے کو ہاں کرتا ہوں تو پہلا ناراض ہو جائے گا۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ تھک جائے گا۔ مجھے پرانے زخم بھی بھولے نہیں ہیں۔ میں اپنی بیٹی کو وہاں کیسے دے دوں۔ شاہ زیب کی ضد نے مجبور کیا ہے ورنہ اُس کا رشتہ بھی میں نے دل پہ پتھر رکھ کے طے کیا ہے۔ میرے اپنوں کو واقعی اگر مجھ سے محبت ہوتی تو میں یہ سب خوشی خوشی کرتا۔ لیکن اُن کو اپنے اپنے مفاد عزیز ہیں۔“

بولتے بولتے عمر کی آواز بھراگی تو طاہر لغاری نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ جیسے تسلی دینا چاہا ہو۔ ”اس مسئلے کا ایک حل ہے میرے پاس۔“ ”کیا“ عمر تیزی سے بولے۔ ”تم اشعر کو اپنا بیٹا بنانا پسند کرو گے۔“ عمر پہ تو شادی مرگ والی کیفیت طاری ہوگی۔ طاہر یہ کیا کہہ رہے تھے۔ کیا اُن کے کان دھوکا تو نہیں کھا رہے تھے۔ ”کیا کہا تم نے“ انہوں نے تصدیق چاہی۔ ”میں اگر اشعر کے لیے دریکتا کا رشتہ مانگوں تو دے دو گے۔“ اس بار انہوں نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر کہا۔ عمر طاہر سے لپٹ گئے۔ ”ایسا ہو جائے تو میری پریشانی ختم ہو جائے۔“ ”میں آؤں گا ایک دو دن تک باقاعدہ رشتہ لے کر۔ تم مت فکر کرو۔“ انہوں نے عمر کا کندھا زور سے دبایا۔ اچانک ہی انہیں اپنا وجود ہلکا ہونے کا احساس ہوا۔ طاہر نے بہت بڑی پریشانی دور کر دی تھی۔ اشعر کو دیکھتے ہی اُن کے ذل نے بے اختیار ایک خواہش کی تھی کہ دریکتا کو بھی کوئی ایسا ہی ہمسفر نصیب ہو۔ اُن کے دل کی خواہش رب نے جان لی تھی۔ سب کچھ بہت آسان ہو گیا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب نے دریکتا کو کالج جانے سے منع کر دیا تھا کہ گھر میں کچھ مہمان آرہے ہیں۔ انہیں دریکتا سے اشعر کے رشتے کی بات کرتے ہوئے حجاب سا ہور ہا تھا۔ وہ اُسے بہت پیار کرتے تھے مگر اس موضوع پہ بات کرنا انہیں بہت مشکل لگ رہا تھا۔ کوئی عورت ہوتی تو آرام سے بات کر لیتی وہ خود کیا بات کرتے۔ بس کہا بھی اتنا کہ کچھ مہمان آرہے ہیں۔ اچھے طریقے سے ڈریس اپ ہو جاؤ۔ انہیں شدت سے آئندہ کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ دریکتا کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص بات ہو۔ کیونکہ پپا بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔

طاہر لغاری کی طرف سے کچھ رشتہ دار مرد اور تین چار عورتیں تھیں۔ پپانے چائے لے کر ڈرائنگ روم میں

مالک میچورنو جوان تھا۔

ظاہر نے نیتیں کر کے اُسے منایا لیا۔

☆☆☆

ظاہر انکل کے بیٹے کے ساتھ کل شام اُس کا نکاح تھا۔ یہ بات شاہ زیب نے اُس تک پہنچائی تھی۔ پھر رات پنا بھی اُس کے پاس چلے آئے اور دھیرے دھیرے بتا ہی دیا کہ کل اُس کی زندگی کا اہم ترین دن ہے۔ وہ سن کر خاموشی ہو گی۔ عمر نے جانے اُس کی خاموشی سے کیا مطلب نکالا کہ اُس کے پاس بیٹھ گئے بلکہ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا "بیٹا میں زندگی کی سختیوں کے ساتھ مقابلہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ ایک دن تمہاری شادی ہونی ہے اس گھر سے تمہیں رخصت ہونا ہے تو میں نے ان حالات میں جو مناسب سمجھا ہے وہی کیا ہے میں اپنوں کے ساتھ مزید لڑ نہیں سکتا۔ تمہارے دونوں چچا ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ میں اُن کی خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ تمہیں اگر کوئی اعتراض ہے تو مجھے بتا دو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔" اُن کے اتنا کہنے کی دیر تھی دریکتا اُن سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ "نہیں پاپا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" عمر شانت سے ہو گئے۔ اُسے چپ کرانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی سسکیاں تھم گئیں تو عمر بھی اُٹھ گئے۔ اُن کے جانے کی دیر تھی وہ پھر سے رونے لگی۔ پر اس بار اُس کی کوشش تھی کہ اُس کے رونے کی آواز باہر نہ جائے۔

☆☆☆

اشعرتا تناسا اُن کے ساتھ عمر انکل کے گھر آیا تھا۔ انہوں نے تو اچھے خاصے لوگوں کو انوائٹ کیا ہوا تھا۔ گاؤں سے دیگر رشتہ داروں کے ساتھ اور نگزیب بھائی اور اُن کی فیملی ہی آئی تھی۔ ہارون اور نوید بھائی کے گھر والے عمر کے تین چار بار جانے کے باوجود راضی کرنے کے باوجود نہیں آئے تھے۔ اس وجہ سے عمر زیب بہت دکھی اور آرزو نظر آ رہے تھے۔ اُن کی خوشی اُدھوری ہی تھی۔ دل ہی دل میں اور نگزیب بھائی بھی ناخوش تھے پر ماثرہ کی وجہ سے خاموش تھے۔ ورنہ باقی دونوں بھائیوں کی طرح وہ بھی نہ آتے۔ پر مصلحت کا تقاضا تھا کہ اپنی ناپسندیدگی کو عیاں نہ کیا جائے۔ عمر سے تعلقات بگاڑنے کا رسک وہ لے نہیں سکتے تھے۔

شریں دریکتا کے پاس بیٹھی تھی۔ مولوی نکاح کا رجسٹر اٹھائے اندر داخل ہوا تو وہ سمٹ ہی گی۔ ایجاب و قبول کے بعد دریکتا نے دستخط کیے۔ اس دوران اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر اُبل پڑا تھا۔ شریں دھیرے دھیرے اُس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ بظاہر وہ بھی خوش تھی پر ظاہر لغاری کے ساتھ آئے اُن کے دست احباب اور اشعرا کو دیکھنے کے بعد مارے حسد کے دل خاک ہوا جا رہا تھا۔ وہ بھی اسی حق میں تھیں کہ دریکتا کی شادی خاندان میں ہی ہو۔ پر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ تب ہی تو قدر نے اُسے اشعرا لغاری کی شریک سفر بنا دیا تھا۔

☆☆☆

نکاح اور کھانے کے بعد مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہو گئے تھے۔ صرف ظاہر اشعرا اور اُن کے کچھ رشتہ داری رہ گئے تھے۔ اور نگزیب اور شریں نے رات ادھر ہی گزارنی تھی۔ اشعرا بار بار کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ظاہر لغاری اُس کی بیزاری بھانپ چکے تھے۔ لہذا عمر سے اجازت لی اور واپسی کا قصد کیا۔ اشعرا خود ہی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ظاہر نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی نارٹل ہو گیا۔ ظاہر نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اُس کے چہرے کے تاثرات سے گھبرا گئے تھے۔

آنے کو کہا۔ آج شاہ زیب بھی گھر پہ ہی تھا۔ خیر وہ سوچتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ چاروں عورتیں اُسے ملیں۔ مردوں نے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ سب اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ نزوں سی ہو کر نگاہیں جھکا کر رہ گئی۔ اُسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ چائے کے برتن اٹھانے کے بہانے وہ باہر آئی تو سکون کا سانس لیا۔ شاہ زیب رہ رہ کے اُسے شریک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی جو اتنا اسرار پھیلا ہوا تھا۔

وہ باہر آئی تو کچھ دیر بعد شاہ زیب بھی اُس کے پیچھے آ گیا۔ "تمہیں پتہ ہے یہ مہمان کیوں آئے ہیں۔" وہ اب بھی اُسے شرارت سے دیکھ رہا تھا۔ میکا کی انداز میں اُس کا سر نیلی میں ہلا۔ "ظاہر انکل کی طرف سے یہ سب تمہارے رشتے کے لیے آئے ہیں۔ ظاہر انکل بھی پہنچنے والے ہوں گے مٹھائی لینے رک گئے تھے۔ شاہ زیب نے ساری حقیقت اُس پر عیاں کر دی۔ وہ خود میں عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ واقعی تھوڑی دیر بعد ظاہر انکل بھی آ گئے۔ شاہ زیب اُسے دوبارہ انداز مہمانوں کی طرف لے گیا۔ سب مہمانوں کا منہ بیٹھا کرایا گیا۔ ظاہر انکل نے خود اُسے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی۔ مزید دریکتا سے یہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اُٹھ آئی۔

پیچھے عمر ظاہر لغاری سے کہہ رہے تھے کہ میں کل گاؤں جاؤں گا شاہ زیب کی شادی کی تاریخ لینے ساتھ دریکتا کے رشتے کے بارے میں بھی بتا دوں گا کہ طے کر دیا ہے۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ اس بات سے بہت مسئلے مسائل پیدا ہوں گے۔ "وہ اب بھی پریشان ہی تھے۔" تم اگر یہ تصور کرتے ہو کہ اس سے مسئلے پیدا ہوں گے تو ہم اشعرا اور دریکتا کا نکاح کر دیتے ہیں۔ ویسے بھی اشعرا کی سیٹ کینسل ہو گی ہے تم جس طرح کہو۔ ظاہر لغاری نے کچھ دیر سوچنے کے بعد تجویز پیش کی۔ عمر کے دل کو یہ بات بھاگی۔ "ٹھیک ہے اس طرح کر لیتے ہیں" وہ فوراً مان گئے۔ وہیں بیٹھ کے صلاح مشورہ ہوا۔ اشعرا کی سیٹ کینسل ہو گئی تھی۔ اُس نے اگلے ہفتے کی دوبارہ بک کر دانی تھی۔ اُس کی واپسی سے چار دن پہلے نکاح کی تقریب رکھی گی۔ اپنے خاص خاص ملنے جلنے والوں کو عمر نے دعوت دے دی تھی۔ اب گاؤں جانا تھا۔

☆☆☆

"کیا کہہ رہے ہو عمر تم نے دریکتا کا رشتہ طے بھی کر دیا اور اب نکاح کی دعوت دینے آئے ہو۔" سب سے پہلے نوید بھائی اُس پہ چڑھ دوڑے۔ "بس ظاہر لغاری نہیں چھوڑ رہا تھا۔" انہوں نے کمزور سے انداز میں صفائی دی۔ "تمہیں سگے خون رشتوں سے بڑھ کر دوست عزیز ہے۔ کیا بات کی ہے تم نے۔" ہارون بھائی کا چہرہ غصے سے لال سرخ ہو رہا تھا۔ "بہر حال آپ سب نے آنا ہے۔" عمر نے اُن کے غصے کو اہمیت نہیں دی۔ اور نگزیب کو بھی دل میں سخت غصہ تھا پر ماثرہ عمر کی بہو بننے جاری تھی انہوں نے غصہ ظاہر کرنے کی حماقت نہیں کی۔ شاہ زیب کی شادی کی تاریخ وہ لے آئے تھے۔ دو ہفتے بعد ماثرہ نے بہو بن کے اُن کے گھر آ جانا تھا۔

سب اُن سے ناراض تھے۔ ہارون، نوید بھائی اور دونوں بھائیوں نے کھل کے اپنا غصہ اُن پہ ظاہر کر دیا تھا۔

☆☆☆

اشعرا کو ظاہر لغاری نے جس طرح نکاح کے لیے رضامند کیا تھا وہی جانتے تھے۔ وہ ابھی نکاح جیسے بندھن کے حق میں نہیں تھا۔ ٹھیک ہے اُن کے کہنے پہ عمر انکل کی مشکلات جاننے کے بعد اُس نے اس رشتے پہ نیم آمادگی ظاہر کر دی مگر اب نکاح والی بات اُسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عمر انکل کی بیٹی اُسے خاصی کم عمر اور امیچو نظر آئی تھی دیکھنے میں جب وہ دعوت پہ اُن کے گھر گیا تھا۔ کم سے کم بھی وہ اُس سے سات آٹھ سال چھوٹی تھی۔ دریکتا کے مقابلے میں وہ مضبوط سوج کا

اُسے سی آف کرنے پہا کے ساتھ عمر انکل اور شاہ زیب بھی آئے تھے۔ اشعر کا خیال تھا کہ شاید اُن کے ساتھ دریکتا بھی ہو۔ پر گاڑی سے عمر انکل اور شاہ زیب کو اترتے دیکھ کر اُسے مایوسی ہوئی۔ اُسے یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ اُسے مایوسی کیوں ہوئی تھی۔ نکاح کے بعد اُس کے دل میں ذرہ بھر بھی یہ خواہش نہیں تھی کہ اپنی منکوحہ کا چہرہ دیکھے۔ اور اُس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ ہاں نکاح کے دو دن بعد پہانے اُسے تصویریں دی تھیں کہ تمہارے نکاح کی ہیں۔ اشعر نے انہیں سرسری سا دیکھ کر ایک طرف ڈال دیا تھا۔ لیکن ابھی ایئر پورٹ پہ عمر انکل اور شاہ زیب کے ساتھ دریکتا کو نہ پا کر دل نے کچھ محسوس ضرور کیا تھا۔ اور وہ محسوسات کیا تھے اشعر انہیں کوئی زبان یا نام دینے سے قاصر تھا۔

☆☆☆

دریکتا ایک ایک کر کے تمام تصویریں دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اتنی بار دیکھی تھیں کہ ایک ایک تصویر اُسے ازبر ہو گئی تھی۔ اُس نے اشعر کی تصویر اٹھائی جہاں وہ نکاح نامے پہ سائن کر رہا تھا۔ اس میں اُس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے جیسے زندگی بھر مسکراہٹ سے نا آشنا رہے ہوں۔ اُس نے ایک اور تصویر اٹھا کر چہرے کے قریب کر کے دیکھی۔ اشعر کے کندھے اُوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا وہ بہت مغرور اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال نظر آ رہا تھا۔ دریکتا نے براہ راست تو اُسے ایک بار بھی اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ابھی دیکھ رہی تھی۔ پاپا اور شاہ زیب اُسی کو سی آف کرنے ایئر پورٹ گئے ہوئے تھے۔ اُن کی خیر موجودگی میں وہ بوری ہو رہی تھی۔ تصویریں نکال کے دیکھنے بیٹھ گئی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا اگر وہ کبھی اُس کے سامنے آکھڑا ہوا تو وہ شاید اسے اتنی غور سے نہ دیکھ سکے جس طرح ابھی تصویروں میں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی گہری گھور بادہمی آنکھوں کی چمک ایک ایک تصویر میں عیاں تھی۔ اُسے لگ رہا تھا وہ ان آنکھوں کی چمک کا کبھی بھی سامنا نہیں کر پائے گی۔ اتنی مغروری آنکھیں تھیں۔

☆☆☆

وہ خوشیوں سے سرشار تھا۔ پاپا نے شادی کے انتظامات بہت اعلیٰ پیمانے پہ کیے تھے۔ دریکتا نے ماثرہ کو فون کر کے ایک ایک تفصیل بتائی تھی۔ سب جاننے کے بعد وہ مغروری ہو گئی تھی۔ تنی گردن کچھ اور بھی تن گئی تھی۔ ایک اعلیٰ فائدان کا ڈیشنگ لڑکا اُس کی محبت میں جتلا ہو کر اپنے باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ راضی کیا تھا جلدی شادی پہ اور اب اس شادی پہ پانی کی طرح پیسہ بہا دیا تھا ماثرہ مغرور نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

کسی اور نے اُس جیسی شاندار قسمت نہیں پائی تھی۔ شاہ زیب کے مقابلے میں وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ بجز بھی وہ اُس کا دیوانہ تھا اُس کی آنکھ کے اشارے پہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ دوسری طرف بیٹا خالہ تھی بڑی حسرت اور ارمانوں سے اُس کا رشتہ مانگا تھا۔ اس کے پیچھے باسٹ کی دلی خواہش بھی کارفرما تھی۔ مگر شریں کے ارادے کچھ اور تھے۔ باسٹ کے ارمان مٹی میں مل گئے تھے۔ مگر دل سے ماثرہ کو پالینے کا جنون ختم نہیں ہو پارہا تھا۔ اُس کی شادی کی اطلاع اُن کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھی۔ بیٹا جانے کی تیاری کر رہی تھی آخر کوششیں اُس کی بڑی بہن تھی نہ جاتی تو لوگوں نے یہی کہنا تھا کہ ماثرہ کے نصیب سے جل گئی ہے۔ اُس نے دل پہ بھاری پتھر رکھ لیا تھا۔ پر باسٹ ایسا نہیں تھا اُس کے سینے میں پھانس لڑ گئی تھی کہ اُسے شاہ زیب کے مقابلے میں ٹھکرایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کی طرح دولت مند نہیں تھا نہ درشتے میں اُسے جائیداد ملی تھی لمبی چوڑی وہ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا پر شاہ زیب کے مقابلے میں اُس کی حیثیت معمولی سی تھی۔ ساتھ باسٹ خود ابھی بڑھ رہا تھا۔ شاہ زیب کے سامنے وہ شریں خالہ کو کیسے نہر آتا۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم پاکستان آ جاؤ۔“ ”ہاں ٹھیک ہے میں اب اکیلا نہیں رہ سکتا۔ نکاح ہو گیا ہے اب شادی کے لیے بھی تو سوچنا ہے نا۔“ اشعر انہیں شکایتی نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا پر منہ سے بولا نہیں۔

☆☆☆

دریکتا نے کام والا بھاری سوٹ تبدیل کیا اور ایک ایک کر کے ساری جیولری بھی اتاری۔ سب کچھ رہے تھے کہ وہ بہت خوبصورت لگ رہی ہے لیکن اُس نے خود کو ایک بار بھی آئینے میں نہیں دیکھا۔ اُس نے ماں کی کمی کو بہت بڑی طرح محسوس کیا تھا۔ وہ ماں جو اُسے جنم دے کر خود اُسے ابدی جدائی دے گئی تھی۔ اُس نے ساری جیولری رکھی اور کپڑے بھی تہہ کر کے الماری میں رکھے۔ شریں تائی کب کی سوچتی تھی۔ وہ بھی کرسیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی تو آج کے دن کے تمام واقعات آنکھوں کے آگے پھرنے لگے۔ آج سے وہ صرف اپنے پاپا کی بیٹی نہیں رہی تھی اشعر کی منکوحہ بھی بن گئی تھی۔ اب زندگی صرف اپنی نہیں رہی تھی کوئی اور بھی حق جتانے والا آ گیا تھا۔ اُس نے اشعر کی شکل و صورت اور سراپا یاد کرنے کی کوشش کی تو ذہن کی اسکرین پہ وہ لمبا چوڑا کسرتی جسم کا مالک مغرور آنکھوں والا نوجوان چہم سے اتر آیا۔ اُس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں تو وہ تصویر بھی چھٹکانے سے ٹوٹ گیا۔ وہ حواس کی دنیا میں واپس آئی۔ اور کروٹ بدل کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

اشعر نے تھکے تھکے انداز میں شوز کے تسمے کھولے پاؤں کو موزوں کی قید سے آزاد کیا۔ آج کا دن بڑا مصروف ہنگامہ خیزی لے کر آیا تھا۔ اُس نے شادر لے کر کپڑے تبدیل کیے۔ پاپا پاکستان میں ہی رکنے پہ اصرار کر رہے تھے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پارہا تھا گو گو والی کیفیت میں تھا۔ اب تو ایک ذمہ داری بھی سر پہ آ گئی تھی بیٹھے بٹھائے ہی ایک دم سے بات نکاح پہ ختم ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن لائف پارٹنر کے بارے میں اُس کے ذہن میں جو تصور تھا اُس کے مقابلے میں دریکتا اُسے کافی چھوٹی لگی تھی۔ دیکھنے میں بھی سولہ سترہ سال کی نظر آ رہی تھی اُسے شاہ زیب کی اتنی جلدی شادی پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اُس نے کالج کی شاید تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔ اور شادی کی ضد پہ اڑ گیا تھا۔ عمر انکل نے یہی بتایا تھا۔ اور اُس کی منکوحہ بھی کالج کی اسٹوڈنٹ تھی جانے کون سی خاندانی ردایات اور مجبوریاں تھیں جو عمر انکل اتنی جلدی یہ فیصلہ کرنے پہ مجبور ہوئے تھے۔ نکاح کی تقریب میں عمر زیب انکل کے دونوں بھائی بھی نہیں آئے تھے۔ انہیں پریشان دیکھ کر اشعر نے کافی تسلیاں دی تھیں۔ ایک بار پھر عمر زیب حسرتوں میں گھر گئے تھے۔ اُن کے اپنے سگے بیٹے کو اُن کی پریشانی کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اشعر شاہ زیب سے صرف چند سال ہی بڑا تھا مگر انہیں تسلی دلا سے دے رہا تھا جیسے اُن سے بھی بڑا ہو۔ اُس کے سمجھانے بچھانے پہ عمر نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔

دریکتا کی طرف سے انہیں پریشانی نہیں تھی مگر شاہ زیب کے معاملے میں اُن کے دل میں اندیشے دوسو سے اپنی جگہ تھے۔ اشعر کو کچھ چیزیں سوچنے پہ مجبور کر رہی تھیں۔ جس طرح پاپا بار بار عمر انکل کی پریشانیوں اور شاہ زیب کی نالائقیوں کا ردنا رو رہے تھے اُسے خطرے کی گھنٹی کی آواز بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ کہ مبادا پاپا جلدی رخصتی کا تقاضا نہ شروع کر دیں۔ اشعر برٹش پولیس ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔ پاپا کے بار بار اصرار پہ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُسے مستقل طور پہ پاکستان جلد آنا ہوگا۔

☆☆☆

نہیں جا رہی تھی۔ ویسے بھی اپنی شادی سے دو ماہ پہلے اُس نے بیوٹیشن کی ہدایات پہ عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اُس کی دو ماہ کی خود پہ کی گئی محنت کا پھل سب کے سامنے تھا۔ ہر نگاہ اُسی پہ نوکس تھی اُس کے حسن کو سرا رہی تھی۔ جب اسے شاہ زیب کے برابر لا کر بٹھایا گیا تو سب دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔

نوٹو سیشن ہو رہا تھا۔ دریکتا، عمر زیب، مائرہ اور شاہ زیب کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ مینا کی نظر اسٹیج پہ ہی نوکس تھی۔ شاہ زیب ہو بہو عمر کی جوانی کی تصویر لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت ایک دم بہت پیچھے چلا گیا ہو۔ مینا کو یوں لگ رہا تھا جیسے شاہ زیب کی جگہ عمر زیب ہو اور مائرہ کی جگہ آملہ ہو۔ مگر نہیں اسٹیج پہ شاہ زیب اپنی دلہن مائرہ کے ساتھ موجود تھا۔ قسمت نے ایک بار پھر اُنہیں شکست دے دی تھی۔ پہلے اُنہیں شکست ہوئی ٹھکرائے جانے کی اذیت جھیلنی پڑی۔ اب یہی اذیت اُن کے لاڈلے بیٹے باسط کے حصے میں آئی تھی۔ پہلے اس کا ذمہ دار عمر تھا اور اب اُسی عمر زیب کا بیٹا تھا جس نے اُن کے باسط کی ساری خوشیاں چھین کر اپنی جھولی میں بھر لی تھیں۔ کتنا خوش اور کتنا سکون لگ رہا تھا وہ کاش اس وقت مائرہ کے ساتھ زندہ حقیقت بنا باسط ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتی۔ مینا کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ "کاش باسط کا نصیب مائرہ ہی بنتی"۔ اُن کے دل نے یوں شدت سے انہونی کی خواہش کی تھی۔

شریں سے جب انہوں نے باسط کے رشتے کی بات کی تو اُس نے کہا کہ اورنگ زیب تم سے پہلے ہی عمر بھائی کو ہاں کر چکے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہیں بھی خالی ہاتھ نہ لوٹاتی مجبور ہوں اپنے مجازی خدا کے سامنے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ شاہ زیب اور اُس سے وابستہ دولت و جائیداد کو دیکھتے ہوئے اُن کی رال ٹپک پڑی تھی۔ خون کے رشتے اپنی جگہ مگر دولت و جائیداد روپے پیسے کی اپنی ایک الگ اہمیت تھی۔ شریں نے خون پہ اسی چیز کو اہمیت دی تھی۔ جس کی بدولت آج مائرہ شاہ زیب کے پہلو میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ شاہ زیب کے ساتھ اُس کے شاندار مستقبل کا آغاز ہو چکا تھا۔ عمر زیب کی دولت کا وہی تو وارث تھا۔ شادی کے بعد اُس نے تو مائرہ کا بے دام غلام بن کے رہنا تھا ابھی سے وہ اُس کی جنبش ابرو کے اشارے کا منتظر ہوتا تھا۔ بعد میں جو ہونا تھا وہ شریں جیسی ماں کے لیے باعث سکون تھا۔ اپنے انمول گڑ انہوں نے رخصتی سے قبل مائرہ کو اچھی طرح ازبر کر دئیے تھے۔ ویسے بھی وہ بہت ہوشیار تھی اور سمجھداری میں شریں سے کچھ بڑھ کر ہی تھی۔ جس طرح شریں نے ساری عمر اورنگ زیب جیسے خود سر اور اکٹھ شوہر کو اپنے اشاروں پہ چلایا تھا اسی طرح وہ مائرہ سے بھی یہی توقع کر رہی تھی۔ شاہ زیب تو پہلے سے ہی مائرہ کے ٹرانس میں تھا۔ اُسے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو اُس کی ایک مسکراہٹ اور ناز و انداز سے گھائل ہو جاتا تھا۔

رخصتی کے وقت مائرہ سب گھر والوں سے ملی۔ بیوٹیشن نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ تمہاری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں نکلنا چاہیے۔ اُس نے پوری ایمانداری سے اس پہ عمل کیا تھا۔ شریں، اورنگ زیب، مائرہ کے دیگر بہن بھائی یہاں تک کہ دریکتا کے بھی اس موقع پہ آنسو نکل آئے تھے۔ پر مائرہ کی آنکھیں خشک صحراؤں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ عمر زیب نے نوید بھائی سمیت اُسے پکڑ کر جی سنوری گاڑی میں لا کر بٹھایا۔ بارات کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ مگر یہ شاہ زیب کے سنہرے خوابوں کے آغاز کا سفر تھا۔ وہ آج کس قدر خوش تھا اُسے اپنی اس خوشی کے اظہار کے لیے لفظ نہیں مل رہے تھے۔ بات بات پہ اُس کے لب مسکرا رہے تھے اور مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ بالآخر اُس نے پاپا کی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود مائرہ کو پاپی لیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اب اُسے مائرہ کی

گھر والوں کو بغیر بتائے وہ ملک سے باہر جانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اُس کے ایک دوست نے ہی صلاح دی تھی کہ باہر جا کر قسمت آزمائی کرو یہاں کچھ نہیں رکھا ہے۔ وہ اپنی مثال دیتا کہ دیکھو دوڑھا کی سال میں میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔ باسط نے اُس سے مدد مانگی تھی وہ بخوشی راضی ہو گیا تھا۔ اُس کے ویزے و ٹکٹ اور سفر کے دیگر تمام انتظامات اُسی دوست ریحان نے ہی کرنے تھے۔ اُس نے باسط سے ایک پائی بھی طلب نہیں کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اُس کا احسان مند تھا کہ ریحان اُس سے کچھ بھی نہیں لے رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ اُس پہ احسان کر رہا تھا۔ باسط کے مالی حالات ایسے بھی دگرگوں نہیں تھے کہ باہر جانے کے اخراجات برداشت نہ کر سکتا بس ریحان نے ہی تمام ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور باسط نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اُس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا تھا جہاں دولت اور تمام تر آسائش اُس کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ مائرہ کو مایوں بٹھایا گیا تھا۔ مینا سوائے باسط کے تمام فیملی کے ساتھ مایوں سے ایک دن پہلے گاؤں پہنچی تھی۔ ادھر ہارون زیب اور نوید زیب نے عمر کا مکمل طور پہ باپ کاٹ کا اعلان کیا تھا اُن دونوں میں سے کوئی بھی عمر کے ہاں شاہ زیب کی شادی میں شریک نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں اورنگ زیب بھائی کی ساری خوشیوں میں شریک تھے۔ اُن کی کدورت عمر کی حد تک تھی۔ اورنگ زیب بھائی سے اُنہیں لگے نہیں تھا۔

☆☆☆

بہت دھوم دھام سے شاہ زیب کی طرف سے مائرہ کی مہندی آئی تھی۔ آج تو عمر زیب بھی بہت خوش اور سرور تھے۔ بات بات پہ مسکرا رہے تھے۔ تقریب میں موجود دونوں بھائیوں نے اُن سے بات نہیں کی تھی پر وہ اس کی کوئی گئی تھے کیونکہ آج بہت عرصے بعد انہوں نے شاہ زیب اور دریکتا کے چہرے خوشی سے منور دیکھے تھے۔ مکمل طور پہ جی بنی دریکتا میں آج اُنہیں آملہ کی مشابہت محسوس ہو رہی تھی۔ اور آج گاؤں مہندی لے کے آنے سے قبل شاہ زیب نے اُن کے گلے لگ کر اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگی تھی۔ عمر کا دل شانت تھا۔ اس کی جھلک اُن کے چہرے پہ بھی تھی۔ مائرہ کو مہندی لگانے کے لیے بڑھتی ہوئی مینا کے قدم وہیں ساکت ہو گئے تھے۔ عمر اور دریکتا مائرہ کے پاس ہی موجود تھے۔ پرانے زخموں سے کھرٹ اُترنے لگا تھا۔ کوئی اُس کے اندر پوری قوت سے چیخا تھا۔ اتنے برس بعد بھی اُسے ٹھکرائے جانے کی اذیت بھولی نہیں تھی۔ عمر کو دیکھ کر ایک ایک تلخی اور کڑواہٹ نوک زبان پہ رکھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے دوبار اچھے آکر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

شاہ زیب ڈولہا بن کے بہت اچھا لگ رہا تھا مردانہ وجاہت اُسے ورثے میں باپ کی طرف سے ملی تھی۔ اورنگ زیب تاپا کے گھریا رات کا استقبال پھولوں کی پتیوں سے ہوا۔ مائرہ کو شہر کے سب سے مہنگے بیوٹی پارلر کی بیوٹیشن حویلی میں خود تیار کرنے آئی تھی۔ اُس کی خدمات شاہ زیب نے بھاری معاوضے پہ حاصل کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مائرہ کے دل میں کوئی حسرت باقی رہے۔ جب وہ شہر میں اُن کے گھر تھی تو مستقبل کے خوابوں کی اپنی خواہشوں کی باتیں اُس سے کرتی تھی۔ اُسے بہت شوق تھا کہ اپنی شادی کے دن وہ سب سے بہترین پارلر سے تیار ہو۔ سو شاہ زیب نے اُس کی خواہش پوری کر دی تھی۔



مرے ہمسفر! تری نذر ہیں مری عمر بھر کی یہ دلتیں  
مرے شعر و میری صداقتیں، مری دھڑکتیں، مری چاہتیں  
تجھے جذب کر لوں لہو میں میں کہ فراق کا نہ رہے خطر  
تری دھڑکنوں میں اتار دوں میں یہ خواب خواب رفاقتیں  
یہ ردائے جاں تجھے سوئپ دوں کہ نہ دھوپ تجھ کو کڑی لگے  
تجھے دکھ نہ دیں مرے جیتے جی سر دشت غم کی تمازتیں!!  
مری صبح تیری صدا سے ہو مری شام تیری ضیا سے ہو  
یہی طرز پرستش دل رکھیں تری خوشبو کی سفارشیں  
کوئی ایسی نرم بہار ہو میں جہاں یقین دلا سکوں!!  
کہ ترا ہی نام ہے فصل گل، کہ تجھی سے ہی یہ کرامتیں  
ترا قرض ہیں مرے روز و شب مرے پاس اپنا تو کچھ نہیں  
مری روح مری متاع فن، مرے سانس، تیری امانتیں

شاہ زیب کی دھیمی خوابناک کی آواز ماڑہ کی سماعتوں میں قطرہ قطرہ بہار کی پہلی بارش کی طرح برس رہی تھی۔  
اُس کا بیڈروم تاحہ نظر گلاب کے پھولوں سے بھرا ہوا شام جاں تک کو معطر کر رہا تھا۔ ماڑہ کا استقبال اُس نے پھولوں سے  
کیا تھا۔ کالج کی نازک گڑیا کی طرح اُسے تھا ماٹھا۔ کتنی دیر اُس کے چہرے سے زرتار دوپٹہ ہٹا کے وہ اُسے ٹکٹکی بانہ سے  
دیکھتا رہا جیسے اپنی آنکھوں کو یقین دلانا چاہتا ہو کہ واقعی اُس کے سامنے ماڑہ ہی ہے۔ اُس کا خواب، اُس کی آرزو اُس کی  
پہلی خواہش، جلتے جلتے صحرا میں مانگی ہوئی دعا کی طرح واقعی وہ ماڑہ ہی تھی اُس کی ہم سفر اُس کی خلوتوں کی ہم نشین اُس کی  
قربتوں اور تنہائی کی ساتھی اُس کی محبت ماڑہ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس کی بن چکی تھی۔ وہ آنکھوں کے راستے اُس کا سراپا  
پور پور جذب کر رہا تھا دل میں اتار رہا تھا۔ خاصی دیر بعد اُسے رونمائی کا گفٹ دینے کا ہوش آیا۔ پلاٹینم کا بہت نازک اور  
اسٹائلش ساسیٹ تھا۔ ماڑہ نے ایک نظر دیکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ شاہ زیب اُسے دیکھ رہا تھا۔ ان نگاہوں کی زبان ماڑہ  
کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

شاہ زیب کی دائرگی، بے تابی اور بے قراری سب کچھ خود ہی بتا رہی تھی۔ اور جب ماڑہ نے اُس کے ہاتھ میں  
اپنا نازک سا ہاتھ دیا تو وہ مارے خوشی کے بے قابو سا ہو گیا۔ ماڑہ نے بالآخر اُسے پذیرائی بخش ہی دی تھی۔

☆☆☆

کھڑکی کے راستے سورج کی کرنیں کمرے میں جھانک رہی تھیں۔ شاہ زیب کی آنکھ خود بہ خود ہی کھلی تھی۔ نورا  
نظر دیوار گیر گھڑی پہ پڑی جو ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔ وہ نورا بیڈ سے نیچے اُتر آئی۔ دیمہ شام کو تھا پر ماڑہ نے تیار  
ہونے پارلر جانا تھا۔ وہ تیکے میں سر چھپائے بے خبر سو رہی تھی۔ رات کے حسین لمحوں کا سوچ کر شاہ زیب کے لبوں پہ  
مسکراہٹ آگئی اُس نے ذہیر بے سے ماڑہ کے چہرے پہ آئے بال پیچھے کئے "ماڑہ اٹھ جاؤ بہت نامم ہو گیا ہے۔" وہ جھک

کے باطل اس کے کان میں بولا۔ بین چار بار بی بی اس دہرائے۔ ماڑہ اٹھ بی بی۔ اب اتنا نام ہو گیا ہے۔ اُس کی لگاؤ  
پہلے گھڑی پہ ہی پڑی۔ پھر باقی کے کام اُس نے بڑی تیزی سے نمٹائے۔ الماری سے خود ہی کپڑے منتخب کر کے پہنے۔  
دریکتا انہیں جگانے اور تیار ہونے کا کہنے آئی تو ماڑہ جیولری پہنے ہلکا ہلکا میک آپ کر کے بالکل تیار بیٹھی تھی۔  
دریکتا محبت سے اُس کے گلے لگ گئی اور اُس کا ماتھا چوما "بھابھی آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں" اب اُس کے انداز میں  
پہلے سے بڑھ کر احترام شامل ہو گیا تھا۔ جو اب وہ مسکرا دی۔ وہ تینوں اکٹھے آگے پیچھے چلتے ہوئے ڈائننگ ہال میں پہنچے تو عمر  
اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ خود ماڑہ کو تھام کے اپنے برابر بٹھایا۔ "اپنے گھر میں زندگی کی نئی صبح مبارک ہو۔" انہوں  
نے بڑی محبت سے اُس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔ وہ بھاری دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ شاہ زیب نے بھی اپنی  
کرتی گھسیٹ کے اُس کے قریب کرنی۔ عمر زیب نے ایک ایک چیز اصرار سے ماڑہ کو کھلائی۔ ناشتے کے بعد دریکتا نے  
اُس کے ویسے کاسوٹ، سینڈل اور جیولری وغیرہ نکال کے رکھی۔ اُسے پارلر بھی جانا تھا۔

ماڑہ کے پارلر جانے سے پہلے ہی شریں، اور دیگر فیملی آگئی۔ وہ اُن کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔ دریکتا ماڑہ  
کے ساتھ پارلر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ وہ تیار ہو کر اُسے بتانے آئی تو ماڑہ اپنی چھوٹی بہن اور شریں تائی کے ساتھ  
گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ اُس کے سامنے ہی گاڑی گیٹ سے نکلی۔ وہ حیرت سے اُدھر ہی دیکھ رہی تھی۔ ماڑہ بھابھی کو اچھی  
طرح پتہ تھا کہ وہ اُن کے ساتھ جائے گی پھر وہ بغیر بتائے اس طرح چلی گئیں۔ پہلی بار اُسے دکھ سا ہوا کیونکہ پانے بھی  
کہا تھا کہ تم اپنی بھابھی کے ساتھ چلی جانا۔ خیر اُس کے پاس اس وقت اتنا نامم نہیں تھا کہ وہ سوچ کے پھر کڑھتی۔ شادی  
والا گھر تھا سو کام تھے اُسے سب کچھ دیکھنا تھا۔ گھر میں دو دھیال کی طرف سے صرف ابھی شریں تائی اور اُن کی فیملی ہی  
آئی تھی۔ باقی مہمانوں نے شام تک ہی آنا تھا۔ ہارون اور نوید چچا اور اُن کے گھر والے ناراض تھے سو اُسے اکیلے ہی کچھ  
کرنا تھا۔ شریں تائی اور ماڑہ کی بہن بھی پارلر جا چکی تھیں۔

گھر میں نوکرانیاں لگی ہوئی تھیں اور کل کا پھیلاوا اسمیٹ رہی تھیں۔ دریکتا بھی انہیں کام بتانے میں لگ گئی۔  
ماڑہ کل سے بھی بڑھ کر آج حسین لگ رہی تھی۔ اُس کے برابر بیٹھا شاہ زیب بار بار اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ دل چاہ  
رہا تھا کہ اُس کا نقش نقش ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دل میں اتار لے۔

ایسا ہی پاگل اور دیوانہ تھا وہ۔ پوری تقریب کے دوران وہ ایک بار بھی اُس کے پاس سے نہیں ہٹا۔ دوست  
احباب نلنے نلنے والے خود ہی آکر مبارکباد دیتے رہے۔ جنہیں وہ مسکرا مسکرا کر خوشی سے وصول کرتا رہا۔ شریں بڑی  
سرور تھی۔ انہیں اب یقین ہو گیا تھا کہ ماڑہ ساری زندگی اپنے شوہر کے دل دو ماہ پہ حکمرانی کرے گی۔ اُسے نازد انداز  
کے ایسے جال میں جکڑ کے رکھے گی کہ وہ کاٹھ کا اُلوہن کے ہر بات پہ ہاں ہاں ہی کرے گا۔

☆☆☆

"ماڑہ اٹھ بھی جاؤ ناں جان، کھانی نامم ہو گیا ہے۔ اب تو پچا بھی آفس کے لیے جا چکے ہوں گے۔" میں نے  
بات کرنی تھی اُن سے۔ "تم نے جگایا ہی نہیں مجھے۔" اُس نے جھک کے ماڑہ کے ساتھ خوبصورت سی شرارت کر دی۔ وہ  
زلفیں سنبھالتی ایک جھکے سے اٹھی اور اُس سے قدرے دور ہو گئی۔ اپنی خوشی میں وہ محسوس ہی نہ کر سکا کہ ماڑہ کے چہرے پہ  
بیزاری سی ہے۔ "کیسے جگاتی میں آپ کو؟ رزلٹ سوتی ہوں۔ سکون کی نیند کو ترس گی ہوں۔ آپ مجھے سونے ہی نہیں  
دیتے ہو۔" اب کی بار اُس نے غصہ نہیں چھپایا۔ پورا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام سے سویا کرو۔ وہ مزے سے بولا تو



مازہ پہن لے باہر روم میں پچی می دروازہ زور سے بند کیا جو اس کے واضح غصے کا اظہار تھا۔

مازہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب نے اُس کی صورت میں نئی دنیا دریافت کی تھی اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کسی قسم کی کنجوسی نہیں کرتا تھا۔ دل یہی کرتا تھا کہ مازہ ہر وقت اُس کے پاس رہے۔ وریکتا کالج اور عمر آفس چلے جاتے۔ وہ دونوں بہت لیٹ جاگتے ناشتہ کرتے۔ تھوڑا وقت گزرتے ہی شاہ زیب کی بے قراری مردج پہ پہنچ جاتی بس ایک بار پھر مازہ ہوتی اور شاہ زیب کی وارفتگیوں۔

☆☆☆

مازہ شاہ زیب کے ساتھ میکے آئی ہوئی تھی۔ دو دن وہ اُس کے ساتھ گاؤں میں ہی رہا۔ عمر زیب کی کال آئی تو واپس گیا۔ انہیں کوئی کام تھا ورنہ وہ مازہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ باسط کے باہر جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ وہ گاؤں شریں خالہ سے ملنے آیا ہوا تھا مازہ بھی ادھر ہی موجود تھی۔ وہ اُس کا سامنا کرنے سے کترار ہا تھا۔ پر ہونی ہو کے رہی۔ وہ اس وقت اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈیزائنر کے ڈائزین کردہ مینے سوٹ میں ملبوس جیولری سے آراستہ ہلکا ہلکا میک آپ کیے وہ روز اول کی طرح ہی اُسے اپنی رسائی سے بہت دور لگ رہی تھی۔ باسط کو کسی بہت زیاں کا شدید احساس ہوا تھا۔ وہ اُس سے تفصیلات پوچھ رہی تھی کس طرح جا رہے ہو۔ وہاں کون سی جا بلی ہے تمہاری تعلیم کا کیا ہوگا۔ باسط ہوں ہاں کرتا رہا۔

”باسط تم ٹھیک طرح بات کیوں نہیں کر رہے؟“ ”کیوں کیا ہوا ہے۔ اور کیسے بات کروں۔“ اُلٹا اُس نے مازہ سے سوال کر دیا۔ ”تم کھوئے کھوئے سے ہو جیسے تمہارا ذہن کہیں اور ہو۔“

”جو شخص اپنی محبت کو کھودے وہ کھویا کھویا سا نہ ہو تو کیا ہو۔“ باسط کا لہجہ بہت کاٹ دار تھا، تمہارا شو بہت خوش قسمت ہے۔ لیکن مجھے بتاؤ مجھ میں کیا کی تھی۔ جو شریں خالہ نے شاہ زیب کو فوقیت دی۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق ہے۔ پڑھ لکھ کے اپنا مستقبل بنا سکتا ہوں۔ صحت مند ہوں۔ اچھی شکل و صورت ہے۔ میں مانتا ہوں تم سے تھوڑا ہی بڑا ہوں مگر میری صحت اور قد کاٹھ کو دیکھو تمہارے شوہر سے بھی بڑا اور میچور نظر آتا ہوں۔ اصل عمرو ہی ہوتی ہے جو نظر آتی ہے۔ میری عمر تم سے زیادہ ہے اور ہاں تمہیں سنبھال سکتا تھا میں ذہنی جذباتی ہر طرح سے۔ آخر میں باسط کا لہجہ بہت عجیب سا ہو گیا تھا۔ مازہ اُس کی بات کی تہہ میں چھپے مفہوم تک پہنچ گئی تھی اور اُس کے چہرے پہ سرنخی آ گئی تھی۔ باسط ایک مکمل مرد نظر آ رہا تھا اور اُس کی سوچ بھی مردوں والی تھی۔ ایک شاہ زیب تھا جسے موج مستی اور ہلے گلے سے ہی فرصت نہیں تھی رومانس کے سوا اُسے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ بیٹھے بٹھائے سب مل رہا تھا اُسے ہاتھ پیر بلانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

باسط کی نگاہوں میں کیسی حسرت اور پیاس تھی۔ جانے کیوں مازہ کو وہ حسرت اور پیاس سے بھری نظر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کہیں اندر تک پہنچے گا ڈر ہی تھی۔ شریں خالہ نے باسط کو بصد اصرار رات اپنے پاس ہی ٹھہرا لیا۔

سونے سے پہلے مازہ اُس کے پاس پوچھنے آئی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے وہ چیخ کر کے لیٹا ہوا تھا۔ ایک ہلکی سی بنیان اور ٹراؤ زرشب خوابی کے لباس کے نام پہ اُس کے جسم پہ موجود تھا۔ مازہ کو دیکھ کے وہ اٹھ بیٹھا۔ ”ابھی تک سوئے نہیں ہو۔“ وہ بھی اُس کے سامنے ٹک گئی۔ ”کسی کے خواب سونے دیں تو تب ناں۔“ وہ برجستہ بولا تو مازہ خاموش ہو گئی۔ کافی دیر اُس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ ”اچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اگر ہے تو بتاؤ۔“ ”واقعی مجھے جس کی ضرورت ہے وہ دے سکتی ہو۔“ وہ جانچتی نگاہوں سے اُس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کو دیکھ رہا تھا۔ کافی دیر خاموشی طاری رہی اُسے باسط نے ہی توڑا۔

مجھے پتہ ہے بہت نامراد ٹھے ہے جنوں

اُسے کہو کہ مجھے بہت جنوں ہے اس کا /

باسط کا لہجہ اُسے دکھتا محسوس ہوا۔ یوں لگ رہا تھا۔ یہ آج اُس کے دامن کو جلا دے گی۔ وہ کن راستوں پہ چل رہا تھا۔ جانے یہ راستہ فنا کا تھا کہ بقا کا۔

☆☆☆

رات کے پُر سحر سنانے میں وہ پوری طرح مازہ کی طرف متوجہ تھا۔ پر اُس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ مازہ کی ہنسیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا جب اُس نے اپنی کانائی پیچھے کی۔

”شاہ زیب آپ بچا کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیں وہ اب بوڑھے ہو رہے ہیں آپ کا بھی فرض بنتا ہے کہ اُن کے ساتھ بوجھ بانٹیں۔ شادی شدہ ہیں آپ۔ کب تک اخراجات کے لیے اُن سے مانگتے رہیں گے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا جب وہ ہر ماہ آپ کو چیک دیتے ہیں کہ کیش کراؤ۔ کاروبار اور ہر چیز میں آپ بھی حصہ دار ہیں حق بنتا ہے آپ کا ہر چیز پہ۔ اور آپ ہیں کہ بھیک منگوں کی طرح ہر چیز اُن سے مانگتے ہیں۔“ مازہ جانے کیا باور کروانا چاہ رہی تھی پر اُس کا آخری جملہ سن کر شاہ زیب کو غصہ آ گیا۔ ”میں بھیک منگا نہیں عمر زیب کا بیٹا ہوں۔“ آپ بھیک منگے ہیں اگر مالک ہوتے تو اُن کے محتاج نہ ہوتے۔ عمر چچا پوری جائیداد کاروبار اور بینک بیننس کے مالک ہیں۔ انہوں نے ہر چیز کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے۔ آپ کے پاس کیا ہے مجھے بتا سکتے ہیں؟ وہ طنزیہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ شاہ زیب کھردرومانوی موڈ غارت ہو چکا تھا۔ ”میں مالک ہوں ہر چیز کا۔“ ”کیسے؟“ ”جو باوہ بے بسی سے اُسے دیکھ کر رہ گیا۔“ ہاں بولیں ناں آپ کہ کس طرح مالک ہیں آپ۔“ مازہ کی نگاہیں اُسے برے کی طرح چھید رہی تھیں۔ ”بس میں مالک کا بیٹا ہوں پاپا کا۔“ ”جھجھلا سا گیا وہ۔ مازہ ہنسنے لگی۔ کاٹ دار ہنسی۔ ”آپ بیٹے ہیں مالک نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے بچانے آپ کو ہر قسم کی سہولت دی ہے شادی پہ جی بھر کے فضول خرچی کی ہے پر مالک چچا ہیں سب جائیداد کے کیونکہ وہ با اختیار ہیں آپ کو دیتے ہیں آپ سے لیتے نہیں ہیں۔“ ”میں پھر بلا کیا کروں مازہ۔“ وہ مدد طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مازہ کے لبوں پہ پرسرار مسکراہٹ آ گئی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اُس نے عقل مندی کی بات کی تھی۔ ”آپ اس طرح کریں کہ صبح سے آفس جانا شروع کر دیں۔ چچا کو دیکھیں، سمجھیں کہ وہ کس طرح کام کرتے ہیں۔ جب آپ نے آفس ہو کر اور اسٹاف کے مزاج کو جان لیا تو باقی پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ آپ سو جائیں کیونکہ آفس بھی جانا ہے۔“ سچ سچ شاہ زیب بڑی سعادت مندی سے تکیہ سیدھا کر کے سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔

مازہ نے اُس کے سونے کے بعد اُس کی طرف سے کر ڈٹ بدل لی۔ شریں نے ہی کہا تھا کہ شاہ زیب کو آفس چھوڑنے کے لیے کہو۔ انہوں نے اُسے آنے والے وقت سے ڈرایا۔ سب کچھ عمر کے ہاتھ میں ہے۔ شاہ زیب کو بھی با اختیار ہونا چاہیے۔ ایسا ممکن تھا اگر وہ آفس جانا شروع کر دیتا کام کو سمجھتا۔ پھر باقی کے مراحل بھی آسان ہو جاتے تھے۔

مازہ بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن خیالوں کی رو بہک کر باسط کی طرف چلی گی۔ وہ پاکستان سے جا چکا تھا پر اُس کے خیالوں سے نہیں جا پار ہا تھا۔ اُسے باسط سے آخری ملاقات اور وہ پیاس بھری نگاہ، ایک بھیدتی طلب اچھی طرح یاد تھی کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ کیسا چھچھا جانے والا اور اپنی منوانے والا شخص تھا وہ۔ اور ایک یہ شاہ زیب۔ اُس نے اپنے پہلو میں بے ہدھ سوئے ہوئے شاہ زیب کو دیکھا۔ اُس کی اُننگلی پکڑ کے چلنے والوں میں سے تھا۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

کوئی آنا۔ کوئی خود داری۔ کوئی عزت محسوس ہی نہیں تھی جس میں۔ بس بیوی کی جوتیاں سیدھی کرنے میں سکون ملتا تھا اُسے۔  
شاہ زیب کا بس چلتا تو ساری عمر بارہ کے گھنٹے سے لگ کے بیٹھا رہتا۔ "ہونہہ"۔ ماڑہ نے سر جھٹکتے ہوئے اُس کی طرف سے نظر گھمائی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

طاہر لغاری کی طبیعت معمولی سی بگڑی تھی ہلکا سا سینے میں درد اٹھا انہوں نے نظر انداز کر دیا آئندہ آنے والے دنوں میں اُن کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی۔ ہنگامی حالت میں ہاسپٹل لے جایا گیا اُن کو ڈاکٹرز نے ہارٹ ایک بیماریاں اشعر لغاری تک فوراً یہ اطلاع پہنچی تھی۔ اُس نے اسی میں عافیت تصور کی کہ پپا کے پاس لوٹ آئے۔

ہفتہ دس دن میں طاہر لغاری صحت یاب ہو کر گھر آگے۔ اُن کے ڈسچارج ہونے کے کچھ دن بعد اشعر لغاری پاکستان پہنچ گیا۔ جب اُس نے یہ بتایا کہ وہ پکا پکا اُن کے پاس آ گیا ہے تو انہوں نے نئی توانائی رگ و پنے میں دوڑنے محسوس کی۔ یوں لگتا تھا وہ کبھی بیمار ہوئے ہی نہیں تھے۔ اشعر نے واپس آ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کا آغاز کر دیا تھا۔  
کرنا لو جی کی اعلیٰ ڈگری اور اس فیلڈ میں کچھ تجربہ بھی اُس کے پاس موجود تھا۔ سو "اسپیشل کرائم برانچ" میں جا ب ملے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ جو اُن کر چکا تھا۔ طاہر لغاری نے کہا کہ کسی دن ٹائم ملے تو عمر انکل سے مل کر اُس نے غائب دماغی سے سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب نے عمر کے ساتھ آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ اُنہیں بہت اچھا لگا تھا کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے آزاد ہو رہا تھا وہ اُسے پاس بٹھا کے کاروباری اسرار و رموز کی بابت بتاتے۔ اسی طرح کرتے کرتے اُس نے پہلا ماہ بھلا آرام سے گزار لیا تھا۔ آفس آتو جاتا پرتھوڑی تھوڑی دیر بعد ماڑہ کو فون کرتا کیا کر رہی ہو۔ کیا سوچ رہی ہو۔ کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ مجھے مس کیا کہ نہیں۔ اور اپنا خیال رکھنا میں شام کو جلدی آؤں گا پھر باہر چلیں گے۔ اُس کی گفتگو روزانہ اسی قسم کی ہوتی۔ گھر واپسی پہ تو وہ جیسے پھر ماڑہ کا سایہ ہی بن جاتا۔ اُسے ایک پل کے لیے بھی دور نہ ہونے دیتا وہ روٹھی نخرے کرتا اور وہ ہاتھ جوڑ کے مناتا۔

☆☆☆

باسط اپنی منزل پہ پہنچ چکا تھا۔ اُس کے دوست نے روانگی سے قبل ایک بند پیکٹ میں کچھ سامان اُس کے پاس کیا تھا کہ یہ ایئر پورٹ اترتے ہی تم نے ایک شخص کے حوالے کرنا ہے۔ اُس شخص کا حلیہ عمر، نام وغیرہ اور اس طرح کی دیگر معلومات اُسے مل گئی تھیں۔ وہ شخص اُسے ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی مل گیا تھا۔ وہی شخص باسط کو اُس کی رہائش گاہ تک اپنی گاڑی میں بٹھا کے لایا تھا۔ وہاں باسط جیسے تین اور نو جوان بھی تھے۔ باسط کو اب اُن کے ساتھ ہی رہنا تھا۔

ایئر پورٹ پہ جو شخص باسط کو ملا تھا اُس کا نام اسد گردیزی تھا۔ اُسے رہائش گاہ تک پہنچا کے جانے سے قبل اُس نے پھولا ہوا ایک خاکی لفافہ باسط کے سپرد کیا "پھر جب کام ہوگا تمہارے پاس آؤں گا۔ فی الحال لائف انجوائے کرو۔ اُس نے باسط کے کندھے پہ دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ باسط کی نگاہ پھولے ہوئے خاکی لفافے پہ تھی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا جانے اس خالی لفافے میں کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں لکھا سوال اسد گردیزی نے بھی پڑھ لیا۔ "یہ تمہاری خدمت کا معاوضہ ہے جو تم نے ہمارے لیے سرانجام دی ہے۔" مگر میں نے تو کوئی کام نہیں کیا۔" وہ اُلجھن بھرے انداز میں

میں اُسے اسب بھی دیکھ رہا تھا۔ "کام تو تم نے کیا ہے اور اتنی خوبی سے کیا ہے کہ میں بھی داد دینے پہ مجبور ہو گیا ہوں۔ جو پیکٹ تم نے مجھے دیا ہے وہی تو تمہاری خدمت ہے اور جو ہمیں نے اس کے عوض تمہیں دیا وہ تمہارا حق۔ اب چلتا ہوں پریشان مت ہو۔ باقی باتیں تمہیں تمہارے ساتھ رہائش پذیر لڑکے بتادیں گے۔ پھر بھی کوئی مشکل یا پریشانی ہو تو مجھے کال کر لینا یہ میرا نمبر ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" حیران پریشان کھڑے باسط کے ہاتھ پہ اسد نے ایک کارڈ رکھا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ باسط نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ غور سے دیکھا۔ اس میں اسد کا نام اور دو سیل نمبر درج تھے۔ اُس نے کارڈ اپنی پینٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔ اُسے خاکی لفافے کو دیکھنے کی جلدی تھی۔ مگر کمرے میں موجود تینوں لڑکے اُس کے تعارف کے منتظر تھے۔ وہ بادل نحواست اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اُس نے شکر کیا جب وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے اٹھے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اُس کی تو آنکھیں ایسے خیرہ ہوئیں جیسے چالیس چوروں کا خزانہ دیکھ لیا ہو۔ اُس نے ایک ایک کمرے کے تمام نوٹ گنے۔ از سر نو اُس نے یہی عمل پھر دہرایا۔ یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ اُس نے پاکستانی روپوں میں لفافے میں موجود الرز کا حساب لگایا۔ خوشی سے چہرہ چمک اٹھا۔

اُس کے خوابوں کے پہلے پڑاؤ میں ہی اُسے ناقابل یقین آسانی ملی تھی۔ اس طرح تو محض چند ماہ میں ہی اُس نے خوشحال ہو جانا تھا۔ دنیا کی ہر آسائش اُس کے قدموں تلے ہونی تھی۔

☆☆☆

باسط نے اے ٹی ایم کے ذریعے پیسے بھیجے تھے۔ پینا کے ہاتھ میں جب پیسے آئے تو اُس نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے مجازی خدا حمزہ احمد کی طرف دیکھا۔ "اپنے باسط نے بھیجے ہیں پورے ایک لاکھ بیس ہزار ہیں گن لو۔ رات اُس کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا۔ اگلی بار اس سے بھی زیادہ بھجواؤں گا۔" کیا اتنے زیادہ پیسے۔ پینا کے ہاتھ لرزنے لگے۔ "ہاں اُسے اچھی نوکری مل گئی ہے۔ ہمارے تو نصیب کھل گئے ہیں۔ ہمارا بیٹا ہے تو چھوٹی عمر کا پر بہت عقل مند ہے۔ دیکھ لو ایسی نوکری قسمت والوں کو ملتی ہے جس کی اتنی تنخواہ ہو۔ ہمارے حالات اللہ کے فضل و کرم سے پہلے بھی بہت اچھے ہیں۔ اب باسط کی کمائی کی وجہ سے اور بھی اچھے ہو جائیں گے۔ ذرا پیسے ہاتھ میں آنے دو یہ کرو لا فروخت کر کے میں کوئی زبرد میٹر گاڑی لوں گا۔ اور اچھا سا بنگلہ بناؤں گا اپنے باسط کے لیے۔ اس بار اُس نے سا لگرہ بھی ہمارے بغیر منائی ہوگی وطن سے دور۔" حمزہ احمد بولتے بولتے افسردہ ہو گئے۔ پینا کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ "میرا بیٹا چھوٹی عمر سے ہی روزگار اور نوکری کے چکر میں پڑ گیا ہے اُس کی عمر کے باقی لڑکے بے فکری سے گھومتے پھرتے ہیں۔ ایک میرا باسط ہے پردیس کی خاک چھان رہا ہے۔" پینا کے آنسو نکل آئے۔ ان آنسوؤں میں ممتا اور پیار تھا باسط کی جدائی کا غم شامل تھا۔ "ارے نیک بخت کیوں روتی ہو۔ شکر کرو کہ پینا کا ڈپوٹ ہو گیا ہے۔ ہمارا بھی خاندان میں نام ہوگا عزت ہوگی۔ جس کے پاس ڈیڑھ روٹ رہا ہے۔ اُس کی ڈھیروں عزت ہوتی ہے۔ تم ان باتوں کو کیوں نہیں دیکھتی ہو۔" حمزہ احمد نے کچھ باور کر دیا تو اُس نے آنسوؤں کی نمی دوپٹے میں ہی جذب کر لی۔

☆☆☆

"جان" ماڑہ کا لہجہ مخصوص لگاوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہ زیب ہزار جان سے نڈرا ہو گیا اور بڑے پیار سے اُسے تنکے لگا۔ "کیا بات ہے سوئیٹ ہارٹ۔" میں کچھ سوچ رہی تھی۔ "کیا؟" "میں آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ کتنی محنت کر رہے ہیں میرے لیے۔" ماڑہ نے اپنا سر اُس کے سینے پہ رکھ دیا۔ اُس کی انگلیاں شاہ زیب کے سر کے بالوں



میں سرسرا رہی ہیں۔ وہ اُس کے پیار کے نشے میں سرشار ہو رہا تھا۔ سکون وطمینانیت انگ انگ میں دوڑ رہی تھی۔ اپنی محبوب بیوی کی ذرا سی توجہ، محبت اور خیال اُسے نہال کر دیتا تھا۔ ”لو میں کون سی ایسی خاص محنت کر رہا ہوں تمہارے لیے۔“ محنت ہی تو کر رہے ہیں۔ آپ نے آرام و آسائش میں زندگی گزاری ہے اور میں نے آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے آپ نے اُس جانا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ آپ کے مزاج میں نہیں تھا۔“ ماثرہ کا لہجہ محبت میں شرابور تھا۔ ”تو اچھا ہونا مجھے بھی زندگی کی مشکلات کا احساس ہوا ہے اور تم میری ذمہ داری ہو۔ سوئیٹ ہارٹ تمہارے لیے تو میں کچھ بھی کر سکتا ہوں یہ تو عام سا کام ہے۔“

”شاہ زیب میں آپ کو تارے توڑ کے لانے کے لیے نہیں کہوں گی مگر آپ فیوچر کی فکر بھی کریں ساری زندگی ہم نے دو تو نہیں رہنا ہمارے بچے بھی ہوں گے اُن کی سوزوریا ت ہوں گی۔“ اب وہ محبوبہ کی جگہ ناصح لگ رہی تھی۔ ”جب بچے ہوئے تو دیکھا جائے گا اُن کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں گی۔ تم فکر مت کرو۔“ اُس نے پیار سے ماثرہ کے ماتھے پر آئے بال پیچھے کیے۔ جس کی پُرسوج نگاہیں شاہ زیب کی طرف ہی مرکوز تھیں۔

شاہ زیب میں اپنے ہونے والے بچوں کو دنیا کی ہر سہولت و آسائش دینا چاہتی ہوں..... وہ بولتے رُک گئی اور ذرا دیر بعد پھر گویا ہوئی۔ ”ان کے آرام و آسائش کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس بھی کچھ ہو میرا مطلب ہے کوئی پراپرٹی بینک بیلنس تاکہ ہم اپنی مرضی سے سب کچھ استعمال کر سکیں تاکہ کسی اور سے مانگیں۔“ ”سب کچھ میرا ہی تو ہے اور جو چیز میری ہے وہ ظاہر ہے میرے بچوں کی بھی ہے۔“ شاہ زیب نے اُس کی بات درمیان سے کاٹ دی مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی۔ ”شاہ زیب آپ جائیداد میں سے اپنا حصہ طلب کریں۔“ اُس نے بہت نارمل انداز میں یہ بات کہی تھی جیسے اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔ مگر شاہ زیب اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ وہ لپٹے سے اُنھ کے پیچھے گیا۔ ”ایک دن سب میرا ہی ہوگا۔“ اُس نے کمزور سے لہجے میں ہلکا سا سنبھالا لینے کی کوشش کی تھی۔

”اب آپ شادی شدہ ہیں۔ عمر چچا کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کی ایک بیوی ہے ایک لائف ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میرا شوہر مالک و اختیار ہو اس جائیداد کا۔ آپ اپنا حصہ مانگیں اور جب مل جائے تو الگ سے اپنا کاروبار شروع کریں کیونکہ ابو کہتے ہیں کہ عمر بچا وقت کے ساتھ بالکل بھی نہیں بدلے وہ ابھی تک فرسودہ طریقے سے کاروبار کر رہے ہیں لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں پر اُن کا انداز نہیں بدلا ہے۔ آپ جوان ہیں آپ کے پاس نئی سوچ اور نئے آئیڈیاز ہیں۔ دیکھیے گا آپ جب اپنا بزنس شروع کریں گے تو کیسے کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ میرے سب خواب ایک ایک کر کے حقیقت بن جائیں گے۔“ بس آپ ذرا اہمیت کریں۔

وہ اُسے جوش دلا رہی تھی، خوابوں کی وادی کی سیر پہ مجبور کر رہی تھی۔ سچ شاہ زیب کو اپنے آپ میں تازگی و سرسستی محسوس ہونے لگی۔ اُس کے الفاظ کی اُننگی پکڑے پکڑے وہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا تھا۔ اپنا بزنس، اپنا آفس، اپنا اسٹاف، اپنی مرضی اپنا حکم، ہر چیز پہ اپنا اختیار، اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا گولڈن چانس۔ کتنا خوبصورت ہوتا سب کچھ۔ اپنی مرضی اور اپنے اختیار کا نشہ ہی کتنا سروفا گیس تھا۔ جو بات وہ پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا اب بڑے آرام سے پلان کر رہا تھا۔ در پردہ ماثرہ کا بڑھلا اور مدد بھی شامل تھی۔ اُس نے پپا سے بات کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔

ماثرہ نے اُس کے دماغ میں ڈال دیا تھا کہ سب کچھ تمہارا ہے جو چیز تمہاری ہے اُس کا مطالبہ کرنے میں کوئی

شرم کی بات نہیں ہے۔ اب تو اُس کے ذہن نے کچھ عجیب عجیب سی باتیں بھی سوچنا شروع کر دی تھیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ تک نہ تھا۔

☆☆☆

ماثرہ نے سونے ہوئے شاہ زیب کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔ درحقیقت وہ دل میں بہت مسرور تھی۔ جو بات وہ شاہ زیب کے دماغ میں ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ اُس نے ڈال لی تھی۔ اب اُس نے اپنا کام بخوبی کر لیتا تھا۔ بس وقت اور سامنے آنے والے نتائج کا انتظار کرنا تھا۔ اور یہ انتظار زیادہ طویل نہیں تھا۔ شاہ زیب تو اُس کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھا۔ وہ جب چاہتی ڈور ہلاتی اور وہ اشارے پہ حرکت شروع کر دیتا۔ یہ خوشی ہی کتنی بڑی تھی کہ اُس کا شوہر اُس کی ہر بات مانتا تھا اُس کی جی حضوری اور خوشنودی ہی اس کے لیے اہم تھی۔ پر جانے کیوں پھر بھی وہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی تھی۔ یوں جیسے وہ اُس کا شوہر نہیں بلکہ غلام ہے۔ بے دام کا غلام۔ اُسے شاہ زیب کی شخصیت میں عجیب سے خلا کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے خود اُس کی اپنی کوئی بھی انفرادی شخصیت و کردار یا مرضی نہ ہو۔ ماثرہ جو کہتی وہ وہی کرتا۔ اُس کی کہی بات سے وہ انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ کتنی غلط باتیں بعض اوقات اُسے ماننے پہ مجبور کرتی اور وہ بلا جوں و چراں مان لیتا ایسے جیسے یہ اُس کا فرض ہو۔ وہ اگر کسی بھی فضول اور بے معنی بات پہ ناراض ہو جاتی تو وہ متنیں کر کے اُسے مناتا۔ ہاتھ تک جوڑ دیتا بچوں کی طرح کان پکڑتا۔ یہ سب دیکھ کر ماثرہ کو اور بھی آگ لگتی۔ تن من جھلنے لگتا۔ دور دور تک بچھتاؤں کی خاک اُڑتی اور اس گرد و غبار میں سے رفتہ رفتہ ایک چہرہ نمایاں ہو کے سامنے آتا۔ یہ چہرہ یہ نقش اس کے جانے پہچانے تھے۔ یہ چہرہ یہ نقش باسط کے تھے۔ جس کے چہرے کے تاثرات میں ایک ایک نقش میں مردانگی دکھائی تھی۔ اپنی منوالینے کا عزم تھا جنون تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ میچورڈ اور باشعور تھا۔ اُس کی شخصیت میں ایک مکمل و پور مرد کی شکل نظر آتی تھی۔ ماثرہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے بارے میں سوچتی، اُس کی باتوں کو یاد کرتی۔ اُس کی نگاہوں میں بھری پیاس من آنگن سے چپکے چپکے کوئی سرگوشی کرتی۔ کچھ اسرار تو تھا باسط میں جو وہ اُس کے بارے میں سوچتی تھی۔

شاہ زیب اُس کا شوہر وہ روٹھ جاتی تو سوسو طریقے سے مناتا چاہے اُس کی کوئی غلطی نہ ہوتی پھر بھی اُسے مناتا اور جب تک وہ بول نہ پڑتی وہ پاس سے نہ اُٹھتا۔

شاہ زیب کبھی کبھی اُسے خوفزدہ بننے کی مانند لگتا جو بھرے میلے میں اپنوں سے بچھڑ گیا ہو۔ اور اب تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اس تلاش میں ہر نظر آنے والے چہرے میں سہارا اور تحفظ ڈھونڈ رہا ہو۔ پناہ مانگ رہا ہو۔ شاہ زیب کی شخصیت کے اس پُر اسرار رخ پہ ماثرہ کو کبھی کبھی بہت حیرت ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید آئینہ جچی کی وفات ہو۔ کیونکہ اُس نے بڑوں سے سنا تھا کہ شاہ زیب چھوٹا تھا جب آئینہ جچی فوت ہوئیں۔ اس محرومی اور اُس خلا کو وہ شاید ابھی تک پر نہیں کر پایا تھا۔ حالانکہ ماثرہ نے یہ بھی سنا تھا کہ عمر چچا کی دوسری بیوی بھی بہت اچھی تھی۔ خیر اس نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی اُسے غصہ آتا۔ اور اس غصے کا مرکز شاہ زیب کی ذات ہوتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُسے فی الحال کوئی لڑائی جھگڑا کرے۔ کیونکہ اُس نے خود ہی شاہ زیب کو مطلوبہ نتائج کے لیے طاقت اور ہمت فراہم کی تھی۔ اگر وہ لڑائی کرتی غصہ کرتی تو اُس نے منہ لٹکا کے بیٹھ جانا تھا۔ کم سے کم وہ انورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے نظر انداز کرنا اچھا تھا۔

☆☆☆

سب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ شاہ زیب نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ خود برائے نام کھانا کھا رہا تھا۔ اُس نے پہا سے بات کرنی تھی۔ اُس میں تو بات کرنا مناسب تھا۔ اُس نے یہی سوچا تھا کہ گھر میں آرام سے پہا سے بات ہوگی۔ وہ گھر آتے کھانا کھاتے تھوڑی دیر مطالعہ کرتے اور پھر سونے کے لیے چلے جاتے۔ اتنا وقت ہوتا ہی نہیں تھا ان کے پاس۔ سوشاہ زیب سے صبر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جلد از جلد کھانا ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ تاکہ بات کر سکے۔ عمر نے جونہی پانی کا گلاس لبوں سے ہٹا کر رکھا شاہ زیب نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور اُن کی طرف دیکھا۔ ”پہا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ چونک سے گئے۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات یاد آگئی جب وہ اسی طرح اسی ٹون میں اُن کے پاس آیا تھا۔ کہ پہا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ اُن کی چھٹی حس نے اُنہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ شاہ زیب کا لہجہ، انداز اور چہرے پہ بکھرا اضطراب کسی خاص بات کی گواہی دے رہا تھا۔ عمر زیب نے اپنے تاثرات کمال مہارت سے چھپالیے اور بظاہر بڑے بشاش و شاش لہجے میں بولے۔

”کیا بات ہے جو اس طرح ڈر ڈر کے بول رہے ہو۔“ انہوں نے شاید اس کے دل کا چور پکڑ لیا تھا۔ ماڑہ تو اسی وقت برتن اٹھانے کے بہانے منظر سے ہٹ گئی اب وہاں صرف درمیکتا تھی شاہ زیب اور عمر زیب کے علاوہ۔ اُسے بھی کسی گڑبگڑ کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ شاہ زیب کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ رہا تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے وہیں بیٹھ گیا۔

”پہا بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنا کاروبار کرنا چاہتا ہوں الگ سے۔“ بالآخر اُس نے دل کی بات گوش گزار کر دی۔ عمر زیب کے چہرے پہ معنی خیزی مسکراہٹ آگئی۔ جسے شاہ زیب کوئی معنی پہنانے سے قاصد تھا۔ ”الگ کاروبار کرنے کے لیے تجربہ اور مہارت درکار ہوتی ہے وہ تمہارے پاس ہے۔“ ”پہا تجربہ اور مہارت بھی وقت کے ساتھ آجاتی ہے۔ آپ کا بیٹا ہوں اس لیے تو آفس جاتا ہوں کہ آپ کے کام کرنے کے طریقہ کار سے واقف ہو جاؤں۔“ وہ ماڑہ کے یاد کرائے گئے سبق کو بخوبی دہرا رہا تھا۔ ”مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ الگ سے کاروبار کر سکو۔ ابھی تمہیں سمجھنے کی سیکھنے کی کافی سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ نام لگے گا۔ اُس کے بعد میں نے مناسب تصور کیا تو تم بے شک اپنا بزنس کا سیٹ اپ بنا لینا۔ مگر ابھی نہیں۔“ عمر زیب نے بڑے سکون سے اپنی بات مکمل کی تھی۔ پر شاہ زیب کا فطری غصہ عود آیا۔ ”پہا میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ شادی شدہ ہوں، خود مختار ہوں، مجھے میرا حق ملنا چاہیے۔ اتنی بڑی دولت و جائیداد کا وارث ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے اس قابل ہی تصور نہیں کرتے۔ کل کو میرے بچے ہوں گے اُنہیں میں دنیا کی ہر سہولت و آرام دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے پلیز پہا مجھے میرا حق دے دیں جو بھی بنتا ہے۔“ شاہ زیب نے اپنی بات کر دی تھی۔ عمر کلک کر دیکھ رہے تھے۔ وہ تو اور ہی سوچ رہے تھے۔ اور شاہ زیب نے کتنے ناقابل یقین جملے ابھی بولے تھے۔ اُن کی سماعتوں نے یقیناً دھوکا نہیں کھایا تھا لفظ بہ لفظ ٹھیک سنا تھا اپنے سیاق و سباق کے ساتھ۔ وہ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ کیا کہہ رہے ہو۔“ عمر کا لہجہ فی الحال ٹھنڈا ٹھارہی تھا۔ ”جی مجھے پتہ ہے۔“ درمیکتا اُن دونوں کو پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔

ماڑہ بظاہر یہاں سے اٹھ گیا تھی پر ڈائننگ روم سے باہر دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اندر سے آتی آدازیں بخوبی اُس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ رگ و پے میں بیجان سا رہا تھا۔

”پہا میں نے اپنا حق مانگا ہے۔ آخر کب تک چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کے لیے بھی مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑتی رہی گی اور میں آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہوں گا۔ پہا اب میری ایک فیملی لائف ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔“

میری بیوی ہے اُس کی بھی سب ضروریات ہیں۔ جن کا پورا کرنا میری ذمہ داری ہے اور میں نہ صرف اپنے بلکہ اُس کے لیے اپنی آپ کا محتاج ہوں۔ پہا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ذرا ذرا سی ضرورت کے لیے آپ کی طرف دیکھنا۔ اس لیے مجھے میرا حصہ دے دیں۔“ وہ بڑے سکون سے بولا۔ عمر زیب چند ثانیے آنکھیں بند کیے ٹیک لگائے کرسی کے ساتھ وہیں بیٹھے رہے۔ پھر کچھ کہے بغیر اٹھے اور اپنے تلے قدم اٹھاتے باہر نکل گئے۔

اُن کے قدموں کی مخصوص چاپ پچانتے ہی ماڑہ نے وہاں سے ہٹنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ جب تک وہ باہر آتے تب تک وہ راہداری سے غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ماڑہ شاہ زیب کی کارکردگی سے خوش تھی۔ اُس نے جس طرح بات کی تھی عمر چچا یقیناً اُس کے سرکش تیوروں سے واقف تھے۔ تب ہی تو ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ دل ہی دل میں ہار مان چکے تھے۔ جو ان اولاد کے سامنے کوئی منہ زوری نہیں دکھا سکتا۔ یہ ماڑہ کا اپنا نظریہ تھا۔

☆☆☆

عمر زیب کے سامنے گھنٹوں پہ فوٹو البم کھلا پڑا تھا۔ یہ بہت پرانی تصاویر تھیں۔ عمر کی۔ آئینہ کی۔ شاہ زیب اور درمیکتا کے بچپن کی۔ ایک فوٹو میں آئینہ شاہ زیب کو گود میں اٹھائے بیٹھی تھی۔ شاہ زیب بمشکل ایک سال کا تھا۔ آئینہ کی گود میں لیٹا انگوٹھا چوستا کیمرے کی طرف حیران نگاہوں سے تکتا۔ جب عمر نے وہ لمحہ تصویر میں قید کیا تھا۔ عمر ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں اپنا سنہرا ماضی ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُنہیں خبر ہی نہیں ہوئی کہ اُن کی آنکھوں کی گوشے نم ہوئے جا رہے ہیں۔ آئینہ کی گود میں بیٹھے شاہ زیب کے نقش دھندلا رہے تھے۔ آئینہ کے بعد انہوں نے اُس کی چھوڑی گئی نشانیوں کی..... کتنے پیار سے پرورش کی تھی۔ شاہ زیب کی ہر جائز ناجائز ضد پوری کی وہ ماڑہ کے معاملے میں اُن سے مقابلے پہ اُترتا تو انہوں نے شکست مان لی۔ اُس کی ضد پوری کر لی۔ ماڑہ کو عزت و مان سے بہو بنا کر لے آئے۔ شاہ زیب نے اُن کے ساتھ آفس جانا شروع کیا تو وہ خوش ہو گئے کہ جو ان بیٹے کو اپنے فرائض کا احساس ہو گیا ہے۔ باہر فرائض کا احساس تو نہیں تھا۔ خود غرضی کی مفاد کی جنگ تھی۔ اختیار، طاقت کے تاج کے حصول کی جنگ تھی۔ طاقت اور اختیار کی جنگ کا یہ تاج جس کے سر پہ بجا وہی فاتح قرار پاتا۔ ان سب کے پس منظر میں کس کی سوچ کارفرما تھی۔ یہ شاہ زیب کی اپنی سوچ اور فیصلہ نہیں تھا۔ شادی سے پہلے تک اُس کا ذہن کبھی کاروبار، دولت کی ملکیت کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اب یگانہ اپنے حصے کا مطالبہ، مالک بنانے کی ضد۔ اُن کی ساری عمر کی کمائی کے زیاں کے ورپے تھی۔ درمیکتا اُس کے مقابلے میں خاصی کم گوارا اپنے آپ میں گن رہنے والی حساس اور خود دار بچی تھی جو اُن کی ذرا ذرا سی تکلیف پہ پریشان ہوا اٹھتی۔ اُس نے کبھی بھی اُنہیں پریشان نہیں کیا تھا۔ جانے شاہ زیب کو خود غرضی کی ہوا کیوں لگ گئی تھی۔

انہوں نے البم بند کیا اور آرام سے کھڑے ہوئے۔ اُسے پہلے والی جگہ پہ رکھا اور دوبارہ صوفے پہ آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ اٹھے اور دیوار میں نصب سیف کالاک کھولا۔ اندر بہت سے کاغذات اور کچھ ضروری فائلز پڑی تھیں۔ عمر نے ایک ایک کر کے سب کاغذات باہر نکال لیے۔ وہ انہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ اُن کی زمینوں کا بیادوں کے کاغذات تھے۔ شاہ زیب نے انہیں دورا ہے پہ لاکھڑا کیا تھا۔ اس مشکل سے نکلتا اُن کے اختیار میں تھا۔

تجرباتی طور پر اُس نے کروڑوں کا مال باسط کو دیا۔ باسط کو اُس شخص کی پہچان اور حلیہ اچھی طرح بتایا گیا بلکہ تصویر بھی دکھائی گئی۔ ڈھیروں ہدایات پلو میں باندھے اپنے مشن پر روانہ ہوا۔ اُسے بالکل بھی پتہ نہیں تھا کہ جو سامان وہ ساتھ لے کر جا رہا ہے اُس کی قیمت اتنی زیادہ ہے۔ بغیر کسی مشکل یا خطرے میں بڑے اُس نے اپنا کام کر لیا اور رپورٹ باس کو دی۔ کچھ دیر تک کامیابی کی اطلاع باس تک بھی پہنچ گئی۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس بار باسط کو بونس بھی ملا اور یہ بونس بھی لاکھوں میں تھا۔ دل ہی دل میں اُس نے حساب لگایا کہ ان پیسوں کیا کچھ خریدا جاسکتا ہے۔

باس نے ایپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا ہوا تھا یہ اُس کا نیا پراجیکٹ تھا جو اس نے صرف چھ ماہ پہلے ہی شروع کیا تھا۔ اس کمپنی کے لیے اُس نے لیبر پاکستان سے بھی بھرتی کی تھی جن میں سے ایک باسط بھی تھا۔

کمپنی کا دفتر وہی کے مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ باسط بھی اسی آفس میں تھا۔ اُس میں اُس کی جاب کچھ ایسی بھی خاص نوعیت کی نہیں تھی ہاں جب سامان کہیں لے جانا ہوتا تو پھر باس کی توجہ اسی پہ فوکس ہوتی۔ اُس کے ساتھ کے باقی تین چار لڑکے اُس کی طرح اتنے ہوشیار نہیں تھے۔ اُن میں سے دو تو اس وقت وہی کی ایک جیل میں سڑ رہے تھے۔

باسط اپنے ساتھ اس قسم کے حادثے سے بچنا چاہتا تھا وہ بالکل ہی اپنے ہاتھ پاؤں کٹا کے نہیں بیٹھا تھا۔ باس کی غیر موجودگی میں اُس کا ایک نائب تھا جو سارے معاملات کا نگران تھا۔ باسط نے اُسے کافی قربت پیدا کر لی تھی۔ وہ باسط کو پسند کرنے لگا تھا۔ کسی بھی قسم کی پریشانی کی صورت میں اُس نے باسط کو مکمل مدد کی یقین دہانی کرائی تھی۔ ویسے بھی باسط اُس کا خاص منظور نظر تھا۔ اسی نے باسط کو باس کے مختلف قسم کے بزنس کے بارے میں بتایا تھا۔ پر کچھ عرصے بعد باس کوئی نہ کوئی نیا بزنس اشارت کر دیتا۔ اس بزنس کی آڑ میں اُس کا اصل بزنس پوشیدہ تھا اور یہی اُس کی کامیابی کا نکتہ تھا۔

چھ ماہ کے دوران باسط کی وجہ سے باس کو بہت کامیابی ملی تھی سو کامیابی کے تناسب سے اُس کا معاوضہ بھی دیگر کارکنوں کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ باسط نے اپنی ذاتی صلاحیت سے انگلش فر فر بولنا سیکھ لی تھی اور عربی زبان کی کچھ نہ کچھ شہدہ بدھ اُسے ہو ہی گئی تھی۔ یہ اس کا روبرو بار کے لیے بہت ضروری تھی۔

☆☆☆

پینا گھر کے ایک ایک حصے کو حسرت آمیز حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ حمزہ احمد نے باسط کے بھیجے گئے پیسوں سے یہ گھر کل ہی خریدا تھا اور آج وہ سب اس گھر کو دیکھنے آئے تھے۔ گھر اُن کے پاس پہلے سے بھی موجود تھا اور کافی کشادہ، ہوا دار اور خوبصورت بھی تھا۔ پر پوش علاقے میں بنے اس بنگلے کی کیا ہی شان تھی۔ فل فر شڈ بنگلہ تھا۔ وال ٹو وال کارپٹ، وسیع وعریض لان، جدید فرنیچر سے آراستہ ایسا گھر ہی پینا کا خواب تھا۔

”میں سب کو بلا کے قرآن خوانی کرواؤں گی خاص طور پر شریں آپا کو تو ضرور بلاؤں گی انہیں پتہ چلنا چاہیے کہ میرا باسط کتنا قابل ہے۔ اُن کے داماد اور ماہرہ کے شوہر کو توور نے میں سب کچھ ملا ہے پر میرے بیٹے نے سب کچھ اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ میرا باسط اُن کے داماد سے کئی گنا زیادہ اچھا ہے۔“ وہ دل ہی دل میں خود سے بول رہی تھی۔ حمزہ احمد اُن سب کو گھر کا چپہ چپہ دکھا رہے تھے۔

☆☆☆

باسط نے چھ ماہ بعد پہلی بار پاکستان کا چکر لگایا تو رشتہ داروں کے لیے تحائف بھی لایا۔ وہ سامان سے لدا پھندا تھا۔ پینا بطور خاص اُسے اپنے ساتھ گاؤں لے کے گئی۔ کیونکہ باسط شریں خالہ اور اپنے کزنز کے لیے بہت کچھ لایا تھا۔

ان سب کو تحائف بھی دینے تھے اور کچھ جتنا بھی تھا۔ اتفاق سے ماہرہ بھی میکے آئی ہوئی تھی۔ باسط کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ مونا اور پہلے سے بڑھ کر میچور لگ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا ان چھ ماہ میں اُس کی عمر جیسے چھ سال بڑھ چکی ہو۔ وہ حد سے زیادہ پختہ کار لگ رہا تھا۔

”لگ رہا ہے کہ تمہاری جاب اور کام بہت اچھا ہے۔“ وہ برسمیل تذکرہ بولی تھی۔ ”ہاں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھا ہے میرا کام اور ہاں میں نے گھر بھی لے لیا ہے فل فر شڈ ہے۔ کبھی آؤ ناں ہمارے غریب خانے پہ۔“ بولتے وقت وہ ماہرہ کے سراپے کو بھی تولتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنوز پہلے کی طرح اسمارٹ اور دلکش لگ رہی تھی۔ شاہ زیب کی قربت نے اُس پہ کوئی اثر اور نشان نہیں چھوڑا تھا۔ باسط کو جانے کیوں خوشی سی ہوئی۔ ایک کینی اور گھٹیا سی خوشی۔ ”ہاں خالہ نے بتایا ہے کہ تم نے گھر لیا ہے۔ آؤں گی کبھی۔ تمہارے گھر بھی۔“ وہ خاص ادا سے بولی تو باسط دیکھنے لگ گیا۔

رات وہ گاؤں میں ہی رُکا۔ ماہرہ رات گئے اُس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ ان باتوں کے دوران ایک بار بھی شاہ زیب کا ذکر نہیں آیا۔

☆☆☆

باسط نے پاکستان میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا اُس نے واپسی کی سیٹ بک کروالی تھی۔ پہلے کی طرح اُسے پھر کوئی سامان کسی مخصوص شخص کے سپرد کرنا تھا۔ اس بار مال کی مالیت زیادہ تھی سو وہ کچھ نروس اور پریشان بھی تھا۔ لیکن کوشش کر رہا تھا کہ اندرونی اضطراب اور کرب اُس کے چہرے سے ظاہر نہ ہونے پائے۔ سو چیکنگ کے مرحلے سے وہ بخوبی گزر گیا۔ اب دیکھنا تھا وہی ایئر پورٹ پہ کیسے حالات سے واسطہ پڑنا تھا۔ یہاں سے تو سب آرام سے ہو گیا تھا۔

وہ جتنا ڈر رہا تھا کام اتنی ہی آسانی سے ہو گیا۔ اُس پہ خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اور خیریت سے ایئر پورٹ کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ ایک اور مشکل ناسک جو اُس کے سپرو کیا گیا تھا اُس نے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔ اب راوی نے چین ہی چین لکھا تھا۔

وہ اپنے فلیٹ میں جا کے سو گیا۔ رات کو باس کو رپورٹ دینی تھی۔

☆☆☆

شاہ زیب بھی اپنے کاروبار کی پلاننگ کر رہا تھا۔ تایا اور نگزیب نے اُسے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی حالانکہ عمر نے اپنی مدد کی پیش کش بھی کی تھی۔ پر وہ اُن کی کسی بات کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اب تایا اور نگزیب نے ایپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کی بات کی تو اُس کے ذہن میں وہی بیٹھ گئی۔ ماہرہ نے اپنی خالہ کے بیٹے باسط کا بتایا تھا کہ وہ وہی میں ایک کمپنی میں کام کرتا ہے جس کا بزنس ایپورٹ ایکسپورٹ سے متعلق ہے اور وہ اچھے خاصے پیسے کما رہا ہے۔ ماہرہ نے اُسے ایک آئیڈیا دیا تھا اور اُس نے عمل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اندھے کو دو آنکھیں چاہئیں تھیں۔ تایا اور نگزیب اور اپنے بڑے سالے کے توسط سے اُس نے آفس کے لیے جگہ بھی ڈھونڈ لی۔ اب وہ بڑی لگن اور شوق سے اپنے آفس کی آرائش کروا رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے ملک کے مہنگے انٹریٹڈ کوریٹر کی خدمات حاصل کی تھی۔ دفتر کی آرائش پہ اُس نے بے دریغ پیسہ خرچ کیا۔ پاپا کی وجہ سے اُسے اپنے کاروبار کے لیے اجازت نامہ آسانی سے مل گیا۔ آفس کی تزئین و آرائش مکمل ہوتے ہی اُس نے دو لگژری گاڑیاں خریدی ایک اپنے اور ایک ماہرہ کے استعمال کے لیے۔ فی الحال وہ عمر زیب کے ساتھ ہی مقیم تھے۔ انہوں نے اُس کے لیے نیا گھر تعمیر کروایا تھا۔ ماہرہ نے ضد شروع کر دی کہ ہمیں اب اپنے

مائرہ نے اپنی دلچسپی کی نئی راہیں تلاش کر لی تھیں۔ اُس نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ اور وہ شاہ زیب کی بیوی ہونے کے ناطے ایک لیڈیز کلب کی مستقل ممبر بن گئی تھی۔ وہ دن بھر گاڑی اڑائے اڑائے پھرتی۔ ادھر شاہ زیب کے ذہن پہ آفس کے معاملات بُری طرح سوار تھے اتنے سارے آرڈرز نے اُس کی مت ہی مادی تھی۔ تایا اور نگزیب کو ان معاملات کی کوئی خاص سوجھ بوجھ نہیں تھی اپنی عقل سے کام کرتے جا رہے تھے۔ عمر زیب کے ساتھ اُن کا رویہ لیے دینے والا تھا سوانہوں نے شاہ زیب کے آفس کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اُن کا یہ رویہ مستقبل قریب میں شاہ زیب کے لیے نقصان لانے والا ہے اگر انہیں علم ہوتا تو وہ شاید کبھی بھی ایسا نہ کرتے۔

☆☆☆

آرڈر کی بروقت تکمیل کے لیے شاہ زیب نے میٹرل کی خریداری تایا اور نگزیب اور اپنے سالے کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ منیجر نے دے الفاظ میں کہا بھی کہ انہیں اس کا تجربہ نہیں ہے نہ ہی وہ کوالٹی کے معیار کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ جواباً اُس نے منیجر کو بُری طرح جھاڑا اور اپنی اوقات میں رہنے کو کہا۔ وہ بے چارا اپنا سامنہ لے کے رہ گیا۔ اس فیئلڈ میں اس کا تجربہ کافی زیادہ تھا پر شاہ زیب کے رویے کو دیکھتے ہوئے سائیڈ پہ ہو گیا۔ اور نگزیب نے ایک فیکٹری سے کپڑا اور دیگر میٹرل خرید لیا۔ وہ اپنے اس کارنامے پہ خوش تھے کہ انہوں نے یہ سب بہت سستا خریدا ہے۔ شاہ زیب کو بڑھا چڑھا کر انہوں نے یہ بتایا۔ وہ پرسکون ہو گیا۔ پر کوالٹی کنٹرول منیجر نے سامان دیکھتے ہی کوالٹی اور معیار کا اندازہ لگا لیا۔ وہ شاہ زیب سے شکایت کرنا چاہتا تھا۔ پر منیجر نے اُسے اپنا واقعہ سنا کر خوفزدہ کر دیا۔ ویسے بھی ٹائم گزرتا جا رہا تھا اور انہیں آرڈر مکمل کرنا تھا۔ اگر ٹائم گزرتا تو اُن کی کاروباری ساکھ کو شدید دھچکہ لگتا۔ میٹرل ملتے ہی کام شروع کر دیا گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ ساری لیبر اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں لگی ہوئی تھی۔ ہونی ہو کر رہی۔ مقررہ میعاد کے اندر کام مکمل نہیں ہو سکا۔ جتنا کام مکمل ہو سکا وہ کپن لوجھوا دیا گیا۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر تمام سامان شکایات کے ساتھ واپس بھجوا دیا گیا۔ شاہ زیب سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ وہ تمام سرمایہ اس کاروبار میں جھونک چکا تھا۔ دوسری کمپنیوں سے بھی یاد دہانی کروائی جا رہی تھی کہ سامان وقت تک پہنچانا ہے۔ اور نگزیب تایا نے بغیر سوچے سمجھے ہر چھوٹی بڑی کمپنی سے جو آرڈر لیے تھے وہ اب شاہ زیب کے گلے کا پھندا بنتے جا رہے تھے۔ وہ کچھ دن کے لیے خود کو کاروباری معاملات سے الگ کرنا چاہ رہا تھا۔ تایا اور نگزیب نے کہا کہ کچھ دن کے لیے گھوم پھر آؤ۔ پیچھے میں تمام کام دیکھ لوں گا۔ وہ خوش ہو گیا۔ بوجھ سر سے اترتا محسوس ہوا۔ اتنے دن بعد وہ کھل کے خوش ہوا تھا۔ گھر آیا تو مائرہ غائب تھی وہ کلب گئی ہوئی تھی۔ اُسے غصہ سا آ گیا۔ بڑے سکون سے اُس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

باہر پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو شاہ زیب نے بیڈروم کی کھڑکی سے پردہ اٹھا کے دیکھا۔ مائرہ چابی جھلاتی گاڑی سے اترتی اور ہیل سے ٹک ٹک کرتی قدم اٹھانے لگی۔ شاہ زیب آ کر بیٹھ گیا۔ مائرہ نے دروازہ کھولا اور اُسے دیکھ کر چونک گئی۔ ”آج آپ جلدی آگے ہیں۔“ وہ پرس صوفے پہ پھینک کے گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ”ہاں آج ریلکس کرنے کا سوڈ تھا سو آ گیا گھر۔ کچھ گھومنے پھرنے کا دل کر رہا ہے تم سے وعدہ کیا تھا کہ پہلے تمہیں پورے پاکستان کے قابل دید مقامات دکھاؤں گا۔ شمالی علاقہ جات لے جاؤں گا اس کے بعد ملائیشیا اور اٹلی چلیں گے۔ میں نے تایا سے کہہ دیا ہے۔“ ”ہائے بیج شاہ زیب“ مائرہ اٹھ کے اُس کے گلے لگ گئی۔ ”ہاں تم کل سے تیاری شروع کر دو ہم

گھر میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ عمر زیب کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں تھا اگر وہ اپنے گھر چلے جاتے۔ پر انہیں موبوم سی ایس تھی کہ شاید شاہ زیب انہیں چھوڑ کے نہ جائے۔ یہ گھر ویسے بھی بہت بڑا تھا۔ کتنے کمرے خالی پڑے ہوئے تھے۔ مگر مائرہ کو دھن سماگئی تھی اپنے گھر میں جانے کی۔ ویسے بھی وہ گھر شاہ زیب کے نام پہ تھا۔ اُس نے دل میں ٹھانی ہوئی تھی کہ اپنی شادی کی سالگرہ کے موقعے پہ گھر اپنی محبوب بیوی مائرہ کو گفٹ کر دے گا۔ اُس کی اس خواہش سے مائرہ لاعلم تھی۔ ویسے بھی وہ اُسے سر پر اُزدینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

مائرہ کی ضد کے آگے ایک بار پھر شاہ زیب کو ہار ماننا پڑی اور وہ اُس کے ساتھ عمر اور دریکتا کو چھوڑ کر گھر میں شفٹ ہو گیا۔ جو پانے اُس کے لیے بہت شوق اور چاؤ سے بنوایا تھا۔ انہوں نے دل پہ پتھر رکھ کر بہت سی دعاؤں سمیت اُسے اس گھر سے رخصت کیا بلکہ اپنی آنکھوں سے اُسے خود سے دور جاتے دیکھا۔ بہت سے آنسو انہوں نے دل میں اتار لیے تھے کہ مبادا شاہ زیب کا ارادہ کمزور نہ پڑ جائے۔

شاہ زیب اپنا کاروبار شروع کر چکا تھا۔ اس میدان میں خاص مہارت اور تجربہ نہ ہوتے ہوئے بھی قسمت اُس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اپنے ملک کی بہت ہی اچھی ساکھ والی کمپنی نے کافی بڑا آرڈر انہیں دیا تھا۔ ابھی اُس کے کاروبار کی آغاز تھا اس لیے بہت سے ادارے آرڈر دیتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ ابتدائی مرحلے میں کام بھی محدود تھا۔ شاہ زیب صرف لیڈر گڈز اور ریڈی میڈ ملبوسات پہ فوکس کیے ہوئے تھا۔ اور نگزیب تایا آفس میں اُس کے ساتھ بیٹھتے تھے روز روز گاؤں سے آنا اور پھر جانا بہت دشوار تھا سوشاہ زیب نے انہیں اپنے گھر رہنے کی آفر کر دی۔ شروع میں انہوں نے انکار کیا کہا کہ آفس میں ہی رہ لوں گا بیٹی کے گھر نہیں رہوں گا مگر شاہ زیب کی ضد اور اصرار کے آگے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ اُن کے ساتھ اُن کا بڑا بیٹا بھی آ گیا۔ وہ بھی آفس میں شاہ زیب کے ساتھ ہوتا۔ شاہ زیب نے اُسے اشفاق کی کارکردگی جانچنے پہ لگا دیا تھا۔ وہ اس کام میں بہت خوش تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچھی تنخواہ مل رہی تھی۔

باقی ٹھاٹ اس کے علاوہ تھے۔ عمر زیب کبھی کبھار شاہ زیب کے آفس کا چکر لگاتے تو اور نگزیب بھائی اور نگزیب مل جاتے۔ پر اُن کے رویے میں بڑا فرق آ گیا تھا زمین آسمان کا فرق۔ وہ بڑے غرور اور سرد مہری سے ملتے جیسے اس کاروبار اور آفس کے وہی مالک ہوں۔ شاہ زیب کی بیرونی اور گھریلو زندگی میں ان کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔ عمر زیب دیکھتے پر منہ سے بول نہ پاتے۔ شاہ زیب کی ضد ماننے کا یہی انجام ہونا تھا۔ اُن کی دولت اور ترقی سے اُن کے گھر والے رشتے حسد کرتے تھے۔ جو کام کوئی نہ کر سکا تھا وہ ایک کمزوری لڑکی نے اُن کی بہو بن کے کر دکھایا تھا۔ پہلے اُن کے گھر آئے پھر اُن کے بیٹے کے دل میں اتری پھر اُس کی زندگی پہ چھا گئی۔ شاہ زیب اُس کے پیچھے دم ہلاتا بندر تھا۔ مائرہ ڈنگل بجاتی اور وہ ناچنا شروع کر دیتا۔ وہ پوری طرح اُس کے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب بہت خوش تھا۔ عمر زیب کے توسط سے پہلی بار اُسے بیرون ملک سے آرڈر ملا تھا۔ اُس کی خوشی دیکھ کر تھی۔ اُسے اس بات کا چنداں احساس نہیں تھا کہ اس آرڈر کا کامیابی سے تکمیل پہ اُس کے لیے ترقی و کامرانی کے دروازے کھل جانے تھے۔ وہ تو بس آرڈر ملنے پہ ہی خوشی سے پھولے نہیں سمار رہا تھا۔ کاروباری حلقوں میں اُسے والے اس آرڈر پہ تبصرے ہو رہے تھے۔ کئی ملکی کمپنیوں کے چھوٹے موٹے آرڈر اس کے علاوہ تھے۔

ماثرہ کپڑے اور دیگر تمام چیزیں رکھ چکی تھی۔ شاہ زیب پپا کی طرف گیا تھا یہ بتانے کہ ہم گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔ ماثرہ نے پکنگ کا کہہ کر اُس کے ساتھ آنے سے معذرت کر لی۔ وہ اکیلا ہی چلا آیا۔ پپا افس جانے کی تیاری میں تھے اور دریکتا کالج کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ وہ صبح اُسے دیکھ کر پہلے حیران اور پھر مسرور سے ہوئے۔ بڑی محبت سے گلے ملے۔ وہ دو دفعہ جانے کے لیے کھڑا ہوا اور انہوں نے دونوں بار ہی اُسے تھوڑی دیر تو بیٹھو کہہ کر اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہیں دیا۔ جب وہ آنے لگا تو اُسے چھوڑنے گیٹ تک آئے۔ آخر میں اُسے گلے لگایا اُن کی گرفت میں بہت محبت بھری سختی تھی۔ بے اختیار شاہ زیب نے کسی بچے کی مانند اُن کی گردن میں ہاتھیں جمائیں کہ اُن کے ماتھے پہ اپنے لب رکھ دیئے۔ عمر زیب کے اندر شفقت پداری کا طوفان ٹھانٹھیں مارنے لگا۔ جانے کیا بات تھی اُن کا دل چاہتا تھا کہ شاہ زیب اسی طرح اُن کے گلے سے لپٹا رہے۔ پر اُسے جانا تو تھا۔ دوبار ماثرہ کی کال آ چکی تھی۔ کہ کب آئیں گے ہم ایٹ ہو رہے ہیں۔ ناچار شاہ زیب اُن سے مل کر واپس آ گیا۔ جب تک اُس کی گاڑی نے موڑ نہیں کا نا عمرو ہیں کھڑے دیکھتے رہے۔

شاہ زیب گھر پہنچا تو شریں تائی بیٹھی تھیں۔ وہ ابھی ابھی بچنی تھیں۔ ماثرہ نے ہی انہیں بلوایا تھا حفاظت کے نکتہ نگاہ سے۔ گھر قیمتی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں چلے جاتے تو دن میں گھر میں کون ہوتا۔ کیونکہ اورنگ زیب اور ماثرہ کا بھائی افس میں ہوتے۔ کہیں شام ڈھلنے کے بعد لوٹتے۔ چوری کی وارداتیں عام نہیں کوئی بھی گھر میں کسی کو نہ پا کر نفرت لگا سکتا تھا اس لیے ماثرہ نے اپنی والدہ محترمہ سے گزارش کی تھی کہ اُن کی غیر موجودگی میں گھر کی دیکھ بھال کریں۔ انہوں نے کل ہی آ جانا تھا لیکن ہنگامی طور پر ایک فونگلی میں جانے کی وجہ سے نہ آسکیں۔ صبح پوٹھتے ہی وہ ڈرائیور کے ساتھ چل پڑیں۔ اُن کے ہمراہ ساثرہ بھی تھی یہ ماثرہ سے چھوٹی تھی۔ ماثرہ اُن دونوں کی خاطر مدارت میں لگ گئی تو بارہ گھر ہی پہنچ گئے۔ وہ کافی لیٹ گھر سے نکلے۔ انہیں سب سے پہلے براستہ ایبٹ آباد وادی نیلم کشمیر جانا تھا۔ شاہ زیب پہلے بھی کافی بار یہاں آچکا تھا دوستوں کے ساتھ مگر اس بار ماثرہ کے ساتھ وہ پرانی خوشگوار یادیں تازہ کرنے آیا تھا۔ اُن کا پہلا پڑاؤ ایبٹ آباد تھا مگر وہاں انہوں نے قیام زیادہ طویل نہیں کرنا تھا۔ ایبٹ آباد وہ کافی لیٹ پہنچے تھے۔ شاہ زیب نے ابھی بھی تازہ دم تھا مگر ماثرہ تھک گئی تھی۔ سوشاہ زیب اُس کے ساتھ ہوٹل آ گیا۔

اگلے دن چڑھے سو کے اٹھنے کے بعد شاہ زیب نے ناشتہ کرے میں ہی منگوایا۔ ڈٹ کے ناشتہ کرنے کے بعد اُس نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور اپنا سامان ڈگلی میں رکھا۔ موسم ابر آلود سا لگ رہا تھا۔ پر خوشگوار تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سورج بھی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ شاہ زیب ڈرائیونگ کرتے ہوئے بہت ترنگ میں تھا۔ ایبٹ آباد کو وہ کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ سڑک بہت خراب تھی ”آٹھ مقام“ سے لے کر وادی نیلم تک سڑک کا یہی حال تھا وہ نہ ٹوٹل تین گھنٹے کا سفر تھا جو چھ سات گھنٹے میں جا کے ختم ہوتا تھا۔ سڑک کے ایک طرف متوازی سمت میں دریا نے نیلم اپنی آب دتاب کے ساتھ بہ رہا تھا اور دوسری طرف گہری کھائیاں منہ کھولے کھڑی تھیں۔ بہت خطرناک راستہ تھا۔ ماثرہ کو جتنی قرآنی آیات زبانی یاد تھیں اُس نے اُن کا درد شروع کر دیا۔ شاہ زیب اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ چھ گھنٹے بعد وہ آخر کار وادی نیلم پہنچ ہی گئے۔ یہاں بڑے شہروں جیسی گہما گہمی نہیں تھی۔ ایک خاموشی اور پراسرار سا سکون تھا۔ شاہ

زیب یہاں آتا جاتا رہتا تھا اس لیے اسے رہائش کے معاملے میں نصیحتی پریشانی نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک ہوٹل ڈھونڈ ہی لیا۔ یہاں آ کے اُن کے موبائل فون نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ماثرہ اور اُس کے سیل فون کے سگنلز ڈیڈ تھے۔ شاہ زیب کو تو اس صورتحال کا پتہ تھا پر ماثرہ پریشان ہو گئی۔ ”نہ پریشان ہو یہاں سے پینتالیس منٹ کی ڈرائیور پہ پی سی او ہے آؤ وہاں چلتے ہیں۔ اور گھر والوں کو اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہیں۔ میں جب بھی یہاں آتا ہوں اُسی پی سی او سے گھر کال کرتا ہوں۔ پپا بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔ جلدی آؤ۔ رات زیادہ ہو گئی تو ہمیں ناکام لوٹنا ہوگا۔ پی سی او۔ زیادہ سے زیادہ دس بجے تک کھلا رہتا ہے اُس کے بعد بند ہو جاتا ہے۔“ شاہ زیب نے اُسے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کیا تو ماثرہ بجلی کی تیزی سے گاڑی میں بیٹھی۔ ”شاہ زیب جلدی کریں۔ گھر فون کر کے واپس آئیں گے۔ اُس کی پھرتی قابل دید تھی۔ کہاں تو وہ تھکن سے چورتھی اور اب اُس میں بجلی سی بھر گئی وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔

آسمان پہ موجود لاتعداد بادلوں کی وجہ سے اندھیرا بہت تیزی سے پھیلا تھا۔ سرزی کی شدت بھی کافی زیادہ تھی۔ ماثرہ بار بار گرم شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ رہی تھی۔ پی سی او۔ کھلا تھا۔ پہلے ماثرہ نے اپنی والدہ محترمہ اور بہن سے بات کی اُس کے بعد شاہ زیب نے پپا کو کال کی اور اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ دریکتا سے بھی بات ہوئی۔ اُس نے بھائی کو اپنا ڈھیروں خیال رکھنے کی تاکید کے بعد فون بند کیا۔ وہ مڑی پپا بھی پاس ہی کرسی پہ بیٹھے تھے۔ وہ اُسے اس سے بہت اداس سے گلے۔ اُسے پپا پہ پیار سا آ گیا۔ وہ قالین پہ نیچے بیٹھ گئی۔ ”پپا اداس کیوں ہو گئے ہیں بھائی سے بات کرنے کے بعد حالانکہ وہ خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔“ دریکتا نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔ ”وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے مگر میں باپ ہوں ناں کیا کروں پریشانی سی ہے۔“ ”پپا آپ ایسے ہی پریشان ہوتے ہیں۔ بھائی پہلے بھی تو گھومنے پھرنے کی غرض سے جاتا رہا ہے۔“ دریکتا نے انہیں تسلی دی تو وہ پھینکی سی ہنسی ہنس دیئے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ انہوں نے فوراً ہار مان لی۔

بہو اور بیٹی کی غیر موجودگی میں شریں نے پورے گھر کا ناقدانہ جائزہ لیا اور پھر رازدارانہ انداز میں اپنے شوہر اور نگزیب سے اس گھر کی مالیت کی بابت پوچھا۔ ”مجھے تو نہیں پتہ کہ اس کی درست مالیت کتنی ہے مگر ایک کروڑ سے زیادہ کا ہوگا۔ انہوں نے اندازے سے بتایا تو شریں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”عمر بھائی نے شاہ زیب کا حصہ تو اُسے دے دیا ہے مگر بیٹی کے معاملے میں پڑا سراسر خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس کا کیا مطلب ہے۔“ ”مجھے کیا پتہ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بتانا نہ چاہ رہا ہو۔“ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھائی نے بیٹی کو بیٹے سے زیادہ حصہ دیا ہو اس لیے خاموش ہو۔“ شریں دور کی کوڑی لائی تھی۔ واقعی بات قابل غور تھی۔ وہ اس طرف سوچنے پہ مجبور ہو گئے۔ ”اگر ایسی بات ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔“ شریں جانے کیوں اس قدر اچھل رہی تھی۔ اور نگزیب بھی اس معاملے پہ سوچ رہے تھے کہ عمر نے بیٹے کو جو دینا دلانا تھا دے دیا مگر دریکتا کا حصہ کتنا تھا اس بارے میں اُن کی خاموشی معنی خیز تھی۔ اس کے پیچھے جانے کیا مصلحت اور راز تھا۔ جس کا جاننا اب اور نگزیب کے لیے از حد ضروری تھا۔ عمر زیب سے مل کے پوچھا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اب اس پوریشن میں تھے کہ یہ سوال کر سکتے تھے۔ شاہ زیب نے اپنے کاروبار کے کلی معاملات اُن کے حوالے کر دیئے تھے اور اپنی اس کامیابی پہ وہ پھولے نہیں سہا رہے تھے۔ برسوں پہلے جب عمر اپنے دونوں بچوں کے ساتھ شہر شفٹ ہونے کی تیاری کر رہا تھا تو آنکھ کے چھوڑے گئے اچانکوں کی تفصیل جان کے اُن کے دل میں خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش اس میں ان کا حصہ بھی ہو۔ اُس



نے اپنے بیٹے کو اُس کا حصہ خوشی خوشی جیتے جی دے دیا۔ اب یہ ماڑہ کے نام کیسے کرانا تھا انہیں سوچنا تھا۔ شاہ زیب دیسے بھی اُن کی نگاہ میں جذباتی اور قدرے نان پر یکینکل نوجوان تھا۔ ایسے نوجوان پہ مانی معاملات میں زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا وہ سناہ دل تھا ہر ایک پہ اندھا اعتبار کرنے والا۔ میٹرل کی خریداری کی ذمہ داری اُن کے حوالے کر کے اُس نے روپے پیسے کی کوئی تفصیل اُن سے نہیں مانگی تھی۔ یہ ردیہ مستقبل میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اُن کی بیٹی کے حق میں۔ اس طرح تو کوئی بھی اُسے مالی خسارے سے دوچار کر سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ماڑہ کو کل کلاں اس وجہ سے کوئی پریشانی ہو اس لیے شاہ زیب اپنی جائیداد میں سے کچھ اُس کے نام کر دیتا تو اُس کا مستقبل محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ بہت ددر کی کوڑی لائے تھے۔

دوسرے دن دادی میں موسم بہت ابر آلود تھا۔ دقے دقے سے بارش ہوتی رہی اس وجہ سے شاہ زیب اور ماڑہ زیادہ گھوم پھر نہیں سکے۔ ہوٹل تک ہی محدود رہے۔ سردی کی شدت بارش کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں دیسے بھی سارا سال موسم بہت اچھا ہی رہتا اور زیادہ تر ٹھنڈ ہوتی۔ اسی وجہ سے شاہ زیب کو یہ جگہ بہت پسند تھی۔ وہ کتنی بار یہاں آچکا تھا۔ ماڑہ کے ساتھ پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ وادی اس کے دل فریب نظارے گنگنا تا شور مچاتا دریا نے نیلم کی آنکھوں کو تازگی بخشتا سبز فلک بوس پہاڑ سب کچھ ہی تو بہت اچھا لگا رہا تھا۔ اس جگہ کا اپنا حسن اور خوبصورتی تھی اُس کی رومانوی حس جاگ پڑی تھی پر ماڑہ جانے کیوں جھنجھلائی ہوئی سی تھی۔ اس دقت بھی اُس کے چہرے پہ بیزاری ہی بیزاری تھی۔ شاہ زیب آتش دان کے پاس بیٹھا تھا۔ ماڑہ کبل اوڑھے بیڈ پہ نیم دراز تھی۔ باہر پانچ بجتے ہی رات اُتر آئی تھی اور بارش تو اتر سے ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہوں میں خمار اور مستی اُتر آئی۔ وہ آتش دان کے پاس سے اُٹھ کے ماڑہ کے پاس آیا تو اُس نے شاہ زیب کا بازو جھٹک دیا۔ وہ اسے محبوب بیوی کی ادا سمجھا اور پیار سے اُس پہ جھکا تو اُس نے اس بار شاہ زیب کو پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔ ”سوئیٹ ہارٹ کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری۔“ شاہ زیب کے لہجے میں محبت کی ساری نرمائیں بول رہی تھیں ماڑہ کو اور بھی غصہ آ گیا۔ شاہ زیب میں تو جیسے مردانہ حس اور انا موجود نہیں تھی کیسے وہ اُس کی انا کو اپنے پاؤں تلے روندتی اور وہ ہنستا چلا جاتا اُس کی منتیں کرتا مانتا بچوں کی طرح راضی کرتا۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے مجھے کیا ہونا ہے۔ میں اس دقت اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔“ جانے کیوں آج کل اُس پہ سستی اور بیزاری طاری تھی۔

تھک بھی جلدی جاتی۔ شاہ زیب کی جراتوں کا سامنا کرنا اُس کے لیے آسان نہیں رہا تھا تب ہی اس دقت اُسے غصہ آ گیا تھا۔ جو اب شاہ زیب اُسے منانے لگا۔ اسی حساب سے ماڑہ کا غصہ بڑھنے لگا۔ پلیز شاہ زیب مجھے عورتوں کی عادات لیے مرد اچھے نہیں لگتے پلیز اپنے اندر مردانگی پیدا کریں۔ جیسے اور عورتوں کے شو ہردوں میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔ ”ماڑہ کے لہجے میں از حد سختی اور درشتگی تھی۔“ تو تمہارے خیال میں مجھ میں مردانگی نہیں ہے۔ شاہ زیب کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ ”نہیں ہے نہیں ہے مردانگی تب ہی تو کہا ہے کہ خود میں پیدا کریں۔ مرد میں ایک انا اور عزت نفس ہونی چاہیے۔“ تو مجھ میں مردانگی اور انا کے ساتھ ساتھ عزت نفس بھی نہیں ہے۔“ ”ہاں نہیں ہے۔“ وہ گہلی لکڑی کی طرح سنگ رہی تھی۔ ”تو کس طرح کے مردوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔“ شاہ زیب کی آنکھوں میں اس دقت اتنا ملال تھا جسے ماڑہ بڑھ ہی نہیں پائی۔ ”باسط کو دیکھ لیں وہ ایک مکمل مرد ہے۔ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ خالہ میرا رشتہ مانگ رہی

تھی پر امی ابو عمر چچا کو زبان دے چکے تھے درنہ آج حالات کچھ اور ہوتے.....“ ماڑہ اُس کی حالت سے بے خبر جانے کیا کیا بول رہی تھی۔ شاہ زیب پیچھے ہٹا بیڈ کے پاس پڑے اپنے شوز اٹھائے پہلے جرابیں پاؤں میں چڑھائیں پھر شوز پہنے۔ سائیز نیبل پہ پڑی گاڑی کی چابی اٹھائی۔ صرف ایک ٹائیپے کے لیے ماڑہ کی طرف دیکھا۔ اُس کا ایک ہاتھ دروازے کے ہینڈل پہ تھا۔ اگلے ہی پل وہ نرم گرم کمرے کی پناہ سے باہر تھا۔ ٹھنڈا سینے والی لہو کو سرد کر دینے والی ٹھنڈک تھی۔ ہوٹل کے ساتھ ہی ایک خالی قطعہ زمین کو پارکنگ کی شکل دی گئی تھی۔ اُس کی گاڑی اُدھر ہی پارک تھی۔

شاہ زیب کے ذہن میں اس دقت کچھ نہیں تھا۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ گاڑی نکال کے ڈھلوان سڑک پر لایا اتنے میں پیچھے سے ہوٹل کے اسٹاف میں سے ایک شخص نے دیکھا تو اُس کے پیچھے بھاگا کہ صاحب اس وقت اس موسم میں ڈرائیونگ کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ وہ تیزی سے بھاگا تھا اپنی جھونک میں گرا تو درد سے کراہ کے رہ گیا۔ اب اُسے اپنی فکر تھی شاہ زیب کا خیال بھول گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہ کافی آگے آ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی اس موسم میں ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہیں غیر مرنی نفلطے پہ مرکوز تھیں اور کانوں میں ماڑہ کی آواز گونج رہی تھی۔ ”پلیز اپنے اندر مردانگی پیدا کریں۔ باسط کو دیکھ لیں وہ ایک مکمل مرد ہے۔ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ خالہ میرا رشتہ مانگ رہی تھیں پر امی ابو عمر چچا کو زبان دے چکے تھے درنہ آج حالات کچھ اور ہوتے.....“ اُف۔ شاہ زیب کے لیے ان آوازوں سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔ ”ماڑہ باسط کو مکمل مرد قرار دے رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ وہ مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ تو یہ بات یہ خوبی یا وصف جو بھی ہے ماڑہ کے علم میں کیسے آیا ہے۔ اُسے کیسے یہ بات پتہ چلی ہے کہ باسط مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ کیا وہ باسط کے ساتھ اُس کا موازنہ کر رہی تھی جو کہہ رہی تھی باسط میں بھی۔ تو کیا مجھ میں مردانگی کم ہے جو ماڑہ کہہ رہی تھی کہ باسط مردانگی میں بھی بڑھ کر ہے۔ گویا باسط مردانگی میں شاہ زیب سے بازی لے گیا تھا جو اُس کی محبوب بیوی جسے شاہ زیب نے شادی کے بعد بھی محبوبہ کے رتبے پہ فائز رکھا تھا اُس باسط کی اپنے کزن کی اُس کے سامنے اپنے شوہر کے سامنے مردانہ اوصاف گنوار ہی تھی۔

ایسا کیوں تھا کیا ماڑہ اُس سے ناخوش تھی؟ یہ ایسا روح فرسا سوال تھا کہ شاہ زیب کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔ وہ خود سے ایک ہی سوال کر رہا تھا کیا مجھ میں کوئی کمی ہے؟ ماڑہ جس طرح لڑائی کے موڈ میں بھری بیٹھی تھی شاہ زیب اُس سے بچنے اور دل دو ماغ میں لگی آگ سرد کرنے کے لیے منظر سے ہٹا تھا۔ کیونکہ ماڑہ لڑائی کے موڈ میں ہوتی تو بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی تھی۔ ہمیشہ وہ خاموش ہوتا۔ اس بار بھی اُس نے ہار مان لی۔ اور وہاں سے اُٹھ آیا۔ ماڑہ تب بھی اُونچا اُونچا بول رہی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی شاہ زیب سے نہیں پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو مت جاؤ۔ موسم ٹپا ہے۔ ایسے موسم میں یہاں خطرناک حادثے رونما ہونا عام سی بات تھی۔ پر ماڑہ کو شاہ زیب کی پروا ہوتی تو ناں۔ اُس نے تو اپنی ساری نفرت اور کڑواہٹ اُس پہ اندیل دی تھی۔ یہ خیال کیے بغیر کہ شاہ زیب پہ کیا گزر رہی ہے۔ یا اُس پہ آئندہ آنے والے وقت میں کیا گزرے گی۔

بارش تیز ہو گئی تھی۔ شاہ زیب بغیر سوچ سمجھے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اُسے اس دقت کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے کیوں جا رہا ہے کس طرف جا رہا ہے۔

اُس کا سارا وجود گویا سماعت بنا ہوا تھا اور ایک ایک عضو ماڑہ کی آواز جیسے سن رہا تھا۔ اب تو بارش، پہاڑ اور ان پچھایا اندھیرا، شور مچاتا دریا نے نیلم بھی اُسے یہی سرگوشیاں کر رہا تھا کہ پلیز خود میں مردانگی پیدا کرو۔ باسط تم سے مردانگی

میں بڑھ کر ہے۔ تم میں مردانگی اور عزت نفس کی کمی ہے۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا ہا۔ شاہ زیب تم میں مردانگی کی کمی ہے۔ مردانگی کی کمی ہے اور ساتھ غیرت کی بھی کمی ہے اگر تم میں غیرت کی کمی نہ ہوتی تو آج تمہاری محبوب بیوی تمہارے سامنے اپنے شوہر کے سامنے ایک غیر مرد کی تعریف نہ کرتی اور تعریف کی بھی تو مردانگی کی۔۔۔۔۔ شاہ زیب کو یوں لگ رہا تھا اس دادی کی ہر چیز اُس کا مذاق اُڑا رہی ہے اُس پہ طنز کر رہی ہے۔ اُسے بے غیرتی کا طعنہ دے رہی ہے۔ ”میں بے غیرت نہیں ہوں میں مکمل ہوں۔“ اُس نے بہت اونچی آواز میں خود کلامی کی تھی مگر ریائے نیلم اور اُس کے متوازی چلتی سڑک بھی اُس پر نہیں پڑی تم میں مردانگی نہیں ہے تم میں غیرت بھی نہیں ہے۔“ ”ہے ہے مجھ میں غیرت۔“ اُس کے ہاتھ سے اسٹیرنگ ویل پھسل گیا۔ اُس کی ہاتھوں میں کمی آگئی تھی۔ سخت سردی میں شاہ زیب کا سارا وجود پسینہ اُگل رہا تھا۔ نئی تو اُس کی آنکھوں میں بھی تھی۔ ”میں بے غیرت نہیں ہوں نہیں ہوں بے غیرت مکمل مرد ہوں۔“ اُس نے پاگلوں کی طرح چیخ کر پوری قوت سے کہا۔ غصے کے عالم میں اسٹیرنگ ویل اُس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ آنکھوں میں اچانک آنے والی نمی نے اُسے عارضی طور پر سامنے کا منظر دیکھنے سے محروم کر دیا تھا کیونکہ آنکھیں دھندلا رہی تھی۔

یہ عارضی دھندلاہٹ موت کا خاموش پیغام ثابت ہوئی۔ پہاڑی علاقوں میں ذرا سی غلطی زندگی سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیتی ہے۔ گاڑی اچانک اُچھل کر اُس کے قابو سے باہر ہوئی اُس کے اگلے ویل چند ثانیے کے لیے ہوا میں معلق ہوئے۔ پھر سب کچھ شاہ زیب کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سڑک کی اُس سمت گہری کھائی تھی۔ یہاں قدم قدم پہ ایسی بے شمار سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔ جو ذرا سی بھول چوک یہ جان لینے میں دیر نہیں لگاتی تھیں۔ گاڑی کا اگلا حصہ نیچے کی طرف جھکا۔ شاہ زیب نے دیوانہ وار گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کی طرف نکلنے کی کوشش کی۔ یہ اُس کی بیوقوفی تھی سامنے خلا تھا۔ پل بھر میں گاڑی کا پچھلا حصہ نیچے کی طرف جھکا۔ اُس نے ایک زبردست سا ہچکولا لیا۔ تب تک شاہ زیب بھی دروازہ کھول چکا تھا۔ پر اُس وقت تک زندگی موت سے ہار چکی تھی۔ گاڑی بہت تیزی سے نیچے کھائی کی طرف جا رہی تھی۔ اب شاہ زیب کی سماعتوں میں کوئی آواز نہیں تھی۔ سب کچھ خاموش ہو چکا تھا۔ گہرا سناٹا تھا۔ نیچے کھائی میں بہت گہرا اندھیرا تھا۔ اس سے بھی گہرا اندھیرا شاہ زیب کے وجود پہ اُتر رہا تھا۔ اُس کی گردن کی ہڈی نوٹ چکی تھی ناگلوں کا تو قیام بن گیا تھا۔ اُسے کسی قسم کی طبی امداد کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ موت نے ہر ضرورت سے اُسے بے نیاز کر دیا تھا۔ اندھیرے میں کسی نے بھی یہ حادثہ رونما ہوتا نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

ماڑھ کبیل اوڑھے مزے سے لیٹی ہوئی تھی۔ شاہ زیب کو گئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو رہا تھا۔ اُس کی واپسی کے آثار ہی نہیں تھے۔ اُس نے کبیل پرے پھینکا، جوتے پہنے اور کمرے سے باہر نکلی۔ پتہ نہیں وہ کہاں تھا۔ ماڑھ کا خیال تھا شاید ہوٹل میں ہی کہیں بیٹھا ہو۔ چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ اُس نے ممکنہ جگہوں پہ دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ وہ ریہیشن کی طرف آگے کہ شاہ زیب وہاں سے کچھ معلومات مل جائے۔ ”پریشانی اب اُس کے چہرے سے ہو رہی تھی۔ ریہیشن پہ موجود لڑکا فوراً بھانپ گیا کہ کوئی بات ہے۔“ ”میرے ہر بیٹا ایک گھنٹے سے غائب ہیں ان کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں بنے ہوٹل میں بھی دیکھ لیا ہے وہ نہیں ہیں۔“ ”وہ کہاں گے ہیں کچھ بتایا نہیں؟“ ”نہیں اصل میں وہ کچھ غصے میں تھے اس لیے کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے یہی سوچا کہ جب ان کا غصہ ختم ہوگا تو آجائیں گے مگر۔۔۔۔۔ ماڑھ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ اُسے اپنے میں کچھ اور لوگ بھی اُس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اُن میں ہوٹل کے اسٹاف کا وہ لڑکا بھی تھا جس نے شاہ زیب کو گاڑی سے لے

جاتے دیکھا تھا۔ وہ یہاں ٹھہرنے والے مسافروں کو جانتا تھا کیونکہ چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ ”میڈم آپ کے شوہر نے براؤن کلر کی جیکٹ تو نہیں پہنی تھی۔“ ”ہاں ہاں یہی کھرتھا۔“ ماڑھ بے قراری سے بولی۔ ”میں نے اُنہیں پارکنگ سے گاڑی نکال کر سڑک پہ لے جاتا دیکھا تھا اور اُن کے پیچھے بھاگا بھی کہ صاحب اس موسم میں ڈرائیونگ مت کریں۔ مجھے پتھر سے چوٹ لگی میں دہیں گر گیا اتنے میں گاڑی دور جا چکی تھی۔“ اُس لڑکے نے تفصیل سے بتایا اور جا کے ہوٹل کے منیجر کو بھی بلا لایا۔ وہ خود ماڑھ کے ساتھ پارکنگ لائٹ تک گیا کہ دیکھے آیا اُن کی گاڑی یہاں موجود ہے کہ نہیں۔ گاڑی یہاں ہوتی تو ملتی ہاں۔ وہ اس وقت سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں مڑی مڑی حالت میں پڑی تھی۔ گاڑی کو یہاں نہ پا کر ماڑھ کی پریشانی حد سے سوا ہوگی۔ اب وہ کمرے تو کیا کرے۔ ”میڈم آپ کچھ دیر اور دیکھ لیں ہو سکتا ہے آپ کے شوہر واپس آجائیں۔“ ہوٹل کے ادھیڑ عمر منیجر نے اُسے تسلی دی۔ پروسو سے ماڑھ کے دل دماغ میں بیچنے گاڑ کے بیٹھ چکے تھے۔

وہ جا کے ہوٹل کی لابی میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ریسیٹ وائچ پہ ناٹم دکھتی۔ کچھ اور لوگ بھی اُس سے شاہ زیب کے بارے میں معلوم کر رہے تھے کہ آپ کے شوہر واپس آئے ہیں کہ نہیں۔ ہوٹل میں مقیم اکثر مسافروں کو معلوم ہو چکا تھا۔ منیجر خود اُسے کتنی بارتسلی دے چکا تھا۔ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں آگے کی طرف جا رہی تھیں۔ ماڑھ کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ آج تک شاہ زیب اس طرح ناراض نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ تو اُس سے ناراض ہوتا ہی نہیں تھا۔ اپنی غلطی ہوتی یا نہ ہوتی ہمیشہ ماڑھ کو وہی راضی کرتا۔ لڑائی کی ابتداء ہمیشہ ماڑھ کی طرف سے ہوتی۔ وہ ہنس ہنس کے اُس کی کڑوی کسلی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا۔ اور اس طرح ناراض ہو کر وہ کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔ اور یہاں وہ گھر سے دور ایک اجنبی جگہ پہ اُسے اکیلا چھوڑ کر غائب تھا۔ اس لیے وہ بہت پریشان تھی۔ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ ہوٹل والے رات کا کھانا سرو کر چکے تھے۔ ماڑھ سے مزید انتظار برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پھر ریہیشن کی طرف چلی آئی۔ ”میرے ہر بیٹا ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ منیجر سے کہیں کچھ کریں۔“ وہ رد ہانسی ہو رہی تھی۔ کچھ مرد اُسے ترس آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ سب کو پتہ تھا کہ اس لڑکی کا شوہر دو گھنٹے سے گاڑی لے کر غائب ہے۔ وقتاً فوقتاً سب نے ہی ہمدردی جتائی تھی۔ منیجر بہ نفس نفیس اُس کے پاس خود چل کر آیا۔

”میڈم مجھے لگتا ہے کہ خدا نخواستہ آپ کے شوہر کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ ہم کچھ لوگوں کو اُن کی تلاش میں روانہ کر رہے ہیں آپ فکر مت کریں۔ انشاء اللہ وہ واپس آجائیں گے۔“

منیجر نے اُسے کھوکھلی تسلی دی۔ اپنی کہی بات کا اُسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ کیونکہ ہوٹل کے جس لڑکے نے شاہ زیب کو گاڑی لے جاتے دیکھا تھا اُس نے کہا تھا کہ صاحب لوگ بہت تیز اور غیر ذمہ داری سے گاڑی لے کر گیا ہے۔ کچھ تجربہ کار لوگ جو ان علاقوں سے اچھی طرح واقف تھے وہ شاہ زیب کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ ماڑھ دعا کرتی تھی کہ شاہ زیب ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہو۔ گھر سے دور اس اجنبی جگہ سے اُسے اپنے اکیلے پن سے ڈر لگ رہا تھا۔ شاہ زیب کے ساتھ اُسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ کچھ عورتیں بھی جو اُس کی طرح گھومنے پھرنے کی غرض سے آئی ہوئی تھیں۔ اُس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ اُسے تسلی دینے لگیں۔

شاہ زیب کی تلاش میں گئے لوگ ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ کافی دیر ہو گئی تھی۔ اب تو منیجر خود بھی پریشان ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ کمروں کے دروازے بند ہونے لگے۔ ہوٹل میں مقیم لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ماڑھ کے ساتھ اب صرف ایک ہی عورت تھی باقی اُنٹھ کے چلی گئی تھی۔

امدادی پارٹی واپس آگئی تھی۔ شاہ زیب کی تلاش میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ ایک تو رات تھی اوپر سے بارش پھر خراب راستہ۔ گاڑی تو گاڑی پیدل چلنے والوں کے لیے بھی اس وقت باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جو لوگ شاہ زیب کو ڈھونڈنے گئے تھے وہ برسوں سے ان علاقوں میں آباد تھے۔ یہاں کے چپے چپے کے بارے میں جانتے تھے۔ انہوں نے ممکنہ جگہوں پہ دیکھا تھا۔ نہ تو شاہ زیب اور نہ اُس کی گاڑی کی جھلک نظر آئی تھی۔ سب کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ شاہ زیب یقیناً کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

انہوں نے واپس آ کر ہوٹل کے منیجر کو اپنی ناکامی کی اطلاع دی۔

مایوسی اُن سب کے چہرے پہ صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ وہ ماڑہ کے پاس آیا جو پریشانی سے کسی اچھی خبر کے انتظار میں تھی۔ منیجر کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہوگی۔ ”کچھ پتہ چلا۔“ ”نہیں ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ لگتا ہے کہ شاہ زیب صاحب کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔“ صاف جواب سن کے ماڑہ کے چہرے کے تاثرات رونے والے ہو گئے۔ ”لیکن فکر نہ کریں ہم صبح ہوتے ہی پھر سے تلاش کا کام شروع کریں گے۔ ابھی یہ کام ناممکن ہیں۔“ ماڑہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔

☆☆☆

عمر زیب بار بار دیوار گیر گھڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاہ زیب روزانہ ایک مخصوص وقت میں انہیں پنی۔ سی۔ او سے فون کرتا تھا۔ نمبر اُس نے نوٹ کر دیا تھا۔ انہوں نے دوبار خود کال کر کے شاہ زیب کا پوچھا مگر پنی۔ سی۔ او کے مالک نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اُس کے پاس روزانہ فون کرنے بہت سے لوگ آتے تھے۔ وہ کس کس کو یاد رکھتا۔ ذہلی شام کے سائے اپنے پڑ پھیلا رہے تھے۔ شاہ زیب اٹھ کے باہر کی طرف بڑھے تو اُن کے سینے میں درد سا اٹھا۔ ایک عجیب سا کرب اور اضطراب اُن کے پورے وجود پہ طاری ہو چکا تھا۔ اپنی اس حالت کی سمجھ انہیں خود بھی نہیں آ رہی تھی۔ انہیں خود بہ خود ہی جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے کسی انہونی کا احساس دلایا تھا۔ درد و کرب میں ڈوبی آواز میں انہوں نے دریکتا کو آواز دی۔ وہ دہل سی گئی۔ پپا نے کبھی اُسے اس طرح نہیں پکارا تھا۔ فوراً بھاگی بھاگی آئی ”جی پپا“ عمر زیب کا چہرہ تکلیف کی وجہ سے زرد سا ہو رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔

”پپا کیا ہوا ہے“ دریکتا نے انہیں دونوں کندھوں سے تھام کے پاس پڑی کرسی پہ بٹھایا اور پانی گلاس میں ڈال کے لے آئی۔ چند گھونٹ پی کے انہوں نے گلاس منہ سے ہٹا دیا۔ ”پپا ڈاکٹر عظیم کو فون کر دو آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے شاہ زیب کی طرف سے پریشانی لگی ہوئی ہے ابھی تک اُس نے کال نہیں کی ہے۔ میں کس سے رابطہ کر کے پوچھوں کیونکہ وادی نیلم میں میرا دور دور تک کوئی جانتے والا نہیں ہے۔“ وہ بے بسی سے سر پکڑے بیٹھے تھے۔ ”پپا ہو سکتا ہے کہ بھائی بھول گیا ہو۔“ ”نہیں نہیں وہ بھول نہیں سکتا۔ اس بار جب وہ جانے سے پہلے مجھ سے ملے آیا تو اُس کے تیور بھولنے والے نہیں لگ رہے تھے۔“ انہوں نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ”پپا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بھائی کو کوئی پر اہم نہ ہو گئی ہو۔“ دریکتا اُن کے بدترین خدشے کو الفاظ کی صورت میں ڈھال چکی تھی۔ انہوں نے وحشت بھری نگاہوں سے اُس کی سمت دیکھا۔ وہ اب کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس کا امکان بھی تو بہر حال موجود تھا۔ ”ارے ماڑہ ہی کال کر دیتی ان لوگوں نے مجھے ہوٹل کا نمبر ہی نہیں دیا میں وہاں سے پتہ کر لیتا۔“ اب وہ غصے میں تھے۔ اُن کا حال بہت بے قراری لیے ہوئے تھا۔ ”پپا دیکھ لیں ابھی بہت ناممکن ہے

بھائی یا بھائی میں سے کوئی نہ کوئی کال کر دے گا۔“ وہ پورے یقین سے بولی تھی۔ وہ فقط سر ہلا کے رہ گئے۔ کبھی کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ کبھی دال کلاک پہ وقت دیکھ رہے تھے کبھی بیٹھ جاتے کبھی کھڑے ہو جاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُن کے اضطراب اور کرب میں بجائے کمی ہونے کے اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ ”اے میرے مولا میرے بچے کے بارے میں مجھے جلد از جلد آگاہ کر دے۔“ اُن کے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی تھی اور فوراً قبولیت کے ذمے پہ فائز ہوئی کیونکہ یہ ایک مضطرب باپ کے دل سے نکلی دعا تھی۔

عمر زیب کا سیل فون بجنا شروع ہو گیا۔ دریکتا نے اٹھا کے دیکھا کوئی اجنبی سالیڈ اسٹیمبر تھا۔ عمر نے اشارے سے فون مانگا۔ دریکتا نے اُن کرنے سے پہلے اُن کی طرف بڑھا دیا۔ انہیں پوری امید تھی کہ یہ فون کال شاہ زیب کے حال چال کے بارے میں انہیں کوئی آگاہی دینے والی ہے۔ انہوں نے بے تابی سے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ماڑہ تھی۔ اُن کے دل کو جیسے کسی نے اچانک تیز دھارا آ لے سے چیر ڈالا تھا۔ ماڑہ رو رہی تھی۔ ”عمر چچا شاہ زیب کافی دیر سے گاڑی لے کے نکلے ہوئے ہیں ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔ ہوٹل کے منیجر نے اپنے کچھ لوگ شاہ زیب کی تلاش میں روانہ کیے وہ ابھی واپس آئے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں چلا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ شاہ زیب کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہیں اب وہ صبح ہونے پہ ہی دوبار تلاش کا کام شروع کریں گے۔“ اُس نے روتے روتے بتایا تھا۔ عمر زیب کے ہاتھ سے سیل فون چھوٹ کے نیچے کارپٹ پہ گر گیا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ ماڑہ نے اتنا کچھ بتایا تھا وہ ایک لفظ تک نہیں بولے تھے۔ دریکتا نے ایک نظر پپا کی طرف اور دوسری نظر سیل فون پہ ڈالی۔ گرنے کے باوجود رابطہ بحال تھا۔ اُس نے فون کان سے لگا لیا۔

اُس کی سماعتوں سے ماڑہ بھابھی کی جانی پہچانی آواز نکرائی۔ ”بھابھی مجھے بھی تو بتائیں کیا ہوا ہے۔“ وہ گاہے بگا ہے پپا کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔ جو فون سننے کے بعد بالکل خاموش تھے۔ ماڑہ بھابھی نے جو کچھ بتایا اُسے سننے کے بعد دریکتا کو بھی پپا کی طرح چپ لگ گئی۔ وہ اُن کے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ ”پپا آئیں اپنے کمرے میں چلیں۔“ نہیں میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ دریکتا کو یوں لگا جیسے یہ آواز پپا کے منہ سے نہیں نکلی ہے۔ وہ بہت سرد اور بے حس سے لگ رہے تھے۔ جیسے یہ اُس کے پپا نہ ہوں اُن کے بھیس میں کوئی اور ہو۔

ماڑہ اپنے والدین کو بھی کال کر کے بتا چکی تھی۔ کیونکہ پندرہ سنٹ گزرنے کے بعد بتایا اور نگریب شریں تالی، ماڑہ کی چھوٹی بہن اور بھائی اُن کے گھر چلے آئے۔ شریں بیچد پریشان تھی۔ ماڑہ انہیں بتانے کے دوران مسلسل روتی رہی تھی۔ اور نگریب کا بھی یہ حال تھا۔ وہ رات اُن سب نے جاگ کے اکٹھے ادھر ہی گزار دی۔ کسی نے ایک پل بھی آنکھ نہیں چھپکی تھی۔ ایسے عالم میں نیند آنی بھی کس کو تھی۔ عجیب تکلیف اور اذیت سے بھری رات تھی۔ اُن سب کا دکھ مشترک تھا اس لیے دلوں کے فاصلے جو کچھ عرصہ قبل اچانک در آئے تھے خود سے ہی ختم ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ماڑہ کی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے لگی تھی اور پھر خود ہی کھل گئی تھی۔ اُس نے بہت بُرا خواب دیکھا تھا۔ نیند کے مختصر سے وقفے کے دوران اُس نے خواب بھی دیکھا لیا تھا۔ اُس کے بعد اُس سے سویا ہی نہیں گیا۔ رات گزر رہی نہیں رہی تھی۔ بڑی مشکل سے انتظار کے بعد صبح ہوئی۔

شاہ زیب کی تلاش میں ایک تجربے کار امدادی پارٹی روانہ ہو گئی تھی۔ ماڑہ اپنے کمرے سے اٹھ کے باہر ہوٹل

☆☆☆

سڑک کے بائیں جانب امدادی پارٹی کے طارق کوشیٹے کے ٹوسٹے ہوئے بہت سارے ٹکڑے نظر آئے۔ اُس نے چیخ کے اپنے دوسرے ساتھی کو بھی آواز دی۔ سڑک کے بائیں جانب گہری کھائی تھی اُس کے کنارے پہ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اُنہیں جھاڑیوں میں اُسے پھنسی ہوئی گاڑی کی لائٹ نظر آئی۔ اُس نے سڑک کے کنارے بیٹھ کے وہ ٹوٹی ہوئی لائٹ کا ٹکڑا باہر نکالا اتنے میں اُس کا دوسرا ساتھی بھی اُس کے قریب پہنچ گیا۔

”کیا بات ہے طارق۔“ اُس نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ دیکھو گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے ٹکڑے ملے ہیں میرا خیال ہے کہ گاڑی اسی کھائی میں گرنی ہے یہ بہت گہری ہے۔ تم باقی ساتھیوں کو بھی فوراً بلاؤ اور کھائی میں اترنے کا انتظام کرو میں اتنے میں ہونٹ جا کے اطلاع کرتا ہوں نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ بد قسمت نوجوان اسی جگہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہوگا۔“ وہ اپنے دوسرے ساتھی سے بات کر رہا تھا۔ طارق ہونٹ آ گیا اور نیچر کو مطلع کیا ساتھ وہ ٹوٹی ہوئی ہیڈ لائٹس کے ٹکڑے بھی دکھائے۔ نیچر خود اُس کے ساتھ وہاں پہنچ گیا جہاں سے وہ گاڑی کی لائٹس کے ٹکڑے ملے تھے۔ اُسے تاسف سا ہوا، اُس نے سڑک سے آگے گہری کھائی میں جھانک کے دیکھا مگر گہرے لامتناہی اندھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ طارق کی طرح اُس کا دل بھی کہہ رہا تھا کہ شاہ زیب نامی نوجوان مردہ حالت میں اسی کھائی کی تہہ میں موجود ہے۔ طارق کے ساتھی اپنے کام کا آغاز کر چکے تھے۔

شدید جاں توڑ محنت کے بعد انہیں کامیابی نصیب ہوئی مگر انہیں اس کامیابی کی خوشی نہیں ہوئی۔ کیونکہ شاہ زیب کا مردہ وجود کھائی کی تہہ میں موجود تھا۔ بہت مشکل سے باہر نکالا گیا۔ لاش کی حالت خراب تھی۔ اُس کے چہرے پر اذیت اور حسرت رقم تھی۔ اُن لوگوں نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیے خاص طور پہ نیچر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیسا بانکا جیلا نوجوان تھا۔ جسے موت کے بے رحم ہاتھ مٹی میں ملا گئے تھے۔

☆☆☆

اب تمہیں کیا بتائیں ہم کیسے تمہیں دکھائیں  
سننے میں کیا اتر گیا  
آنکھ پہ کیا زرگی

اور یہ کہ

اب کیسے جاری رکھوں سفر کہ وہ کھو گیا ہے  
مجھے چلتے رہنے کا حوصلہ دے کر

مزید یہ کہ

رات باقی تھی جب وہ پھڑا تھا

عمر بیتی ہے رات باقی ہے

عمر زیب ٹکر ٹکر ایک ایک کے منہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صبح سے سب ایک ہی بات کر رہے تھے کہ شاہ زیب

چلا گیا ہے شاہ زیب چلا گیا ہے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اُن کا پورا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اُن کا اپنا حلقہ احباب

ناخدا دستغیب تھا۔ شاہ زیب کے دوست، ملنے جلنے والے اور نگریب کے توسط سے آئے ہوئے لوگ۔ عرضیکہ ایک ہجوم تھا لوگوں کا۔ اور اس ہجوم کے بیچ عمر زیب ایک واحد ایسے شخص تھے جن کی آنکھوں سے ایک آنسو تک نہیں ٹپکا تھا۔ وہ سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور نگریب بھائی کا چہرا، شریں بھائی کا چہرا، بارہ کا چہرا اور تو اور ان چہروں کے درمیان ہارون اور نوید بھائی کا چہرا بھی تھا۔ اُن کی آنکھیں شدت گریہ سے لال تھیں۔

ظاہر لغاری بھیڑ سے بچتے بچاتے عمر زیب تک پہنچنے جواب بھی غائب دماغی کی حالت میں لوگوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ ”میرے دوست رو لے۔ ایک بار جی بھر کے رو لے۔ ورنہ یہ رُکے ہوئے آنسو تیرے اندر آگ لگا دیں گے۔“

اس زہر کو آنکھوں کے راستے باہر نکال دو۔ دیکھو تھوڑی دیر میں شاہ زیب کو قبرستان لے جانے والے ہیں سب لوگ۔ اٹھو اپنے لالہ کا دیدار کر لو۔ آخری بار۔ پھر اُسے کبھی نہیں دیکھ پاؤ گے تم۔ وہ پھڑ گیا ہے ہم سب سے۔ عمر تم نے سنا وہ پھڑ گیا ہے ہم سب سے۔ ظاہر لغاری نے اُس کے کندھے بڑی طرح جھنجھوڑا لے۔ اُس کی حالت میں سر مو کوئی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوئی۔ اپنی خالی دیران آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ شاہ زیب کا بے جان لاشہ اُس کی نگاہوں کے سامنے ہی تو گاڑی سے اُتارا گیا تھا۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے کہ شاہ زیب کی گاڑی وادی نیلم میں ایک کھائی میں گر گئی تھی اور وہ زندہ نہیں بچا۔ لاش کی حالت بہت بُری ہے اس طرح کی اور کتنی باتیں تھیں جو لوگ عمر زیب کے سامنے کر رہے تھے مگر اُن پہ کوئی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ نہ چیخے نہ چلائے نہ روئے نہ فریادیں کیں بس خاموشی سے سارا منظر دیکھتے رہے۔ شاہ زیب اُچلی چادر والی چار پائی پہ اُن کے سامنے ہی تو سویا ہوا تھا۔ باقی جسم کے مقابلے میں اُس کے چہرے کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے چہرہ کفن سے باہر تھانی الحال۔

عمر زیب کو اتنا یاد تھا کہ شاہ زیب گھومنے پھرنے کے لیے وادی نیلم گیا ہوا ہے۔ بس انہیں ایک بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب وہ گھومنے پھرنے کے لیے گیا تھا تو ابھی اُن کے سامنے کیونکر لیٹا ہوا تھا۔ نہ بول رہا تھا نہ مل رہا تھا نہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ ایک جگہ پہ ساکت تھا۔ انہوں نے جی ہی جی میں اُسے کتنی بار پوچھا تھا کہ تم کیوں لیٹے ہوئے ہو۔ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہے۔ تمہارے لب خاموش کیوں ہیں۔ میں نے پوری رات تمہاری فون کال کا انتظار کیا ہے سویا نہیں ہوں۔ تم ناراض ہو مجھ سے کس بات پہ۔ بتاتے کیوں نہیں۔ میں نے تمہاری ساری ضدیں پوری کی ہیں اگر تم نے اپنی کوئی اور ضد منوانے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے تو بتاؤ میں تمہاری اور ضد بھی پوری کر دوں گا۔ تم اٹھو اور چپکے سے میرے کان میں کہہ دو۔ ہاں ہاں شاہ باش بول دو ناں اپنے پیاسے بول دو۔۔۔۔۔

پر شاہ زیب نہیں بولا نہ اُس کے ساکت لب بولے۔ انہوں نے اب چیخ چیخ کے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ ”شاہ زیب بولو جواب دو میں تم سے پوچھ رہا ہوں ناں کیوں نہیں بولتے۔“ انہوں نے اُچلی چادر والی چار پائی پہ سائے ہوئے شاہ زیب کو اچانک دونوں کندھوں سے پکڑ لیا۔ ظاہر لغاری اور اور نگریب دونوں بیک وقت اُن کی طرف بڑھے اور بمشکل تمام شاہ زیب کے کندھے اُن کی گرفت سے آزاد کرائے۔ ”دیکھو نہیں بولتا نہیں جواب دے رہا میری بات کا نافرمان ہو گیا ہے تم لوگ اسے بات کرو ناں کہ میری بات کا میرے سوالوں کا جواب دے۔“ ظاہر لغاری کا کلیجہ اپنے عزیز دوست کو اس حال میں دیکھ کے جیسے منہ کو آنے لگا۔ شاہ زیب کی جوان حسرت ناک موت نے عمر زیب سے اُس کے حواس چھین لیے تھے۔ وہ اب حواس اور ہوش سے عاری ایک شخص تھا جنہیں یہ پتہ تک نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں کیوں کر رہے ہیں۔ عمر زیب پاگل ہو گیا تھا۔ شاہ زیب کا جنازہ اٹھایا جانے لگا تو تین مردوں نے عمر کو اپنی گرفت میں

جلز لیا وہ بار بار شاہ زیب کے بے جان جسم کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسے پوچھو ناں کیوں نہیں بولتا جواب کیوں نہیں دیتا میری بات کا..... وہ بار بار یہی سوال کر رہے تھے شاہ زیب اس قابل ہوتا تو بولتا ناں۔ وہ اپنے ابدی سفر پہ روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

شاہ زیب کو اُس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے سب مرد گھر لوٹ آئے تھے۔

ظاہر لغاری اور اشعر بھی عمر زیب کے گھر ہی تھے۔ عمر کی ذہنی و جسمانی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اشعر ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔ اُس نے عارضی طور پہ عمر زیب کو انجکشن لگایا اور سپینگ پلزدس۔ فی الحال نیند اُن کے لیے اچھی تھی۔ ڈاکٹر نے جاتے جاتے گھر والوں سے کہا کہ عمر زیب کو فوراً کسی دماغی معالج کو دکھائیں ورنہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی ذہنی حالت ابتر ہوتی جائے گی۔ دریکتا، ماڑہ کو تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا باقی عورتیں اندر پر سدہ سینے والوں کے پاس بیٹھی تھیں۔ اشعر نے زبردستی عمر زیب کو دودھ کے ساتھ نیند کی گولی دی۔ اُس نے سارا دن ادھر ہی گزارا تھا۔ خاصی بھاگ دوڑ کی تھی۔ اب تھا کہ ہوا تھا اپنے گھر جا کے آرام کرنا چاہتا تھا۔ پاپا ادھر ہی تھے وہ اپنی گاڑی لے کے واپس آ گیا۔

بند پہ سونے کے لیے لیٹا تو آج کے دن کے سارے واقعات نگاہوں میں پھرنے لگے۔ شاہ زیب کی موت کا اُسے بھی بہت زیادہ دکھ تھا۔ دریکتا کو اُس نے پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھا تھا وہ لڑکی سارا دن روتی رہی تھی۔ اشعر نے سوچا پتہ نہیں ان لڑکیوں کی آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے آجاتے ہیں جو تھکتی ہی نہیں ہیں۔ دریکتا کو پھوٹ پھوٹ کے روتے دیکھ کے ایک بار اُس کے جی میں آئی تھی کہ اُسے چپ کروادے۔ پر وہ اس پہ عمل نہیں کر پایا تھا۔ وہ اس کے بعد عورتوں کے ہجوم میں کہیں گم ہی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

شریں نے ماڑہ کو زبردستی تھوڑا کھانا کھلایا۔ وہ کل سے بھوکے پیٹ تھی۔ ایک کھیل تک اُس کے منہ میں نہیں آئی تھی۔ ساتھ اُس کی طبیعت بھی عجیب گری گری سی ہو رہی تھی۔ کچھ کھانے کے دل چاہتا بھی نہیں تھا اور دودن سے بھوک ویسے بھی مری ہوئی تھی۔ شریں کی ساری توجہ ماڑہ پہ مرکوز تھی۔ دریکتا کی طرف اُس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ غم کا پہاڑ تو اُس پہ بھی ٹوٹا تھا۔ جوان بھائی کی جدائی کا صدمہ اُس نے بھی جھیلا تھا۔ شریں ماڑہ کی ماں تھی اُس کی تو نہیں تھی جو اُس کے لیے فکر مند ہوتی۔ فوزیہ چچی نے ایک بار اُسے کھانے کا پوچھا اُس کے نفی میں سر ہلانے پہ دوبارہ نہیں کہا۔ اُس کا بی بی کمزوری کی وجہ سے لوہور ہا تھا۔ چکر آ رہے تھے جہاں بیٹھی تھی ٹیک لگا کے وہیں سو گئی۔ دنیا کے ہنگامے اپنی جگہ تھے۔ سب اپنے اپنے معمول کے کام کرنے لگے کب تک شاہ زیب کا غم مناتے یا اُسے روتے۔

شریں نے جوں بنا کے زبردستی ماڑہ کو پلا یا پینے کے فوراً بعد اُس کا جی متلانے لگا اور وہ واش بیسن کی طرف بھاگی۔ سب جوں معدے سے باہر آ گیا تھا۔ شریں اُس کے پاس موجود نہیں تھی۔ ماڑہ نے منہ ہاتھ دھویا اور آ کے بیڈ پر لیٹ گی۔ اُس میں تو جیسے کوئی طاقت اور توانائی ہی نہیں رہی تھی۔ دن بہ دن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

عمر زیب کو ظاہر لغاری باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے۔ یہ بات اورنگ زیب اور نوید کے ساتھ ہارون کو بھی ایک آنکھیں نہیں بھائی تھی۔ ظاہر لغاری کو ناپسند کرنے والوں میں شریں بھی تھی۔ وہ روز عمر زیب کا پتہ کرنے آتے اُس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔ کیونکہ گھر میں کسی اور کو اس کا چنداں

احساس نہیں تھا کہ عمر زیب کی ذہنی حالت کے پیش نظر مکمل علاج اور سکون کی ضرورت۔

☆☆☆

شاہ زیب کے انتقال کو چالیس دن گزر چکے تھے۔ عمر زیب کے سارے بی بی بھابھیاں ابھی تک شہر میں ان کے گھر میں تھے۔ سب اس طرح رہ رہے تھے کہ برسوں سے اس گھر کے رہائشی ہوں۔ دریکتا خود کو اپنے ہی گھر میں اجنبی اور اوپر اُد پر اسما محسوس کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

ماڑہ کی طبیعت آج بہت خراب تھی صبح سے دل بیزار سا تھا اور متلی والی کیفیت تھی۔ شریں نے اُسے کہا کہ تیار ہو جاؤ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ جو اب ماڑہ نے کہا کہ ڈاکٹر عظیم کو کال کر دیں وہ خود گھر آ جائیں گے۔ ڈاکٹر عظیم نہ صرف عمر زیب کے بہت اچھے دوست تھے بلکہ ایک طرح سے اُن کے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ شریں کو کچھ اور شک تھا پر ماڑہ کے کہنے پہ اُس نے ڈاکٹر عظیم کو کال کر دی۔

وہ آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ گئے۔ ماڑہ کو چیک کرنے کے بعد اُنہوں نے شریں سے کہا کہ ماڑہ کو کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ وہ اپنے میڈیکل باکس سمیت روانہ ہوئے تو شریں ماڑہ کے سر پہ آکھڑی ہوئی ”تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔ ماڑہ چون و چراں کیے بغیر اُن کے ساتھ ہوئی۔

لیڈی ڈاکٹر نے چیک آپ کیا اور ماڑہ کے کچھ ٹیسٹ کرنے کے بعد خوشخبری سنائی کہ آپ کی بی بی امید سے ہے۔ شریں بظاہر خوش مگر اندر سے پریشان تھی۔ ”ماڑہ بات سنو گھر جا کے کسی سے اس بات کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو ڈاکٹر نے کہا۔ اس مصیبت کی کسر رہ گئی تھی۔ جو پوری ہو گئی ہے۔ مجھے تمہاری حالت دیکھنے پہلے ہی اس بات کا شک تھا۔ حیرت ہے تمہیں پتہ ہی نہیں چلا۔“ اُنہوں نے لگے ہاتھوں ماڑہ کو بھی جھاڑ ڈالا۔ وہ ڈاکٹر کی سنائی گئی خوشخبری کو مصیبت کہہ رہی تھی اور پریشان سی تھی۔ ماڑہ خاموشی سے ماں کی بات سنتی رہی۔ ”شاہ زیب خود تو مر گیا ہے اپنی نشانی تمہارے پیٹ میں زندہ چھوڑ گیا ہے۔“ شریں کا لہجہ اور انداز بہت ناقابل فہم تھا۔

”کیا مگر مجھے دیکھ رہی ہو۔ ہوش کے ناخن اور آنکھیں اور کان کھلی رکھو۔ میں تمہیں اتنا بوقت نہیں سمجھتی تھی۔ خیر میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔“ شریں نے اپنا غصہ اُس پہ نکالا۔ پھر وہ اُس کے کانوں میں کھسر پھسر کرنے لگی۔ اب بات ماڑہ کی سمجھ میں آ گئی تھی اور شریں مطمئن تھی۔ ”خیر یہ بتاؤ شاہ زیب کا بینک بیلنس کتنا ہوگا تم دونوں کا اپنا اپنا اکاؤنٹ تھا۔ وہ اب اُسے قدر دور ہو کے بیٹھ گئی۔ ”ہم دونوں کا اکاؤنٹ جو انٹ تھا میں نے بتایا بھی تھا آپ کو۔“ پھر اُس نے بینک اکاؤنٹ میں موجود رقم کی تفصیل بتائی۔ ”ہاں رقم تو اچھی خاصی ہے۔ تمہارے ابو بتا رہے تھے کہ بزنس ڈاؤن جا رہا ہے۔“ شریں یہ تفصیل دانستہ چھپا گئی کہ اُن کے شو ہرادر بیٹے کی نااہلی کی وجہ سے بزنس خسارے میں ہے۔ کتنے اداروں کا آرڈر وہ مکمل نہیں کر سکے تھے۔ اچھا خاصا قرضہ چڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

عدنان ہاشمی کا غذا اپنے سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ اورنگ زیب سمیت نوید اور ہارون بھی موجود تھے۔ ایک کونے میں عمر زیب بھی بیٹھے تھے پر اُن کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ عدنان ہاشمی نے کچھ قانونی تقاضے پورے کرنے تھے اس لیے اُن کے پاس آیا تھا۔ اُس نے دریکتا کے جھسے کی تفصیلات بتائیں۔ عمر زیب کے تمام کاروبار اس گھر اور دیگر جائیداد کا وارث

عمر زیب نے اُسے ہی بنایا تھا۔ یہ وصیت پرانی تھی جب عمر زیب نے شاہ زیب کا حصہ اُس کو دیا تھا تب اُنہوں نے دربار کے بارے میں بھی وصیت تیار کر لی تھی۔ شاہ زیب کی وفات اور عمر زیب کی ذہنی حالت کے پیش نظر عدنان ہاشمی نے خور اُن کے پاس آنے میں دیر لگائی تھی۔ عمر زیب کے بھائیوں اور بھائیوں کی موجودگی میں عدنان ہاشمی نے وصیت پڑھنے کے درمیان کو سنائی۔ اُسے دولت و جائیداد کی تفصیلات سے دلچسپی نہیں تھی۔ مگر اورنگزیب اور شریں سمیت باقیوں کی توجہ بھی اسی کی طرف تھی۔ ہارون اور نوید کے چہرے اتر گئے تھے وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید اُنہیں بھی کچھ مل جائے۔ اُن کے پاس اپنی دلچسپی خاصی جائیداد تھی پھر بھی اُن کی ہوس ختم نہیں ہو رہی تھی۔ حالانکہ عمر نے اپنی گاؤں والی زمین برابر برابر اُن تینوں بھائیوں کو بانٹ دی تھی۔ باقی عمر کے پاس جو کچھ تھا وہ آئندہ کا چھوڑا ہوا یا پھر اُس کی اپنی محنت تھی جس کے حقدار اُس کی بیٹی اور بیٹا تھا۔

☆☆☆

وکیل کے جاتے ہی شریں اور عمر زیب کو لے کر بیٹھ گئی۔ ”آپ نے دیکھا عمر بھائی نے شاہ زیب کے ساتھ کتنی زیادتی کی۔ درمیان کو اتنا کچھ دیا اور شاہ زیب کو بس تھوڑا بہت دے دلا کے خوش کر دیا۔“ وہ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہی تھی۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ شاہ زیب کا حصہ درمیان سے زیادہ ہی تھا۔ ”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ مارہ کے پاس اب صرف وہ گھر اور بینک بیلنس ہی بچا ہے۔“ اورنگزیب نظر چراگے تھے۔ شریں کو جیسے سانپ نے ڈنک مارا۔ ”اور وہ کروڑوں کا کاروبار وہ کس کا ہے۔“ وہ چمک کے بولی، کاروبار سمجھ لوٹھپ ہو گیا ہے شیرزنج کے قرضہ اُتارنا پڑے گا۔ اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا۔“

اورنگزیب اور اُن کے لاڈلے سپوت کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا۔ عاشر کارویہ اسٹاف کے ساتھ بہت جا کمانا تھا۔ شاہ زیب نے اُسے اختیار کیا دیا تھا وہ خود کو کسی اور سیارے کی مخلوق تصور کرنے لگا تھا۔

اس کے اس رویے کی وجہ سے اسٹاف میں بے چینی پیدا ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کو اکثر اپنے کاروبار کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی بھی جانا پڑتا۔ ایسی صورت میں عاشر تمام اُلٹے سیدھے فیصلے خود کرتا۔ رہی سہی کسر اورنگزیب نے گھنٹا میٹر خرید کر پوری کر دی تھی۔ شاہ زیب کے قائم کیے گئے نوزائیدہ کاروبار کو سخت دھچکے لگا تھا وہ دھڑام سے زمین بوس ہوا تھا۔ اورنگزیب اور عاشر اب بیٹھے بغلیں بجا رہے تھے۔ مارہ بھی اس صورتحال سے ناواقف تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ گھر کے ساتھ ساتھ کاروبار کی بھی تن تنہا مالک بن گئی ہے۔ بے شک کاروبار خسارے میں ہے پر کاروبار تو ہے نا۔ شریں اورنگزیب یا عاشر میں سے کسی نے اُسے نہیں بتایا تھا۔ شاہ زیب کی موت کے گرداب سے وہ نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔ کیونکہ شریں اُسے مستقبل پر نظر رکھنے پہ بار بار اصرار کر رہی تھی۔

”مارہ کو تو چتہ ہی نہیں ہے۔“ شریں نے شوہر کی توجہ اس نکتے کی طرف دلائی۔ ”ہاں اُسے میں کچھ دن تک بتا دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ مارہ کو اپنا گھر کرایے پہ دے دینا چاہیے۔ اپنا اچھا پوش علاقے میں بنا ہونا گھر ہے۔ کرایہ بھی اچھا مل جائے گا۔ ویسے بھی وہ وہاں اکیلی رہ تو نہیں سکتی۔“ ”ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں مارہ انکار نہیں کرے گی۔ آپ کو وہ گھر کرایے پہ دے دینا چاہیے۔“ چلو میں وہ کام بھی کر لوں گا۔ اب صورتحال کافی عجیب سی ہوگی ہے۔ عمر تو سمجھو آدھے سے زیادہ پاگل ہو گیا ہے۔ اُسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ اتنا بڑا کاروبار ہے۔ درمیان نازک سی لڑکی ہے وہ مردوں والے کام تو نہیں کر سکتی نا۔ میں کل عمر کی فیکٹری جاتا ہوں خود۔ اور سب دیکھتا ہوں۔ عمر میرا چھوٹا بھائی ہے میری ذمہ داری ہے اب سب مجھے ہی دیکھنا ہو گا نا۔ وہ بہت درد مندی سے بولے۔ شریں اپنے سرتاج کی عقل مندی پہ عیش عیش کر رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری آئے ہوئے تھے۔ آج اُنہوں نے عمر کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔ اورنگزیب سے سامنا ہوا تو انہوں نے سلام کیا۔ اُس نے بہت سرد مہری سے سلام کا جواب دیا۔ اور اُسے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ کافی دیر وہ اکیلے بیٹھے رہے۔ کسی نے آ کر ڈرائنگ روم میں جھانکا تک نہیں۔ وہ پہلے آتے تو کسی اپنے کی طرح عمر زیب اُنہیں کبھی بیڈ روم میں کبھی اسٹڈی روم میں بٹھالیتے۔ کسی قسم کا کوئی تکلف ہی نہیں تھا۔ جب سے شاہ زیب کی موت ہوئی اور عمر کے بھائیوں، بھائیوں نے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ وہ پہلے والی بے تکلفی ختم ہو کے رہ گئی تھی۔ اب وہ صبر سے انتظار کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد اُنہیں قدموں کی چاپ اس طرف آتی سنا دی۔ عمر زیب کے بڑے بھائی اورنگزیب اندر داخل ہوئے۔ ”میں کافی دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ عمر کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔“ اُنہیں بہت غصہ آیا اور انہیں بہت ہی تھا۔



”عمر کو میں خود ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ ایک بہت اچھے ڈاکٹر کا کسی نے بتایا ہے۔ جس ڈاکٹر سے اس کا علاج کروا رہے ہیں وہاں سے تو میرے بھائی کو کسی قسم کا بھی فرق نہیں پڑا ہے۔ اُس کی حالت جوں کی توں پہلے سے زیادہ خراب ہے۔ اس لیے میں خود علاج کرواؤں گا اُس کا۔ آپ نے کافی مدد کی بڑا احسان کیا ہمارے خاندان پر کہ عمر کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے رہے۔ مگر ہم عمر کے بھائی زندہ ہیں۔ ہمارے جیتے جی آپ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ اُس کے لیے فکر مند ہوں ہمارے لیے ڈوب مرنے کا ہتمام ہے۔ آپ جتنا کرچکے ہیں کافی ہے اور یہ بتائیں کہ کیا لیس گے چائے کہ ٹھنڈا۔“ اور نگزیب کا لہجہ و انداز اور الفاظ بہت اہانت آمیز تھے۔ آخر میں اُس نے تحقیق آمیز انداز میں آداب میزبانی نبھائے۔ طاہر لغاری کو بہت بے عزتی کا احساس ہوا۔ اُن کے بدلے روئے تو یہاں آنے جانے کے دوران ہی اُنہوں نے محسوس کر لیے تھے پڑا تھی تو ہیں کا اُنہوں نے سوچا تک نہ تھا۔

”نہیں کسی چیز کا بھی دل نہیں ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ دریکتا سے اگر ملاقات ہو جاتی تو.....“ طاہر لغاری آج تک یہ لجاجت بھرا رویہ اختیار نہیں کیا تھا۔ ”وہ تو اس وقت اپنی ایک دوست کے گھر گئی ہوئی ہے میری چھوٹی بیٹی کے ساتھ۔“ اور نگزیب نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ طاہر مایوس ہو کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نگزیب اُن کے ساتھ چلنے گاڑی تک آئے۔

”ہم عمر کو بہت اچھے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ ضرورت پڑی تو باہر بھی لے جائیں گے۔ میں فون کر کے آپ بتاتا رہوں گا عمر کے بارے میں۔ آخر کو آپ اُس کے بہت اچھے دوست ہیں۔ بہت ساتھ دیا ہے اُس کا۔ یہ احسان نہیں اُتار سکتے۔“ اور نگزیب نے لفظ ”دوست“ یہ اچھا خاصا زور دے کر کہا تو طاہر کو اپنے کانوں کے قریب خطرے کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔

کیا اور نگزیب کو یہ نہیں پتہ کہ عمر کی بیٹی اُن کے بیٹے اشعر کی منکوحہ ہے وہ یہ رشتہ کیوں بھول رہا ہے۔ صرف عمر کا دوست نہیں اُس کی بیٹی کا سر بھی ہے اور عمر کا سہمی بھی ہے۔

”خیر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ طاہر نے حسب عادت زیادہ ٹینشن نہیں لی۔ اور نگزیب نے اُس کے جانے کے بعد گیٹ بند کیا۔

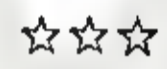
دریکتا اندر عمر زیب کے پاس بیٹھی تھی۔ اُسے طاہر انکل کے آنے اور پھر جانے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ عمر نے تھے اور وہ اُنہیں دیکھ رہی تھی۔ گزشتہ ایک ہفتے میں اُن کے رویے میں بہت جارحانہ پن آ گیا تھا۔ چیزیں اٹھا اٹھا پھینکنے اپنے بال نوچتے۔ کبھی روتے کبھی ہنستے۔

شریں نے اور نگزیب کو مشورہ دیا تھا کہ انہیں نیند کی گولیاں زیادہ دیا کرے تاکہ عمر بھائی سکون سے سو سکیں اور نگزیب نے دریکتا کے ذمہ یہ ذیوئی لگائی تھی کہ عمر جب زیادہ شور کرے اُسے یہ گولیاں دے دو۔ اکثر اوقات وہ انجکشن بھی لگا دیتے۔

انجکشن لگتے ہی عمر پر سکون ہو کے سو جاتے۔ باپ کی حالت دیکھ دیکھ کے دریکتا جی ہی جی میں کڑھتی۔ زیب کے بعد اُس کے لبوں سے مسکراہٹ جدا ہو گئی تھی۔ اس گھر سے خوشی روٹھ گئی تھی۔ وہ بہت کم بولتی تھی سارہ کی اور دلچسپیاں تھیں۔ ماڑہ شریں کے ساتھ لگی رہتی۔ باقی اس گھر میں اور ایسا کوئی نہیں تھا وہ جس کے ساتھ کلام کرتی۔ اُسے پہچانتا اور کبھی اُسے دیکھتے ہی مارنے کے لیے دوڑتا۔ اُس کا رویہ خطرناک تھا۔ پر ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا۔ عام طور پر

یہ وہ خاموش بیٹھا خلاؤں میں گھورتا یا بڑبڑائے جاتا۔ دریکتا رات کی تہائی میں روتی۔ جانے پنا کی حالت میں کب پہنچی آتی تھی۔ طاہر انکل آتے تھے تو اُسے مضبوطی کا احساس ہوتا پر کچھ دنوں سے انہوں نے چکر نہیں لگایا تھا۔ دریکتا نے اُن کا نمبر لینے کی ضرورت ہی نہیں تصور کی۔ عمر زیب کے سیل فون میں اُن کا نمبر موجود تھا۔ پر نہ جانے اُس کا سیل فون کہاں تھا۔ اُس کے لاکھ ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملا تھا۔ ورنہ وہ اُن سے رابطہ کرتی۔ اُس کا کتنا دل کرتا کہ اپنے رے کے ہونے آسوس کسی مہربان کندھے پہ سر رکھ کے بہا دے۔ پر وہ مہربان کندھا سانس و غم خوار وجود خود سے بھی بیگانہ ہو چکا تھا۔ زرخ اور فوزیہ چچی جو پہلے اُس کے داری صدقے جاتی اب دُور دُور ہی رہتیں۔ ویسے بھی وہ یہاں سے گاؤں چلی گئی تھیں۔ صرف نوید اور ہارون چچا ہی ادھر تھے۔ صبح پاپا کے آفس اور فیکٹری جاتے اور پھر شام بہت لیٹ واپس آتے۔ دریکتا اُن کی نمون تھی کہ وہ اپنی جان مار کر اُن کے کاروبار پہ توجہ دے رہے تھے۔ پاپا تو اس قابل تھے ہی نہیں کہ اب کاروبار دیکھتے۔ رہی وہ تو اُسے ان باتوں اور کاموں کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ وہ اُلٹا اُن کی احسان مند تھی۔

شاہ زیب کو یہ دنیا چھوڑے تین ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ گھر کے معاملات اور دیگر اس طرح کی چیزیں چچا اور تایا لوگ ہی چلا رہے تھے۔ وہ ان فکروں سے بے نیاز تھی۔



شریں لان میں بیٹھی تھی۔ طاہر لغاری کو جاتے ہوئے اُس نے بھی دیکھا۔ اور نگزیب اُسے چھوڑ کر شریں کی طرف ہی آ رہے تھے۔ اُس کے قریب آ کے دھم سے کرسی پہ بیٹھ گئے۔ ”یہ کیوں آیا تھا آج۔“ شریں نے تیوریاں چڑھا لیں ”کہہ رہا تھا عمر کو ڈاکٹر کے پاس چیک آپ کے لیے لے کے جانا ہے۔“ پھر آپ نے کیا کہا؟۔“ وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔“ اور نگزیب سکون سے بولے۔ ”پھر بھی میں بھی تو سنوں۔“ شریں نے اصرار کیا۔ ”میں نے کہا کہ ہم اُس کے بھائی ہیں اُس کی فکر کرنے اور ڈاکٹر کے پاس لے کے جانے کے لیے۔ بس ٹھیک کر دیا ہے طاہر لغاری کو میں نے۔ عقل ہوئی تو آئندہ اس طرح نہیں آئے گا۔“ ”کیوں نہیں آئے گا آپ بھول رہے ہیں کہ وہ دریکتا کا سر بھی ہے۔“ شریں نے حقیقت یاد کر لی تو اور نگزیب مسکرانے لگے۔ ”ہاں یہ تو ٹھیک کہا تم نے لیکن خیر اسے بھی دیکھا جائے گا۔ فی الحال میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“ ”کیا؟“ شریں اور نگزیب کے راز دارانہ انداز سے چونک گئی۔ اور نگزیب نے پہلے ادھر ادھر دیکھا جیسے کسی اور کے یہاں موجود نہ ہونے کا اطمینان کرتا چارہا ہو۔ پھر شریں کی طرف کرسی کھسکائی۔ ”تمہیں پتہ تو ہے ہی شاہ زیب کے کاروبار کے خسارے میں جانے کا۔ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے دریکتا کے پاس شاہ زیب سے زیادہ حصہ ہے اگر وہ اُس میں سے کچھ دے دے تو ہم آنے والے نقصان کو ٹال سکتے ہیں۔ اس طرح وہ سارا کاروبار ہم پھر سے شروع کریں گے۔ اب تو مجھے تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ کیوں نہ اپنا کاروبار کریں اور مالک بن جائیں۔“

شریں اور نگزیب کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گئی۔ ”پر یہ سب ہو گا کیسے؟“ اُس نے کام کا سوال کیا ”یہ بھی ہو جائے گا تم دیکھو تو سہی میں کیا کرتا ہوں۔ بس تم کوشش کرو کہ اس کی بھنک بھی کسی اور کے کانوں میں نہ پڑے۔ ورنہ بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔“ اور نگزیب آہستہ آہستہ قبول رہے تھے۔ شریں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ ”مجھے عمر بھائی کا یہ دوست طاہر لغاری بہت خطرناک اور تیز انسان لگتا ہے۔ مجھے اس کا یہاں آنا بھی پسند نہیں ہے۔ کچھ کریں کہ اُس سے جان چھوٹ جائے۔“ شریں بہت خائف تھی۔ خائف تو اور نگزیب بھی تھا پر طاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ اُسے اگر کسی سے خطرہ تھا تو وہ طاہر لغاری ہی تھا۔ اس گھر میں طاہر کا بے دھڑک، بلا روک ٹوک آنا جانا اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ عمر

☆☆☆

فوزیہ اور فرح دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ شریں حویلی آئی ہوئی تھی ورنہ اس نے تو شہر میں ہی ڈیرے ڈالے ہونے تھے ہمو شوہر اور بیٹی کے۔ عاشر بھی ساتھ تھا۔ شریں نے اپنی طرف سے راز داری برتی تھی کہ شریفوں کی آمد کا پتہ نہ چلے۔ پرنس کو خبر ہوگی تھی۔ اس نے فوزیہ کے آگے پیٹ پکا کیا۔ "شریں نے شریفوں کو بلوایا ہے۔" "ارے کوئی کام ہوگا تو بلوایا ہے ناں۔" فوزیہ نے شروع میں اہمیت نہیں دی۔ "اب شریں کو کون سا کام ہوگا۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ ماڑہ کے ساتھ کوئی گز بڑ ہے۔" فرح کی چھٹی حس تیز تھی۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو شریں خود بتاتی۔" فوزیہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ "لیکن مجھے لگتا ہے ایسی ہی بات ہے۔" شریں بھابھی جوڑ توڑ کی ماہر ہے کیا پتہ اندر کون سی کچھڑی پک رہی ہے۔ ہمیں تو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کے پھینک دیا ہے۔" فرح کا ملال کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ "ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ دریکتا اتنی جا بیدار کی حصہ دار ہے۔ شریں بھابھی کی تو رال ٹپک پڑی ہوگی۔" فوزیہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ خیر ان دونوں کے لیے ایک پہلو اطمینان بخش تھا کہ نوید اور ہارون بھی عمر بھائی کے کاروبار کی دیکھ بھال کر کے اپنا اپنا حق وصول کر رہے تھے۔ یہاں انہوں نے اورنگزیب بھائی کی چالاکی چلنے نہیں دی تھی۔ انہیں بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ سب کچھ اکیلا ہڑپ اور ہضم نہیں کر سکتے۔ ہارون اور نوید بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ وہ بھی تو اس کی دولت میں حصہ دار تھے۔ بقول نوید اور ہارون کے کہ ہم محنت کر کے جائز کمائی کھا رہے ہیں ہمارا بھی حق بنتا ہے۔ دریکتا کو پتہ ہی نہیں تھا کہ پپا کے کاروبار سے کتنی آمدنی ہو رہی ہے۔ اُسے کبھی معلوم کرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ زمانے سے اس کی چالاکیوں سے نا آشنا تھی سب کو اپنی طرح صاف نیت تصور کرتی تھی۔ اور یہ اس کی بیوقوفی تھی۔

☆☆☆

شریں گاؤں سے لوٹ آئی تھی۔ پہلی فرصت میں اس نے دائی شریفوں کی دی گئی دوائی اپنی نگرانی میں ماڑہ کو کھلائی۔ شریفوں نے کہا تھا بہت جلدی کام ہو جائے گا۔ مگر مقررہ وقت گزر جانے کے باوجود اُسے خوشخبری نہیں ملی تو وہ کچھ اور سوچنے پہ مجبور ہوگی۔ دقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور اس کا مقصد ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ ماڑہ کو کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جانا ناگزیر تھا۔

گھر سے کسی کو بتائے بغیر وہ ماڑہ کو لے کر نکل آئی۔ ماڑہ عدت میں تھی شریں اس کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرتے مضبوط جواز کے ساتھ نکلی تھی۔

انہوں نے ایک ڈاکٹر کا پتہ چلا لیا تھا جو اس طرح کے کام بھاری معاوضے پہ کر دیتی تھی۔ پیسہ ان کے پاس موجود تھا سو پریشانی والی بات نہیں تھی۔ لیڈی ڈاکٹر عائشہ انور نے اپنا کلینک اور چھوٹا سا ہسپتال ایک عام سے علاقے میں کھولا تھا۔ شریں نے پوچھ پوچھ کے ڈھونڈ ہی لیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے پاس صرف دو عورتیں بیٹھی تھیں ان کے بعد ماڑہ کی باری آئی اور نرس اسے اندر لے گی۔ کچھ دیر بعد شریں کو بھی اندر بلوایا گیا۔ "بیٹھیں۔" ڈاکٹر نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ شریں ہوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "خاتون بات دراصل یہ ہے کہ اگر آپ اس وقت بارش کروانا چاہتی ہیں تو یہ اس بچی کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔" اس کا اشارہ ماڑہ کی طرف تھا۔ "اگر آپ میرے پاس کچھ دن پہلے آ جاتیں تو یہ مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ مگر اب نہیں آپ کی بیٹی کی جان بھی بکتی ہے میں نے پیسے لینے ہوتے

زیب ہوش و خرد سے بیگانہ تھا اپنے حواس سے کام لینے پہ قادر نہیں تھا۔ طاہر پھر بھی آتا جاتا اس کی کینز کرتا۔ وہ حقیقی میں سچا اور مخلص دوست تھا۔ بھلا ان تین گے بھائیوں کے ہوتے ہوئے طاہر نگاری کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خود اپنے کا خیال رکھ سکتے تھے۔

☆☆☆

شریں دودن کے لیے گاؤں آئی ہوئی تھی۔ اُسے دائی شریفوں سے کام تھا۔ دائی شریفوں ابھی تک اس کی صحت تھی اور اس کی صحت بھی اتنی عمر ہو جانے کے بعد شاندار تھی۔ وہ اب خود بہو اور پوتے پوتیوں والی تھی۔ خوشحال اور اپنے گھر کی مالک تھی۔ شریں نے اُسے پیغام دے کر حویلی بلوایا تو وہ حیران رہ گئی کہ اتنے عرصے بعد اسے کیوں یاد کیا جا رہا ہے۔ خیر اُسے کام سے غرض تھی آم کھانے سے مطلب تھا اس کی اتنی خوشحالی کا راز بھی یہی تھا۔ پشتم بھاگی آئی۔ حویلی والے معمولی خدمت کے عوٹس اُسے منہ مانگا پیسہ دیتے رہے تھے۔

"آؤ دائی شریفوں کیسی ہوں۔" شریں اُس کے استقبال کے لیے خود کھڑی ہوگی۔ شریفوں خوشی سے پھوسا نہ سالی۔ "بس آپ کی دعائیں ہیں بی بی جی۔" وہ خوشامدی لہجے میں از حد انکساری بھر کے بولی۔ "بی بی جی کوئی کام ہے کیا۔ سنا ہے زیادہ تر آپ شہر میں رہتی ہیں۔" "ہاں شریفوں کام ہے تب ہی تو شہر کی بڑی بڑی ڈاکٹرنیوں کو چھوڑ کر تیرے پاس آئی ہوں۔ تیرے ہنر پہ مجھے بہت اعتبار ہے۔" اپنی اتنی اہمیت پہ شریفوں خوشی سے پھول گی۔ "پھر ذرا ٹھہر کے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے آئی اور آہستہ آہستہ بولنے لگی۔ شریفوں برابر سر ہلا رہی تھی۔

"بی بی جی آپ فکر مت کریں کام پکا اور سولہ آنے ٹھیک ہوگا۔ میں ابھی گھر جاتی ہوں اور دوائی بنا کے لائی ہوں۔" شریفوں نے اس کی ساری فکر دور کر دی تھی۔ وہ فوراً اُلٹے پاؤں گھر چلی گی۔ شریں بے تابی سے اس کے انتظار میں تھی۔

دکیل عدنان ہاشمی نے وصیت سنا کے ان سب کی مت ہی ماری تھی ورنہ ماڑہ والے مسئلے سے وہ بہت پہلے فارغ ہو جاتی۔ خیر دائی شریفوں نے اُسے پورا یقین دلایا تھا کہ کام ہو جائے گا۔ شریں نے اپنی طرف سے عقل مندی کی تھی کہ اُسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ یہ دوائی کس کے لیے لے کے جا رہی ہے۔ دائی شریفوں نے خود بھی اس طرح کا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی اور مالک لوگوں کا مزاج جانتی تھی۔

شریں اور ماڑہ نے بڑی خوبصورتی سے ابھی تک شاہ زیب کی نشانی کو چھپا ہوا تھا۔ شریں کو لگتا تھا جیسے اس نے دیر کر دی ہے۔ وہ اور کھیڑوں میں مشغول تھی۔ اس طرف سے وقتی طور پہ اس کا دھیان ہٹ گیا تھا۔ اب وہ بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ ماڑہ کی ابھی عمر ہی کیا تھی۔ چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اگر شاہ زیب کا بچہ دنیا میں آ جاتا تو یہ ماڑہ کے مستقبل پہ اثر انداز ہوتا۔ بے شک وہ خوبصورت تھی کم عمر تھی۔ شہری رنگ ڈھنگ جانتی تھی لیکن بچے کی ماں بن جاتی تو اس کی اہمیت کم ہو جاتی۔ شریں دنیا اور معاشرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی جس طرح شرفاء میں طوائف کو قبول نہیں کیا جاتا تھا اسی طرح ایک بیوہ اور بچے کی ماں کے ساتھ بھی داغ لگے چاند کا سلوک کیا جاتا۔ اور ماڑہ بہت کم عمری میں یہ داغ اپنے وجود پہ سجائی تھی۔ چاند پہ داغ ہے اُسے دیکھا تو جاسکتا ہے پر آنگن میں نہیں اتارا جاسکتا۔ ماڑہ بھی ایسا ہی چاند تھی۔ اور شریں اس کے مقدر سے خوف کھا گئی تھی۔ اس کی ماڑہ کے بارے میں اپنی پلاننگ تھی اور قدرت کی اتنی مانتک تھی کہ شریں کو حاکم شاہ زیب کے بارے میں کچھ نہ پتا تھا۔





ہیں۔ مگر وقت گزر گیا ہے بجائے لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں باقی آپ کی جو مرضی۔ میں نے مشورہ دینا تھا دے دیا۔  
 اگر آپ برآمدہ نہیں تو ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔ ڈاکٹر عائشہ کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ شریں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھنے کی اجازت دی۔ آپ کی بیٹی کم عمر ہے اور یہ اس کا پہلا بچہ ہے۔ لوگ تو اس موقع پر بہت خوش ہوتے ہیں۔ کیوں ابارش کروانا چاہتی ہیں۔ شریں کچھ دیر کے لیے خاموش سی ہو گئی۔ "اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور شوہر کے مرنے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ یہ امید سے ہے۔ آپ نے ابھی خود کہا ہے کہ میری بیٹی کم عمر ہے اتنی کم عمری میں اس نے یہ صدمہ بھی جھیل لیا ہے۔"

ٹھیک ہے جو ہونا تھا ہو گیا اب اس کے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ میں چاہتی ہوں کسی اچھے گھرانے میں اس کی شادی کر دوں۔ بچے کے ساتھ کون قبول کرے گا اسے۔ کون اس ہونے والے بچے کو باپ کا پیار دے گا اس کی پرورش، تعلیم اور کھانے کی ذمہ داری کون قبول کرے گا۔ اس نصیبوں جلی کو تو کوئی نہ کوئی بریل جائے گا اس بچے کا کیا ہوگا؟ شریں کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ ڈاکٹر عائشہ خاموش ہو گئی کچھ دیر۔ "خیر آپ اچھی امید رکھیں اپنے رب سے۔ جہ سے اسے اس دنیا میں لائے گا وہی اس کا پالنہ ہار بھی ہوگا۔" ڈاکٹر عائشہ مائے کے لیے اپنے دل میں عجیب سی ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اُسے اپنے کام سے غرض ہوتی تھی۔ جو عورتیں اس کے پاس آتیں وہ سب کام کر دیتی آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اُس کے اندر سے ہمدردی اور خدا ترسی کی آواز اُنہری تھی۔ شریں کی زبانی مائے کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا سن کر اُسے اور بھی دکھ ہوا تھا۔ "آپ ان کا خیال رکھیں فردت، جوس، گوشت اچھی غذائیں اور مائے آپ خوش رہنے کی کوشش کریں میری دعا ہے کہ یہ بچہ آپ کے لیے خوش قسمت ثابت ہو۔" وہ دونوں سے بیک وقت مخاطب تھی۔ شریں منہ لٹکائے مائے کے ساتھ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک سے باہر آئی۔

اب گھر جا کے اُسے یہ خوشخبری بھی سنائی تھی کہ مائے امید سے ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس بات کو مزید چھپانے کے مائے کی ذات پر بدنامی کا کوئی دھبہ لگوائے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ شاہ زیب کی نشانی کو دنیا میں آنا ہی تھا۔ حالانکہ اُس نے کتنی بار کوشش کی کہ ایسا نہ ہو۔ شریں کو غصہ آ رہا تھا۔ بظاہر اُد پر سے بڑ سکون اور خوش تھی۔ گھر پہنچتے ہی پہلا کھراؤ دریکتا سے ہوا۔ شریں نے سب سے پہلے اُسے بتایا۔ اُس کے چہرے پر پہلے ایسے تاثرات ابھرے جیسے اُسے یقین ہی نہ آ رہا ہو۔ تو پھر پورے چہرے نے خوشی کا احاطہ کیا۔ بے اختیار وہ مائے سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر یہ خوشی کے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پاپا کو بھی خوش خبری سنائے پر اُن کو سنانا نہ سنانا برابر تھا وہ اپنے حواس میں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے کہ شاہ زیب کی نشانی اس دنیا میں آنے والی ہے۔ تھوڑی دیر تک مائے کے امید سے ہونے کی خبر گاؤں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ شریں نے فون کر کے فوزیہ اور فرح کو بھی بتا دیا۔

☆☆☆

باسط کچھ دنوں کے لیے پاکستان آیا ہوا تھا۔ اُسے دو ہی میں ہی مائے کے شوہر کے ساتھ ہونے والے حادثے اور پھر مائے کی بیوگی کا پتہ چل چکا تھا۔ بینا نے روتے ہوئے اُسے فون پر یہ خبر سنائی تھی۔ باسط کو اس بات سے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ وہ بے حسی سے سنتا رہا تھا۔ اُس نے مائے یا شریں خالہ سے فون پر تعزیت بھی نہیں کی۔ اُس کا دل چاہ نہیں رہا تھا کہ اُن سے دکھ بھرنے جیلے بولے یا انفسوس کا اظہار کرے۔

ان تین چار ماہ کے دوران وہ بہت مصروف رہا تھا۔ اب اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ گھر جائے اور سکون سے وقت

گزارے۔ اس بار وہ اپنے ساتھ کوئی سامان نہیں لایا تھا۔ جس طرح پہلے لاتا اور لے جاتا تھا۔ اس لیے ہر فکر سے آزاد تھا۔ بینا اور حمزہ احمد بیٹے کو اپنے درمیان پا کے بہت خوش تھے۔ اُس نے پہلے تو سب کو جی بھر کے شاپنگ کروائی پھر ایک اور نئی گاڑی خریدی۔ وہ بڑی ترنگ میں تھا۔ آج سارا دن نئی گاڑی دوڑائی تھی۔ پھر ایک فائو سٹار ہوٹل میں لُنج کیا۔ گھر لہنا تو جو توں سمیت بیڈ پہ لیٹ گیا۔ بینا لپک کے اُس کے پاس آئی۔ "آج کہاں رہے سارا دن؟" وہ بیڈ پہ بیٹھ گئی اور اُس کے ماتھے پہ آئے بال پیچھے ہٹائے۔ "بس آوارہ گردی کرتا رہا ہوں۔ پھر واپس چلے جانا ہے۔ وہاں تو مجھے ان عیاشیوں کا نام نہیں ملتا بس کام، کام اور صرف کام۔"

"اوہ تو تمہارے جانے کے نام پہ یاد آیا کہ تم اپنی شریں خالہ کی طرف سے تو ہو آؤ۔ اتنا بڑا صدمہ گزرا ہے اُن پہ۔ غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے مائے پہ۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے میرا۔" سچ بچہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ عمر زیب کی طرف سے برسوں پرانی غلطی اور ٹھکرائے جانے کی اذیت آج بھی اُس کے دل میں موجود تھی پر عمر کے جوان بیٹے کی موت نے اُسے بھی غمزدہ کر دیا تھا۔ وہ بھی باسط اور ایاز کی ماں تھی۔ اُس نے عمر کا غم اپنے دل میں محسوس کیا تھا گہرائی تک اب تو وہ نیم پاگل ہو چکا تھا۔ بینا کو اُس پہ ترس آتا تھا۔ کسی کمزور لمحے میں برسوں پہلے اُس کے دل نے عمر زیب کی تباہی و بربادی کی خواہش کی تھی۔ اب اپنی اُس خواہش پہ اُسے ندامت تھی۔ وہ باسط اور اپنی اولاد کی طرف سے مطمئن تھی بے چارے عمر زیب نے کیا پایا تھا۔ پہلے سن چاہی بیوی نے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا تحفہ چھوڑ کر خود اس دنیا سے ابدی دنیا کا سفر کیا۔ دوسری شادی کی تو وہ بیوی بھی زیادہ عرصہ اُس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اب جوان بیٹے کی حسرت ناک موت نے اُسے نیم پاگل بنا دیا تھا۔ کیا ملتا تھا عمر کو بھلا..... بینا جتنا جتنا غور کرتی اُسے عمر زیب پہ اتنا ہی ترس آتا۔

عمر زیب کے مقابلے میں اُس کا شوہر نہ تو اتنا خوبصورت تھا اور نہ بے پناہ دولت کا مالک تھا شروع میں بینا بہت روتی تھی۔ آہستہ آہستہ حالات میں تبدیلی آئی۔ باسط کو جاب ملی اب اُن کے پاس بہت خوبصورت گھر، گاڑی، نوکر سب کچھ ہی تھا۔ اُس کی اولاد اُس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ اُس نے کوئی ایسا صدمہ نہیں اٹھایا تھا جس طرح کے عمر زیب اٹھا چکا تھا۔ اُس کے مقابلے میں وہ خوش قسمت تھی۔ اب تو وہ ملال بھی ختم ہو گئے تھے جنہوں نے برسوں پہلے دل میں گھر کیا تھا۔ "ای آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔" نہیں بینا میں ہو آئی ہوں۔ تم جاؤ۔ شریں خالہ مائے کے ساتھ شہر میں ہی ہے۔ تم جاؤ۔ ہم مرنے والے کو واپس تو نہیں لا سکتے پر اُن کا دکھ تو بانٹ سکتے ہیں نا۔" بینا نے دانستہ دامن بچایا۔ وہ عمر زیب کو اس حال میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ "ٹھیک ہے ای میں کل چلا جاؤں گا۔" وہ آرام سے مان گیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ بینا اُسے آرام کرتا چھوڑ کر اُس کے پاس سے اٹھ آئی۔ باسط نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا مائے اور شریں خالہ کے بارے میں۔ "ٹھیک ہے مائے بیگم میں کل آ رہا ہوں تم سے تعزیت کرنے۔ ذرا دیکھوں تو سہی اتنا بڑا صدمہ اٹھا کے تم کیسی ہوگی ہو؟"

"تمہارا حال کیسا ہے اب۔ کل دیکھوں گا۔" باسط کے لبوں پہ زہر میں ڈوبی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

سارہ گیٹ کے پاس ٹہل رہی تھی۔ موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ ایک دم سے آسمان پہ بادل اُمنڈ آئے تھے۔ گیٹ کے باہر کوئی گاڑی رکی تھی۔ اُس نے اُچک کے سامنے دیکھنے کی کوشش کی کہ باہر کون ہے۔ باتوں کی آواز آ رہی تھی چوکیدار کسی کے ساتھ بول رہا تھا۔

اتنے میں گیت کھل گیا اور کالے رنگ کی اکار ڈاندر آگئی۔ سائرہ روش کے پاس ہی تھی۔ گاڑی زن سے اُس کے پاس سے گزری تھی وہ سائینڈ پہ ہوگی۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ اُسے کسی نوجوان کی شکل نظر آئی تھی۔ جب تک وہ گاڑی روک کر دروازہ کھول کے نیچے اتر سائرہ اُس کے قریب پہنچ گئی۔ پولیس یونیفارم میں ملبوس دراز قامت ننھی مونچھوں مضبوط شخصیت اور پر اعتماد انداز والا یہ نوجوان اُس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ پہلی نگاہ میں ہی اُسے سراہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”اسلام علیکم میں اشعر لغاری ہوں عمر انکل کا پتہ کرنے آیا ہوں کافی دن سے آنا چاہتا ہوں مصر و فیات بہت زیادہ تھیں۔ ابھی بھی افس سے سیدھا ادھر آ رہا ہوں۔ آپ اطلاع دے دیں گھر والوں کو۔“

وہ سائینگی و اعتماد سے بولتا اُسے بہت اچھا لگا۔ پتہ نہیں کون تھا۔ سائرہ نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے اعتماد سے بول رہا تھا۔ یقیناً عمر چچا کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہوگا۔ اُس نے سوچا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اشعر بیٹھ چکا تھا۔ سائرہ اُلٹے پاؤں شریں کو بتانے بھاگی کیونکہ اُس نے سختی سے کہا تھا کہ گھر میں کوئی بھی آئے سب سے پہلے مجھے بتاؤ۔ اصولی طور پہ اُسے دریکتا کو پہلے آگاہ کرنا چاہیے تھا۔ پر ماں سے ڈرتی تھی اس لیے پہلے اسی کو بتایا۔ ”ای کوئی اشعر لغاری آئے ہیں عمر چچا کا پوچھنے میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“ ”کسی اور کو تو نہیں بتایا۔ اُن کا محتاط اشارہ دریکتا کی جانب تھا۔“ ”نہیں اور تو کسی کو نہیں بتایا۔ سامنے کوئی تھا ہی نہیں۔“ ”شریں نے سکون کی سانس لی۔ اشعر اُنہیں اپنے مقابل پا کے احترام سے کھڑا ہو گیا اور حال احوال پوچھا۔ شریں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سائرہ بھی شریں کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔ اُسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اشعر لغاری کون ہے اور اس کا عمر چچا یا اس گھر سے کیا تعلق ہے۔ وہ دریکتا کے نکاح میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے اشعر لغاری سے انجان تھی۔ اُسے جستجو لگی ہوئی تھی کہ یہ نوجوان ہے کون۔ جس سے ای بھی مرعوب نظر آ رہی تھیں۔ ”عمر انکل کیسے ہیں کہاں ہیں۔“ اشعر نے پوچھا۔ ”وہ تو سو رہے ہیں ورنہ میں کسی نہ کسی طرح اُنہیں یہاں لے آتی۔“ ”شریں نے غدر پیش کیا۔“ ”کوئی بات نہیں میں خود اُنہیں جا کے دیکھ لیتا ہوں۔ اس طرح مجھے بھی تسلی ہو جائے گی۔ آپ اُن کے کمرے تک مجھے لے چلیں۔“ وہ اُن سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا۔ ناچار شریں کو بھی اٹھنا پڑا۔ اُن کی مرضی نہیں تھی کہ اشعر لغاری زیب کو دیکھے۔ مگر کچھ سوچ کے خاموش ہوگی۔ وہ اُسے ساتھ لیے عمر زیب کے بیڈ روم میں آئی۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ اُس نے آگے بڑھ کے پردے ہٹا دیئے اور ساتھ لائٹ بھی جلا دی۔ عمر انکل واقعی سوئے ہوئے تھے۔ اشعر کو اپنا وہاں بیٹھنا بیکار ہی لگا۔ وہ باہر آ گیا۔ شریں کو بھی اُس کی تقلید کرنی پڑی۔ ”انکل کا ٹریٹ منٹ چل رہا ہے۔“ اشعر نے واپس ڈرائنگ روم میں پہنچ کے پھر سے پوچھا ”ہاں بیٹا علاج ہو رہا ہے عمر بھائی کا۔ بہت قابل ڈاکٹر ہے اور نگریب علاج کر رہے ہیں۔ اگر کوئی فرق نہ پڑا تو ہم باہر لے جائیں گے علاج کی خاطر عمر بھائی کو۔ شاہ زیب کی موت نے بہت بُرا اثر ڈالا ہے ان پہ۔ خیر خدا کی مرضی تھی یہ۔ کسی کا کیا بس چلتا ہے۔ میری جوان معصوم بیٹی بھی تو بیوہ پر ہوئی ہے پر وہ دھوکے خاموش ہو گئی ہوں میں بھی۔“ ”شریں کی صورت روئی سی ہو گئی تھی۔ اشعر کو آئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اتنی دیر میں چائے کے ساتھ کافی لوازمات ٹیبل پہ اُس کے سامنے سجادیئے گئے۔ شریں اور سائرہ کے بیدار اصرار پہ اُس نے صرف آدھی پیالی چائے لی۔ واپسی سے پہلے جانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ اُس نے شریں سے دریکتا کا پوچھ لیا۔ وہ شاہ زیب کے جنازے پہ اُسے نظر آئی تھی اس کے بعد دوبار اُنہیں دیکھا تھا۔ ”آئی دریکتا سے ملاقات ہو سکتی ہے۔“ ”وہ سارا دن اپنے کمرے میں گھسی رہتی ہے جانے کیا کرتی ہے۔ نہ ہمارے ساتھ بولتی ہے نہ بیٹھتی ہے۔“

کے بتائی ہوں اُسے۔“ ”شریں کو اشعر کی فرمائش ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ خیر اُسے مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ سائرہ اشعر کے پاس اکیلی رہ گئی۔ ”آپ کہاں رہتے ہیں۔“ ماں کی غیر موجودگی میں اُس نے پہلا سوال پوچھا۔ اشعر نے بتا دیا۔ سائرہ اور سوال پوچھنے کی تیار کر رہی تھی کہ شریں اکیلی ہی واپس آگئی۔ دریکتا اُس کے ساتھ نہیں تھی۔ ”کہتی ہے میرے سر میں درد ہو رہا ہے ابھی نہیں مل سکتی۔“ ”شریں نے اشعر کی طرف دیکھے بغیر یہ جملہ کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے شدید قسم کی اینٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دریکتا سے عمر انکل کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اُن کی بیٹی تھی۔ اپنے باپ اور اُن کے فریٹ منٹ کے بارے میں باقی گھر والوں سے زیادہ ہی جانتی ہوگی۔ اسی پوائنٹ پہ اُس کی توجہ تھی۔ پر اُس نے سر درد کا بتا کر ملنے سے مجبوری ظاہر کر دی تھی۔

اشعر کے چہرے پہ چھائی غصے اور توہین کی سرخی شریں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ اُس کا تیر نشانے پہ لگا تھا۔

☆☆☆

کافی دیر کرو میں بدلنے کے باوجود اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکا کے بیٹھ گئی اور جوتوں کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ جوتے پہن کے واش روم میں گئی اور ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پہ مارے۔ اب قدرے سکون کا احساس ہوا دریکتا کو۔ دروازہ ہلکے سے کھول کے باہر قدم نکالا۔ کچھ فاصلے پہ سائرہ بھی کمر تھا وہ آرام کر رہی تھی۔ دریکتا پاؤں دیکھنے نیچے آئی۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ ”جانے کون آیا ہے۔“ اُس نے خود کلامی کی۔ وہ ڈرائنگ روم کے سامنے گزر رہی تھی۔ اس کے بعد پاپا کا کمر تھا۔ ”دیکھو تو سہی کون ہے مجھے پتہ ہی نہیں کہ کون آیا ہے۔“ وہ دروازے کے سامنے تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی۔ اندر کی طرف سے دروازہ کھولا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اپنی جھونک اور تیزی میں دریکتا سے ٹکرایا۔ یہ ٹکراؤ شدید نہیں تھا پر وہ گرتے گرتے بچی۔ ٹکرانے والے نے اُسے سنبھال لیا تھا۔ یہ اشعر لغاری تھا۔ جس کی باوای آنکھوں میں اس وقت بے پناہ غصہ ہلکورے لے رہا تھا۔ اُس کے پیچھے شریں اور سائرہ کے چہرے ابھرے تھے۔ ”بہت خوشی ہوئی ہے آج آپ کے گھر آ کے۔ آپ کے ہاں مہمانوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے پہلے کوئی اندازہ نہیں تھا ورنہ آپ کو بتا کے آتا۔“ ”پے در پے داروں سے وہ بوکھلا گئی۔ اشعر اُسے آگے سے ہٹا کے خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شریں اور سائرہ نے بڑے اخلاقی سے رخصت کیا۔ پر دریکتا کی طرف سے اُس کے دل میں بے پناہ غصہ تھا۔ اب تو اُس میں سوال بھی شامل ہو گئے تھے۔

وہ پریشان سی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ شریں اشعر کے جانے کے بعد اُس کے پاس آئی۔ ”تم سو رہی تھی اس لیے میں نے تمہیں نہیں اٹھایا۔ عمر بھائی کی وجہ سے پریشان رہتی ہو مجھے پتہ ہے۔ رات کو کافی دیر تک تمہارے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی ہے۔ جانے سوتی بھی ہو کہ نہیں۔ اس لیے میں نے تمہیں نہیں جگایا کہ چلو جتنی دیر سوئی رہو گی۔ پریشانیوں اور سوچوں سے بچی رہو گی۔ ویسے میں اشعر کو عمر بھائی کے کمرے میں لے گی تھی۔ خود دیکھ کر گیا ہے اُنہیں۔ سائرہ اور میں نے اشعر کو کہنی دی ہے۔ تمہارا بھی بتا دیا کہ آرام کر رہی ہے۔“ دریکتا نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ اشعر کی اُس کے ساتھ ابھی تک کوئی بھرپور یا زور دار قسم کی ملاقات نہیں ہوئی تھی جو وہ اُس کے مزاج کے بارے میں جان سکتی یا اندازہ لگا سکتی۔ اُسے پہلے تو اشعر سے ٹکرانے پہ ہی شرمندگی ہو رہی تھی۔ شریں تائی اور سائرہ نے بھی دیکھا تھا۔ پھر اشعر کا طنزیہ اندازہ گفتگو۔ جانے اُس کا ری ایکٹ ایسا کیوں تھا۔ اُس کے وہ طنزیہ جملے۔ سوچتی اور الجھتی۔ ”بہت خوشی ہوئی آج آپ کے گھر آ گئے۔ آپ کے ہاں مہمانوں سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مجھے پہلے کوئی اندازہ نہیں تھا ورنہ بتا کے آتا۔“

شریں تالی اور سارہ نے اتنے اچھے طریقے سے پوچھا۔ خاطر مدارت کی پھر اُسے کیا شکوہ تھا جو وہ اتنے غصے میں گیا تھا۔ دریکتا سوچ سوچ کے اس کا جواب تلاش کرنے میں ناکام ہو گئی تھی۔

سارہ کو جانے کیوں بہت افسوس ہو رہا تھا یہ جاننے کے بعد کہ اشعر لغاری دریکتا کا شوہر ہے۔ اسی لیے تو اسے غصے سے بات کی تھی اُس کے ساتھ اور تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے نکلا تھا۔ اُسے دریکتا سے حسد سا محسوس ہوا۔ اتنی شاندار پرستاشی تھی اشعر لغاری کی وہ دیکھتے ہی مرعوب ہو گئی تھی۔ اُس کے بیٹھنے، بات چیت کرنے کا انداز سب کچھ کتنا پُر اعتماد تھا۔ سارہ ماڑہ سے سال بھر ہی چھوٹی تھی پر اُس کی طرح اتنی تیز طرار نہیں تھی۔ شریں نے ابھی اُس کو سنوارنے نکھانے میں اتنی دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔ درندہ ماڑہ سے دو ہاتھ آگے ہی ہوتی۔ ابھی تو دل کو اس تاسف نے گھیرا ہوا تھا کہ دریکتا کا شوہر کتنا زبردست ہے۔

☆☆☆

باسط کو اپنے سامنے دیکھ کر شریں کو ناقابل بیان قسم کی خوشی ہو رہی تھی۔ شاہ زیب کی موت کے بعد اُن کی بیوا سے جب بھی بات ہوتی وہ باسط کا خاص طور پہ پوچھتیں۔ بیوانے بھی بہن کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی دلچسپی محسوس کر لی تھی۔ پر توجہ نہیں دی تھی۔ ”کب آئے ہو تم۔ نہ تمہارے آنے کا پتہ چلتا ہے نہ جانے کا۔ لگتا ہے خوب کمار ہے ہو۔“ شریں نے اُس کی کلائی پہ بندھی قیمتی گھڑی ہاتھ میں پکڑا سٹاکس سامو بائل فون اور اُس کے پہنے گئے قیمتی سوٹ سے اُس کی آمدنی کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ جس چم چم کرتی گاڑی میں اپنے ڈرائیور سمیت آیا تھا وہ خود ہی اپنے قیمتی ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ اُس کی خاطر مدارت میں بچھ بچھ گئیں باسط کی گھومنی نظریں اُن کی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی سے قطع نظر ماڑہ کو دیکھ کر رہی تھی۔ رہا نہیں گیا تو اُن سے پوچھ ہی بیٹھا۔ ”خالہ ماڑہ کہاں ہے نظر نہیں آرہی ہے۔“ اُس نے کہاں جانا ہے نصیبوں جلی نے۔ اپنے کمرے میں ہے۔“ شریں خالہ نے تاسف آمیز ٹھنڈی سانس لی۔ باسط سے کوئی جواب ہی نہیں بن پڑا۔ خاموشی سے جوتے کی ٹو سے دیز تالین کو کریدنے لگا۔ ”میں نے ماڑہ سے تعزیت کرنی ہے خالہ۔“ خاصی دیر کے بعد بولا تو شریں چونک گی ”ہاں ٹھیک ہے وہ عدت میں ہے۔“ پر۔۔۔۔۔ وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہتے کہتے رک سی گی۔ ”خالہ میرے حساب سے تو اُس کی عدت ختم ہوگی ہے چار ماہ دس دن کی مدت ہے ناں عدت کی۔“ وہ اُن سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ ”ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہوتی ہی مدت ہوتی ہے عدت کی پر ماڑہ ماں بننے والی ہے ابھی کچھ دن پہلے ہی ہمیں بھی یہ بات پتہ چلی ہے۔“ شریں خالہ نے اُس کے حواسوں پہ ہم گرایا تھا۔ اس طرف کا تو اُس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ کبھی اس پہلو کی طرف دھیان گیا تھا۔ ایسی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں پتہ چلی۔۔۔۔۔ اُسے خود ہی اپنی سوچ پہ ہنسی آ گی۔ بھلا یہ بات اُسے ای بتاتی کہ ماڑہ ماں بننے والی ہے۔“ اُس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کے کہا۔

”کوئی کون سی خوشی کی بات ہے۔ شاہ زیب خود تو مر گیا میری ماڑہ کو دکھوں کے حوالے کر کے پہلے کوئی کی تھی جو وہ جاتے جاتے اُسے ماں کے رتبے پہ بھی فائز کر گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ماڑہ کی جان چھوٹ جائے پر میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوا۔“ شریں خالہ اُسے سب کچھ ایسے بتا رہی تھی جیسے وہ اُن کی سہیلی ہو کوئی راز دار ہو۔ ”خالہ ہر بار آپ کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی ناں۔ کبھی کبھی ناکامی بھی مقدر ٹھہرتی ہے۔“

وہ بہت عجیب انداز میں ابن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا تو شریں کو بے چینی سی ہونے لگی۔ باسط نے چہرے پہ اپنی عمر کے برعکس بہت پکا پن سا تھا۔ جیسے بہت جہاں دیدہ اور زمانہ شناس ہو۔ یہ پختگی و سنجیدگی و زمانہ شناسی اُس

کی باتوں سے بھی چھلکتی تھی۔ ”اچھا یہ بتاؤ وہاں کیا کرتے ہو۔“ وہ اپنی بے چینی کو زائل کرنے کے لیے پوچھ رہی تھی۔ ”خالہ میں ایک ایسپورٹ ایکسپورٹ فرم میں کام کرتا ہوں قسمت اچھی تھی جو یہاں نوکری مل گی۔ ورنہ ایک بی ایس سی پاس لڑ کے کو کون ملازم رکھتا ہے عمر بھی کم تھی تجربہ بھی نہیں تھا پر ساری بات قسمت کی ہے۔ مختصر عرصے میں گھر بھی لے لیا ہے گاڑی بھی ہے بلکہ میرے ساتھ دو لڑکے اور بھی ہیں وہ کہتے ہیں ہمیں اپنا کاروبار کرنا چاہیے اس میں بہت پرائٹ ہے ہو سکتا ہے میں اپنا کاروبار شروع کر ہی دوں ابھی سوچ رہا ہوں۔“ باسط مزے سے بتا رہا تھا اور شریں رشک سے دیکھ رہی تھی۔ ”واہ میری بہن کی قسمت کتنی اچھی ہے جو تم جیسا بیٹا دیا ہے۔ اللہ ہر کسی کو تم جیسا بیٹا دے۔“ اُن کی دعا پہ باسط کا دل چاہا کہ زور سے ہنسنے۔ پر اُس نے یہ بے وقوفی نہیں کی۔ ہولے سے سر ہلا دیا۔

”اچھا خالہ ماڑہ یہاں آسکتی ہے یا میں اُس کے پاس جا سکتا ہوں۔“ اُس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دوبارہ اپنا سوال کچھ الفاظ کے اضافے کے ساتھ دہرایا۔ ”ہونہہ ہے تو وہ عدت میں۔ پر تم اتنی ددر سے آئے ہو میں اُسے کہتی ہوں سر منہ ڈھانپ کے تم سے بات کر لے۔“ شریں خالہ کا انداز احسان کرنے والا تھا۔ باسط نے ایک بار پھر بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا۔ وہ تو آج بڑے لطیفے بنا رہی تھیں۔ درندہ کہنے لگا تھا کہ خالہ آپ کب سے اتنی مذہبی مزاج کی ہو گئی ہیں۔ اور اگر آپ کو خدا نے یہ توفیق بخش ہی دی ہے تو پھر اپنی بات سے ہٹ کیوں رہی ہیں۔ جس بات کی اجازت اسلام نہیں دیتا آپ کیوں دے رہی ہیں۔ میں ماڑہ کے لیے نامحرم ہوں وہ میرے لیے نامحرم ہے۔ جب تک اُس کے ہاں بچے کی ولادت نہیں ہو جاتی تب تک اُس کی عدت ختم نہیں ہوگی اور آپ بظاہر جو مجھ پہ احسان کر رہی ہیں۔ دل سے آپ بھی یہی چاہتی ہیں۔“

شریں خالہ نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ماڑہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ ای سمیت باسط کو دیکھ کر اُس نے بڑی تیزی سے پاس پڑا دو پینہ اٹھا کر سرد جسم کے گرو لیٹا تھا۔ اُس کی یہ کوشش اضطراری تھی۔ ”باسط کہہ رہا تھا تم سے تعزیت کرنی ہے اس لیے آیا ہے۔“ ساتھ ساتھ شریں ہی بول رہی تھی۔ باسط بڑے غور سے ماڑہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں برے کی طرح جسم کو چھید رہی تھی اور ایک سرے کی طرح ٹٹول رہی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹی لگ رہی تھی پر چہرہ کمزور ہی تھا۔

”میں آتی ہوں کچھ کھانے کے لیے بنانے کا کہہ کر۔“ شریں بہانے سے باہر نکل گی تو باسط پوری طرح ماڑہ کی طرف گھوم گیا۔ ”میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے بہت افسوس ہوا ہے یا غم سے دل پھٹ گیا ہے پر جو ہوا اچھا بھی نہیں ہوا۔ کم سے کم تمہارے ساتھ بالکل بھی نہیں۔ اتنا امیر اور صاحب جائیداد تھا تمہارا مرحوم شوہر اور تم ایک جوان بیوہ کیا کرو گی کیسے زندگی گزارو گی۔ ابھی سے اکیلی ہو گئی ہو۔“ باسط کے لفظ لفظ میں سفاکی تھی۔ ماڑہ نے پہلی بار اتنے عرصے میں اُسے غور سے دیکھا جب سے وہ اُس کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ باسط نے داڑھی رکھ لی تھی۔ داڑھی نے اُس کے پورے چہرے کا تاثر ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ بڑا بڑا اور میچور لگ رہا تھا پھر جو چہرے پہ سنجیدگی اور پختگی تھی وہ کسی طور بھی یہ ظاہر نہیں کرتی تھی کہ باسط ماڑہ سے کچھ سال ہی بڑا ہے۔ اُس کا وزن بھی پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا تھا۔ رخسار بھرے بھرے ہو گئے تھے اور جبراً بھی بھاری لگ رہا تھا۔ داڑھی اُس نے کافی بڑھالی تھی۔ اپنے بیٹھنے کے انداز سے کافی پُر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ ”پیاری لگ رہی ہو اس حال میں بھی۔“ باسط کا اشارہ اُس کی بدلی ہوئی جسمانی ہیئت کی طرف تھا۔ ماڑہ جھینپ سی گئی۔ ”خیر میں پھر آؤں گا جب اس بوجھ سے آزاد ہو جاؤ گی۔ پھر تم سے بہت سی باتیں ہوں گی جو میں کرنے سکتا تھا۔ اور تمہیں

یہ کہوں گا کہ جو ہوا اُسے بھول جاؤ۔ گزشتہ زندگی کو سوچو جیسا مت۔ تمہارے حق میں اور آئندہ زندگی میں یہی بہتر ہوگا۔  
نہیں وہ نصیحت کر رہا تھا دھمکی دے رہا تھا ڈرار ہا تھا یا اپنے پُر خلوص جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔ مازہ فرق نہیں کر سکتی تھی۔

☆☆☆

در یکتا باسط کی موجودگی کی وجہ سے بے چینی ہی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اُسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ شریں  
اُسے رُکنے پر اصرار کر رہی تھی۔ مگر وہ مان نہیں رہا تھا۔ بالآخر اُس نے کہا کہ وہ رات رُکے گا نہیں البتہ رات کا کھانا ضرور  
اُن کے ساتھ کھائے گا۔ شریں خوش ہو گئی۔ لیکن میں ملازموں کی شامت آئی ہوئی تھی۔ جلدی کرو جلدی کرو کی پکار لگی ہوئی  
تھی۔ شریں نے باسط کوئی وی لاؤنج میں ہی بٹھایا ہوا تھا۔ وہیں در یکتا بھی تھی۔ وہ بار بار اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گھنے  
بالوں والی، موٹی موٹی آنکھوں والی مازہ کی نندا اُسے بڑی قابل توجہ لگی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کوئی حساب کتاب کر رہا تھا۔  
اُس کے علم کے مطابق مازہ شادی کے بعد الگ گھر میں چلی گئی تھی۔ جب کہ ابھی وہ اپنے سسرال میں تھی۔ اُس کے سسرکی  
حالت قابل رحم تھی وہ بھی یہی سوچ رہا تھا پھر اس جائیداد کا مالک و مختار کون ہے۔ یقیناً مازہ کی گھنے بالوں والی بہن بند  
ہوگی۔۔۔ جس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حیرانی ہے جسے باسط کا یوں گھور گھور کے دیکھنا ناگوار گزر رہا ہے۔ پھر گویا اُسے  
در یکتا پر ترس سا آ گیا۔ اُس نے دیکھنا موقوف کر دیا اور شریں خالہ سے باتیں کرنے لگا۔

☆☆☆

ظاہر لغاری صبح صبح لان میں بیٹھے اخبار بنی کا شوق پورا کر رہے تھے۔ اشعر تیار ہو کے اُن کے پاس سے گزر  
کر گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو ظاہر لغاری کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔ حالانکہ وہ اُن سے مل کے اللہ حافظ بول کے جا رہا  
تھا۔ ظاہر لغاری نے پیچھے پکارا تو وہ واپس آ گیا۔ ”ارے میں نے تمہیں کہا تھا کہ کسی دن ٹائم نکال کے عمر کی طرف سے  
ہو آنا۔ تم گئے نہیں ہو۔“ ”پہا میں گیا تھا کل اُن کی طرف۔ بس ذہن سے نکل گیا آپ کو بتانا۔“ ”اوہ اچھا اچھا کیسی  
طبیعت ہے عمر کی۔“ طبیعت کا تو مجھے پتہ نہیں کیونکہ وہ خود سوئے ہوئے تھے۔ اشعر کو کل کی بات یاد آ گئی تھی۔ در یکتا سے  
ملاقات ہوئی وہ کیسی تھی۔ ”جی پہا اُن محترمہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی گھڑی بھر کے لیے۔ کیونکہ اُن کے سر میں درد تھا۔  
میں جب واپسی کے لیے نکل رہا تھا تو اُن کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ دیکھنے میں ٹھیک ہی لگ رہی تھیں وہ کیونکہ بظاہر کسی  
بیماری کے آثار لگ تو نہیں رہے تھے۔“ اشعر تپا ہوا تھا۔ ظاہر لغاری اُسے غور سے دیکھنے لگے وہ کس طرح بات کر رہا تھا  
جیسے کوئی رنجش ہو دل میں۔

☆☆☆

نی الحال اشعر کو دیر ہو رہی تھی ورنہ وہ پوچھتے کہ تم در یکتا کے ذکر پہ ایک دم غصے میں کیوں آ گئے ہو۔ آخری بار  
جب وہ عمر کی طرف گئے تھے تو اُس کے بڑے بھائی اور نگزیب نے کافی عزت افزائی کی تھی سو اُن کا جی نہیں چاہا تھا۔ خود  
جانے کو۔ اسی لیے اُنہوں نے اشعر کو کہا تھا کہ اُن کی طرف چکر لگایا کرو۔ اشعر ہوتو آیا تھا پر غصے میں تھا۔ اب وہ بھی  
سوچ رہے تھے کہ آیا اشعر کے ساتھ کوئی بد اخلاق اور بد تمیزی تو نہیں کی گئی۔ ورنہ وہ اتنا جلدی غصے میں آنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

وادی نیلم کا وہی ہوٹل تھا وہی کمر تھا۔ شاہ زیب نے سفید رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُس کا چہرہ اُداس  
تھا۔ مازہ اُسے غصے اور نفرت سے دیکھ رہی تھی۔ ”مازہ بتاؤ ناں تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم نے مجھ سے لڑائی کی وہ غلط باتیں  
کیں جن کی وجہ سے مجھے غصہ آ گیا اور اس غصے میں مجھے کوئی سمجھ نہیں آئی اور گاڑی کھائی میں گر گئی۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے

ہی مجھے بہت اذیت سے گزرنا پڑا۔ اور اب تم اور شریں تائی میرے ہونے والے بچے کو قتل کرنا چاہ رہی ہو بولو کیوں تم ایسا  
کیوں کر رہی ہو۔ میں تمہیں قتل کر دوں گا اگر تم نے سوچا بھی کچھ ایسا۔“ شاہ زیب اُٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کھولے مازہ کی  
طرف بڑھنے لگا جیسے اُس کی گردن دبا دینا چاہتا ہو۔ اس دوران مازہ جو پہلے خوب اُدنچا بول رہی تھی لڑ رہی تھی ڈر چکی تھی  
اور پیچھے ہٹ رہی تھی پر شاہ زیب آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ”مجھے پتہ ہے تم نے مجھ سے ویسی محبت نہیں کی جو میرا حق تھی یا  
جس طرح میں نے تمہیں نوٹ کے چاہا۔ شریں تائی اور تم نے میری دولت سے محبت کی اور اسی خاطر تائی نے تمہیں یہاں  
شہر ہمارے گھر بھیجا تھا۔ تم اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو گئی۔ مجھ سے شادی بھی کر لی۔ تم میرے بچے کی ماں بننا  
نہیں چاہتی تھی ناں۔ یہ بچہ تمہاری خواہش کے بغیر تمہاری کوکھ میں آیا ہے اور تم اس سے جان چھڑانا چاہتی ہو تاکہ اپنی نئی  
زندگی میرے بچے کے نام و نشان کو مٹا کے شروع کر سکو۔ میں تمہیں مٹا دوں گا۔“ شاہ زیب کے ہاتھ اُس کی گردن پہ جم  
گئے۔ مازہ نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ پر اُس کے منہ سے پھنسی پھنسی روہانسی آوازوں کے سوا کچھ بھی نہیں نکل  
رہا تھا۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک چھنا کے سے جیسے سارا منظر ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے بیڈروم میں لیٹی ہوئی تھی۔ زیر و پاؤر کی  
لائٹ بھی آن تھی۔ اُسے اپنے گلے میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ مازہ کے دونوں ہاتھ اپنے گلے پہ دھرے  
ہوئے تھے جیسے وہ شاہ زیب کی گرفت سے رہائی پانا چاہ رہی ہو۔ وہ بڑی طرح ڈر گئی تھی۔ حیران بھی تھی اُس کے چلانے کی  
آواز سن کے کوئی جاگا کیوں نہیں۔ پھر خود ہی اُسے ہنسی آ گئی جب اُس کی آنکھ کھلی تھی تو اُس کے منہ سے گھٹی گھٹی آواز نکل  
رہی تھی۔ کوئی کیسے جاگنا۔

یہ عجیب سا خواب دیکھنے کے بعد دوبارہ کوشش کے باوجود اُسے نیند نہیں آئی۔ ساتھ طبیعت بھی عجیب سی ہو رہی  
تھی۔ پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ پیٹ پہ ہی رکھے ہوئے تھے۔ جیسے درد کو اندر ہی اندر دباننا چاہ رہی ہو۔  
تکلیف کے باوجود وہ شریں کو کچھ بتاتی نہیں تھی اور نہ ڈاکٹر کے پاس جاتی۔ صرف ایک دفعہ کے علاوہ وہ دوبارہ چیک اپ  
کروانے بھی نہیں گئی۔ جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ نہ اُسے اپنے کھانے پینے کا کوئی ہوش تھا۔ اکیلے میں کتنی بار اُس نے اپنے  
پیٹ پہ زور زور سے مکے مارے تو خود کو اذیت سے دوچار کیا اُلٹی سیدھی گولیاں کھائیں کہ شاید اُس کے پیٹ میں سانس  
لتی زندگی دم توڑ جائے۔ پر شاہ زیب کے ہونے والے بچے نے تو پیٹ میں حرکت بھی شروع کر دی تھی اب وہ اُسے اپنے  
وجود کا احساس دلا رہا تھا۔ اُس پہ ہنس رہا تھا تبھی لگا رہا تھا کہ کیسے مجھ سے پیچھا چھڑاؤ گی۔ میں نے آ کے رہنا ہے تمہاری  
گود میں۔ اپنی ہر کوشش میں ناکام ہونے کے بعد وہ روٹی۔

باسط جب سے اُن کے گھر سے ہو کے گیا تھا۔ زیاں کا احساس کچھ اور بھی حد سے سوا ہو رہا تھا۔ امی نے بہت  
کچھ بتایا تھا اُس کی جاب اور دیگر چیزوں کا۔ اُس نے امی کی آنکھوں میں نئی امید کے دیئے جلتے دیکھے تھے۔ مازہ نے غور  
کیا تو ایسے ہی امید کے ہزاروں دیئے اُسے اپنے اندر بھی روشن ہوتے محسوس ہوئے۔ باسط کیا آیا تھا اُسے نئی زندگی کا  
ایک پیام ملا تھا۔ وہ امید دلا کے گیا تھا۔ اپنے آنے کا کہا تھا جیسے دبے دبے لفظوں میں اپنے انتظار کا بول گیا ہو۔ تھوڑی دیر  
ہی اُس کے پاس بیٹھا تھا پر وہ اسی طلسم میں قید تھی۔ اب اس ہونے والے بچے سے اُسے کوئی خاص دلچسپی یا لگاؤ نہیں تھا۔  
لگاؤ تو پہلے بھی نہیں تھا۔ بحالت مجبوری نو ماہ یہ بوجھ برداشت کرنا ہی تھا۔ اس بوجھ سے آزاد ہونے کے بعد ہی باسط نے آنا  
تھا۔ تب تک اُسے انتظار کرنا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی پر نہیں نیند دوز کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔ پھر  
ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا گیا خواب بھی پریشان کن تھا۔ شاہ زیب مرنے کے بعد بھی اُس کی زندگی میں موجود تھا۔ چاہے

خواب کے راستے ہی یہی اور اپنی نشانی کے ساتھ۔ اُس پہ ہنستا تھیمے لگاتا۔

☆☆☆

شریں اور نگزیب کو غصے سے دیکھ رہی تھی اور وہ بھیگتی بلی بنا صفائیاں دے رہا تھا۔ اُسے بہت جلدی تھی سب کچھ ایک دم سے حاصل کرنے کی۔ پر اور نگزیب سکون اور آرام سے سب کام کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر شریں کا رویہ اور غصہ اُسے کوفت سے دوچار کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شاہ زیب کے گرتے بزنس کو سہارا دینے کے لیے دریکتا سے کہو۔ وہ تو اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ کہتی تھی۔ پر اور نگزیب نے اُسے ابھی تک یہ نہیں بتایا تھا کہ شاہ زیب کے جس گرتے بزنس کو سہارا دینے کی بات شریں کر رہی ہے وہ تو کب کا زمین بوس ہو چکا ہے اور اب اُس کا لمبہ ہی بچا ہے۔ شریں عورت تھی اور نگزیب کے خیال میں ناقص العقل۔ وہ اس قابل نہیں تھی کہ اُسے کسی راز میں شریک کیا جاتا۔

”جو بھی آتا ہے یہی پوچھتا ہے کہ ہم عمر کا علاج کروار ہے ہیں کہ نہیں کہاں سے کروار ہے ہیں کس ڈاکٹر سے کروار ہے ہیں۔ اگر کروار ہے ہیں تو علاج سے فائدہ ہو رہا ہے کہ نہیں۔ کبھی ظاہر نگاری چلا آ رہا ہے اور کبھی اُس کا بیٹا۔ کہ جی عمر انکل کا پتہ کرنے آیا ہوں۔ ہم کب تک سب کو جواب اور صفائیاں دیتے رہیں گے۔ کسی کو کیا تکلیف ہے عمر نے آپ کا ہم سے خونی رہشت ہے۔ اوروں کو کس بات کی فکر ہے ہم جو بھی کریں۔“ شریں ہاتھ نچا نچا بول رہی تھی۔ اور نگزیب نے ذرا بھی برا نہیں منایا مسکرانے لگا۔ شریں اس عالم میں اور نگزیب کی مسکراہٹ سے اُلجھ گئی۔ ”آپ کیوں ہنس رہے ہیں۔ میں پریشان ہوں اور آپ میری حالت سے لطف لے رہے ہیں۔“

”میں تمہاری حالت سے لطف نہیں لے رہا ہوں آئندہ کا سوچ کے خوش ہو رہا ہوں کہ عمر علاج کے لیے باہر چلا جائے گا اور دریکتا اُس کے ساتھ ہوگی۔ ظاہر ہے عمر کے ساتھ کسی کو تو ہونا چاہیے تو بیٹی سے زیادہ کون اُس کا خیال رکھ سکتا ہے۔“ شریں بھی مسکرانے لگی۔ ”ماثرہ کا ہونے والا بچہ بھی تو اپنے دادا کی جائیداد کا وارث ہے۔ اگر دریکتا اپنی خوشی سے بھائی کے خون کو خوشی خوشی اپنے کاروبار اس گھر یا دیگر جائیداد کا وارث نامزد کر دے تو یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں ہوگی ناں۔“ بالکل بھی نہیں۔ ایسا صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ کہ بہنیں خوشی خوشی بھائیوں کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہوتی آئی ہیں۔ عورتیں مردوں کی خوشی پر اپنی خوشی اپنا حق سب کچھ قربان کرتی رہی ہیں اگر دریکتا اپنے ہونے والے بھتیجے یا بھتیجی کے حق میں اپنی جائیداد سے دستبردار ہو جاتی ہے تو یہ کوئی نئی تاریخ رقم کرنے والی بات نہیں ہوگی ایک عام سادہ واقعہ ہوگا۔ جسے لوگ جلد بھول بھال جائیں گے۔ پر یہ سب پیار و لاڈ اور نرمی سے کرنے والا کام ہے۔ دریکتا معصوم سی بچی ہی تو ہے جسے دنیا کا زیادہ پتہ نہیں ہے۔ اُسے ان چیزوں سے کہاں پالا پڑا ہے۔ جو ہم سوچ رہے ہیں۔ عمر نے اس کا نکاح کر کے کام مشکل کر دیا ہے۔ لیکن ہارون یا نوید کے کسی بیٹے کے ساتھ اُس کا نکاح ہوتا تو ہمارے لیے بہت مشکل ہوتی۔ جو میری پلاننگ ہے اس پہ عمل درآمد کرنا مشکل ہوتا۔ ظاہر نگاری اور اُس کا بیٹا ہمارے خاندان سے نہیں ہے یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ اور نگزیب آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”اُس دن یہاں آیا تو میں خائف سی ہو گئی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہماری راہ میں مزاحم ہو۔ دریکتا کی جائیداد اُسے بھی تو لالچ میں ڈال سکتی ہے۔“ شریں کے خدشات اپنی جگہ تھے۔ ”نہیں نہیں دریکتا کی جائیداد اُسے لالچ میں نہیں ڈال سکتی۔ ظاہر نگاری خود بہت ہی خوشحال خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس خاندان سے جہاں عورت کی دولت و جائیداد پہ نظر رکھنا مردانگی کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔ یہ فکر تم چھوڑ دو۔“ کیسے چھوڑ دوں میں اشعر کو دیکھ کے خوفزدہ ہو گئی تھی۔“ کہاناں مت خوفزدہ ہو۔ اشعر جیسے پولیس آفیسر بہت دیکھے ہیں۔ تم بس یاد رکھو کہ

بزرگ ملک سے باہر لے کے جانا ہے علاج کی خاطر۔“ ٹھیک ہے جو آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔“ شریں خلاف توقع بہت ذرا ہنرداری سے بولی۔ اور نگزیب سیدھا ہو کر اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ شریں جھینپ کے نظر چرائی۔

☆☆☆

باسط جس شخص کے لیے کام کرتا تھا اُس کی اپنے نائب سے اُن بن ہو گئی تھی۔ نائب کا جھکاؤ شروع سے ہی باسط کی طرف تھا۔ وہ اُسے اُس کی ہوشیاری اور سمجھداری جو چالاکی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی کی وجہ سے بہت پسند کرتا تھا۔ اب اس سے ان اختلافات کے بعد وہ مکمل طور پہ باسط کا حمایتی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ باسط کے ساتھ مل کے اپنا آزادانہ کام شروع کرے۔ پر جانے کیوں باسط نے ابھی تک اُسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ باسط اور اُس کے نائب جیسے لوگوں میں اپنی کم عمری کے باوجود بہت جلد مقبول ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ اچھی آفر کا لالچ دے کے باسط سے توڑنے کی کوشش کر چکے تھے۔ پر ایسی ہر آفر کا جواب اُس نے نفی میں دیا تھا۔ اُسے پتہ تھا ان لوگوں سے غداری کا دوسرا مطلب موت ہے۔

وہ ہوشیار بھی تھا اور اُسے زندگی سے پیار بھی تھا۔ ”وہ بہت کچھ حاصل کر چکا تھا۔ باسط کے نائب نے ایک ایسی آفر کی کہ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے کہا کہ ابھی تم میرے ساتھ کام کرو۔ بندے میرے پاس موجود ہیں۔ تم میرے پاس آ جاؤ۔ جب تمہارا دل چاہے چھوڑ کے چلے جانا۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ ساری زندگی کے لیے ہاندھ کے نہیں رکھوں گا۔“ آخری بات ایسی تھی کہ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ بھر بھی سوچنا ضروری تھا اُس نے چند دن کی مہلت مانگ لی۔ باسط کا نائب خوش تھا۔ اُسے یقین تھا سوچنے کے بعد باسط کا جواب ہاں ہی میں ہوگا۔ وہ انکار نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ آفر ہی ایسی تھی۔ ہر شخص نارمل زندگی گزارنے کی خواہش رکھتا ہے جس میں کوئی خوف خطرہ اور جان ہتھیلی پہ لے کے پھرنے والا کوئی کام نہ ہو۔ ایک گھر یلو بیوی ہونے کی سہولیات ہوں۔ ایسی خواہشات باسط کے دل میں بھی تھیں۔ کیونکہ اُس نے باسط کے نائب کو بتایا تھا کہ اُس کی ایک کزن ہے جسے وہ دل ہی دل میں چاہتا تھا۔ اُس کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ وہ لڑکی اُس کی بیوی بنے۔ پر اُس کا رشتہ کہیں اور طے ہو گیا۔ اب اُس لڑکی کے شوہر کی ڈیوٹی تھی۔ باسط نے اُسے دل کی بات بتائی تھی کہ وہ اب بھی اُس لڑکی سے شادی کا خواہش مند ہے۔ باسط اُن لوگوں کے ساتھ رہ کے بہت سفاک اور خود غرض ہو گیا تھا۔ ایسی نازک بات باسط کے منہ سے سن کے باسط کے نائب کو حیرانی ہوئی تھی۔ خیر وہ جس جگہ اور جس پیشے میں تھا وہاں ان باتوں پہ زیادہ دیر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ اپنے اپنے تقاضے اور نزاکتیں تھیں۔ وہ زیادہ دیر کھل کے حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کیونکہ باسط کے ساتھ ایک معاملے میں اختلاف بہت خطرناک رُخ اختیار کر گیا تھا اس لیے اُس نے باسط کو اپنے ساتھ مل کے کام کرنے کا آئیڈیا دیا تھا۔ کچھ اور بھی لوگ تھے جو اُن کے ساتھ کام کرنے کے معاملے میں سنجیدہ تھے کیونکہ منافع بہت زیادہ تھا خطرہ بھی تھا پردہ خطرے کو خاطر میں لانے والے کمزور لوگ نہیں تھے۔ انہیں پتہ تھا وہ اپنے اگلے سانس کی بھی گارنٹی نہیں دے سکتے آئے گی کہ نہیں۔ دولت کی ہوس نے سوچنے کی طاقت ہی چھین لی تھی۔ پر باسط بھی سوچ رہا تھا۔ ہر پہلو کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ بھی رہا تھا۔ اُس کے بعد اُس نے اپنا فیصلہ باسط کے نائب کو حاشا تھا۔ جو بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

دریکتا کالج سے لوٹی تو پورے گھر پہ بڑی غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ جب سے سارہ آئی تھی اُس کا موجودگی میں خاموشی کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ تیز آواز میں خوب دھوم دھڑکے والا میوزک سنتی تھی۔ اب اُس نے



اپنا کمرابھی بذل لیا تھا۔ شاہ زیب کے نیندروم کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ دریکٹانے اُس کی موت کے بعد اُس کا بیڈروم لاک کر دیا تھا۔ ساڑھ نے ایک دن چابی مانگی تو اُس نے دے دی۔ اُس نے سوچا کہ ویسے ہی مانگی ہے۔ ساڑھ نے اپنا مختصر سا سامان اُدھر ہی سیٹ کر دیا۔ دوسرے دن دریکٹانے شاہ زیب کے کمرے سے آتی تیز چھپتے میوزک کی آواز سنی تو آئی۔ اندر ساڑھ چیخڑپے بیٹھیں پاؤں ہلارہی تھی۔ پاس ہی اُس کے جوتے پڑے تھے اور سامنے ڈریسنگ ٹیبل پہ سن بلاک لوشن مختلف کریمیں، لپ اسٹک، نیل پالش اور ای نوعیت کی باقی چیزیں بھی رکھی نظر آ رہی تھیں۔ دریکٹا کو غصہ آ گیا۔

”ساڑھ یہ شاہ زیب بھائی کا کمرہ ہے میں نے خود لاک کیا تھا۔ اس کمرے میں اُن کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔ تمہیں اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔“ ساڑھ تو جیسے لڑنے کو تیار بیٹھی تھی شروع ہوگی۔ ”یہ کمرہ اُن نے لے لیا ہے۔ تمہارا بھائی تھا تو میرا بہنوئی بھی تھا۔ اور کن یادوں کی بات کرتی ہو۔ شاہ زیب بھائی یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں اور اپنی یادیں بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ تم بھی حقیقت کی دنیا میں واپس آؤ۔“ اُس کی زور زور کی آوازوں پہ شریں اور ماڑھ بھی اُدھر آ گئیں۔ ”کیوں شور کر رہی ہو ساڑھ۔“ ماڑھ بہن سے مخاطب تھی۔ ”میں نے اس کمرے میں اپنا سامان رکھا ہے تو یہ شور کر رہی ہے کہ یہ میرے بھائی کا کمرہ ہے اس کمرے میں اُن کی یادیں ہیں تم اپنا سامان اٹھاؤ اور یہاں سے جاؤ۔“ ساڑھ نے کچھ بچ اور کچھ جھوٹ کی آمیزش سے واقعے کو زیادہ سے زیادہ مزے دار بنا کے پیش کیا تو ماڑھ کو غصہ آ گیا۔ ”اُس گھر پہ صرف تمہارا حق نہیں ہے میرا بھی ہے سمجھیں تم۔ ساڑھ اُدھر ہی رہے گی۔ دیکھتی ہوں کس میں اتنی جرأت ہے جو تمہیں یہاں سے نکالے۔“ دریکٹا وہیں خاموش ہوگی۔ وہ تو بول کے پچھتا رہی تھی۔ ماڑھ بھابھی حق پہ آ گئی تھی۔ حالانکہ اُس نے ایسا کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ اُن سب کی یہاں اپنے گھر میں آمد کے بعد وہ خود اپنے خول میں سمٹ گئی تھی۔ خود کو محدود کر لیا تھا۔ اتنے میں شریں تائی آگے بڑھیں اور خاموش کھڑی دریکٹا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ ”ارے کیا کرتی ہو۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہے یہ کہ اس کمرے میں شاہ زیب کی یادیں ہیں۔ ایک بھائی کا درد بہن ہی سمجھ سکتی ہے۔ یہ اس کے بھائی کا کمرہ ہے وہ یہاں رہتا رہتا تھا۔ اُس کی چیزیں اُس کی نشانیاں ہیں یہاں۔“ دریکٹا کو گلے لگائے وہ ہولے ہولے سسکنے لگی تو دریکٹا بھی رونے لگی۔ ”تم خوش قسمت بہن ہو کہ شاہ زیب تمہارے پاس ایک اور نشانی چھوڑ گیا ہے۔ ماڑھ کچھ عرصے بعد شاہ زیب کے بچے کو جنم دینے والی ہے۔ تم اُس کی پھوپھو کہلاؤ گی۔ شاہ زیب کا خون شاہ زیب کی اولاد بھائیوں کی اولاد میں بہنوں کو بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ وہ تو سب کچھ وارد ہتی ہیں۔ اُن پہ پھر یہ سب شاہ زیب کے بچے کا ہوگا۔“ شریں ہولے ہولے اُس کے بالوں کو سہلارہی تھیں۔ انہوں نے آنکھ کے اشارے سے ساڑھ اور ماڑھ کو یہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ دریکٹا شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے ذکر پہ خوش ہوگی۔ اُس کی آنکھوں میں خواب جسنے لگے۔ اپنے بھائی کے خون کے ساتھ اُس کا رشتہ بھی کتنا پیارا تھا۔ جس نے لمحہ بھر کے لیے اُسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔

”تمہارے تایا بتا رہے تھے کہ شاہ زیب کا کاروبار تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ بنیادیں تو بل ہی چکی ہیں کیونکہ شاہ زیب کو اس کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے خسارہ ہی ہوتا رہا۔ تمہارے تایا اور اشعر نے بہت کوشش کی کسی نہ کسی سنبھال دینے کی۔ بینک سے لون لیا، اپنی زمین گروڈی رکھ دی پر کچھ فائدہ نہیں ہوا زمین گروڈی رکھنے کا بھی۔ بینک نے ہماری زمین ضبط کر لی ہے کیونکہ وقت پہ ادا کیے گئے نہیں۔ اُس کا کاروبار تباہ ہوا ہی ہوا ہماری زمین بھی لگی۔ اب اگر کوئی انویسٹ منٹ کرے تو بات بن سکتی ہے ورنہ شاہ زیب کا قائم کیا ہوا کاروبار گیا سمجھو۔“ شریں جذباتی واڈ کھیل رہی تھی۔ اُس کی توقع کے عین مطابق دریکٹا پریشان ہوگی۔

”تائی آپ تایا سے کہیں ناں کہ انویسٹ منٹ کریں۔“ شریں نے سر پہ ہاتھ پھیر کے دہائی دی۔ ”ارے میں اپنی دیر سے یہی تو بتا رہی ہوں کہ اپنی زمین تک تمہارے تایا نے گروڈی رکھ دی ہیں۔ کہاں سے انویسٹ منٹ کریں۔ اچھا خاصا پیسہ ہو تو بات بن سکتی ہے۔ یہ لاکھوں کا کام نہیں ہے۔“ تائی پھر کیا ہو سکتا ہے۔ اب اُس نے کام کی بات کی تھی۔ شریں خوش ہوگی۔ شکاری خود چل کے پھندے کی طرف آ رہا تھا۔ ”ہاں اگر تم شاہ زیب کے کاروبار میں انویسٹ منٹ کرو تو اُس کا کاروبار بچ سکتا ہے۔ کل جب اُس کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا تو وہی وارث ہوگا ناں۔ ہم تو نہیں ہوں گے ناں۔ نہ ہمیں کوئی غرض ہے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے ہمارے پاس۔ ہم نے کسی کے پیسے پہ نظر ہی نہیں رکھی ہے۔“ شریں نے بڑی مہارت سے صفائی بھی پیش کر دی اپنی۔ دل میں چور تھا ناں اپنے حالانکہ دریکٹا کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا جس طرف شریں سوچ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں بھائی کے کاروبار میں انویسٹ منٹ کرتی ہوں۔ ابھی نیچر کونون کرتی ہوں وہ گھر ہی آجانے گا میں اُسے پوچھتی ہوں۔“ ”ارے نہ نہ نیچر کونون کر کے گھر بلانے کی کیا ضرورت ہے تم اپنے تایا سے بات کر لو۔ وہ خود ہی سب کچھ کر لیں گے۔“ شریں اُس کی حماقت پہ ایک دم گھبرا سی گی۔ ”ٹھیک ہے تائی جب تایا گھر آجائیں تو ان سے بات ہوتی ہے۔“ ”جیتی رہو میری بچی۔ تم ایسا کر کے شاہ زیب کے ہونے والے بچے پہ احسان کرو گی۔ جو تیری کا سر ٹیفیکٹ ہاں کے پیٹ سے ہی لے کے پیدا ہوگا۔“ شریں نے ایک بار پھر دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ لیا اور رونے لگی۔ اُس کا ساتھ دریکٹا بھی پوری رفتار اور طاقت کے ساتھ دے رہی تھی۔ مشکل کام دریکٹا نے نہایت آسانی کے ساتھ کر دیا تھا۔ شریں نے اورنگزیب کو گھر بلوایا۔ دریکٹا کے علم میں لائے بغیر۔ انہوں نے بھی یہ ظاہر کیا جیسے وہ کسی کام سے اچانک آنے ہوں۔ دریکٹا پاس نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی کارگزاری بڑی خوشی سے مجازی خدا کے گوش گزار کی۔ ”اب وہ کہتی ہے کہ میں کیسے انویسٹ منٹ کروں میں یہاں بلواتی ہوں آپ نے جو کرنا ہے اُسے بتادیں۔“ شریں کے قدم خوشی میں کہیں سے کہیں پڑ رہے تھے۔ چند منٹ بعد دریکٹا شریں کے ساتھ آ گی۔ ”میری بیٹی کیا کہہ رہی ہے۔“ تایا اورنگزیب نے اُسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ”تایا جان تائی نے مجھ سے شاہ زیب کے کاروبار کا ذکر کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ ختم ہو یا اُسے ختم کر دیا جائے اس لیے میں چاہتی ہوں اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں کروں کیونکہ میں زیادہ نہیں جانتی اس بارے میں۔“ اورنگزیب اُس کی بات سن کے خاموشی میں ڈوب لے۔ بڑی دیر بعد سر اٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔ اُن کی خاموشی سے وہ بے قرار ہوگی۔ ”بیٹی بہت پیسہ چاہیے اس کے لیے۔ یہ کوئی لاکھوں کا کاروبار نہیں تھا یا ہزاروں کا نہیں تھا شاہ زیب نے اپنی بے ہوشی اور ناتجربے کاری سے اپنا سب سرمایہ اس میں جھونک دیا تھا۔ میں کیا بتاؤں تمہیں۔“ وہ ہچکچاہٹ کا شکار لگ رہے تھے۔ ”تایا جان پھر بھی کچھ بتائیں تو سہی۔“ وہ منت ریز لہجے میں بولی تو وہ ٹھنڈی سانس لے کے رہ گئے۔ ”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اس کے لیے پیسہ بہت چاہیے ہو سکتا ہے۔ تمہارا سارا بینک بیلنس اس میں خرچ ہو جائے۔ اور کل کو تم مجھے اپنے سگے تایا کو الزام دو کہ میں نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا۔ نہ بابا میں کل کلاں کو کوئی الزام اپنے سر نہیں لے سکتا۔ حالانکہ میں تو سب کی بھلائی کا ہی سوچ رہا ہوں۔ مگر کبھی کبھی اچھائی اپنے ہی گلے پڑ جاتی ہے اورنگزیب نے بڑی چالاکی سے ہال اُس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔“ تایا جان آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میں کیوں آپ کو الزام دوں گی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بے شک سارا بینک بیلنس ختم ہو جائے مجھے پروا نہیں ہے۔ پاپا کے بعد آپ ہی ہمارے بڑے ہیں اور یقیناً ہماری بھلائی کا ہی سوچیں گے۔“ وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ ”پھر بھی بیٹی اچھی طرح سوچ لو۔ میں تو شاہ

زیب کے اُس بچے کے بارے میں پلان کر رہا ہوں جو دنیا میں آنکھ کھولے گا تو تیتیم ہوگا۔ اگر شاہ زیب کا کاروبار بیخ جاننا ہے تو اُس کے بچے کے لیے بہت فائدہ مندہ ہوگا۔ شاہ زیب کا بچہ اتنے بڑے خاندان کا فرد ہوگا تم کبھی نہیں چاہو گی کہ وہ کسی کا ضرورت مند اور محتاج ہو۔ آخر کو اُس کو پھوپھو اور دادا دولت و جائیداد کے مالک ہیں کچھ اس کو تو بھی ملنا چاہیے نا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔ اور نگزیب نے دریکتا کے سر پہ ہاتھ پھیرا جیسے اُسے تائید چاہے ہوں۔

”تایا جان آپ بیٹھیں میں اپنے کمرے سے ہو کے ابھی آئی۔ وہ بجلت میں اُٹھ گی۔ اور نگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے شریں کی طرف دیکھا۔“ ”دیکھا تم نے آرام آرام سے کام کرنے کا نتیجہ۔“ وہ سارا کریڈٹ خود لینا چاہے تھے۔ عمر زیب اگر ہوش میں باشعور ہوتے تو اپنے بھائی کی اس کا پلٹ پہ بہت حیران اور دکھی ہوتے۔ وہ تو شریں کی طرح اتنے خود غرض نہیں تھے۔ شریں بھابھی تھی وہ تو بھائی تھے۔ اپنا خون ایک باپ کی اولاد۔ وہ کیوں اتنے خود غرض ہو گئے تھے صرف اور صرف اپنے مفاد اور اپنی اولاد کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

دریکتا جلد ہی واپس آ گی۔ وہ اپنی الماری سے چیک بک نکال کے لائی تھی۔ شریں اور اورنگزیب اُس کے ہاتھوں کی طرف ہی دیکھ رہے تھے جس میں چیک بک اور بال پوائنٹ دبا ہوا تھا۔ دریکتا نے چیک بک پہ سائن کیے اور پھر صفحہ پھاڑ کے تایا اورنگزیب کی طرف چیک بڑھایا۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا کہ دریکتا نے کتنی رقم کا چیک لکھا ہے۔ اُن کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ یہ بلینک چیک تھا یعنی وہ اس میں اپنی مرضی سے جتنی رقم چاہے لکھ سکتے تھے۔ انہوں نے اندرونی خوشی کو سنجیدگی اور رعب کے پردے میں چھپا لیا۔ ”دریکتا تمہارا بہت بہت شکریہ جو تم نے مجھ پہ اتنا اعتبار کیا۔ میں اس اعتبار کو کبھی نہیں توڑوں گا۔ اب میں ان پیسوں سے شاہ زیب کی اولاد کے لیے کچھ کروں گا۔“ ”تایا جان اور پیسوں کی جب بھی ضرورت پڑی مجھے بتائیے گا۔ کسی قسم کی ہچکچاہٹ دل میں مت لائیے گا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے جو آپ نے مجھے شاہ زیب بھائی کے بزنس کے بارے میں اصل صورت حال کے بارے میں آگاہ کیا۔ ورنہ مجھے کب پتہ چلتا تھا۔“ وہ اُلٹا اُن کی ممنون اور احسان مند ہو رہی تھی۔ ”ہاں بیٹی تمہیں ساتھ ساتھ میں سب بتاتا رہوں گا۔ بلکہ میں تمہیں شاہ زیب کے افس بھی لے جاؤں گا تاکہ کسی بھی قسم کا شک و شبہ اگر تمہارے دل میں ہے تو ختم ہو جائے۔“ ”ارے نہیں تایا جان میں کیوں شک کروں گی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

اُس نے شرمندہ نگاہوں سے تایا کی طرف دیکھا تو انہوں نے شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر اُس کے دیئے چیک کو حفاظت سے والٹ میں رکھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ کتنی رقم اکاؤنٹ سے نکلائی جائے۔

☆☆☆

باسط نے سابقہ باس کے نائب کے ساتھ کام کرنے پہ آمادگی ظاہر کی تو اُس نے خوشی سے باسٹ کو گلے لگا لیا۔ ”تم نے آج میری بہت بڑی فکر ختم کر دی ہے ورنہ میں آج سوچ رہا تھا کہ اگر تم نے جواب نہیں دیا تو میں ہاشم کے ساتھ مل کے کام شروع کروں گا۔“ اُس نے اپنے ایک اور ساتھی کا نام لیا۔ ”بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے اس کے بعد ہی فیصلہ کرنا ہے انسان۔“ باسٹ سنجیدہ لہجے میں بولتا ہوا اُسے الگ ہو کے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ ”تمہاری یہی دور اندیشی اور دیدہ شناسی ہی تو ہے جس کی وجہ سے میں نے یہ پلان کیا تھا کہ تمہارے ساتھ مل کے کام شروع کیا جائے۔ ہم دونوں کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مال میرا ہوگا آدی بھی میں دوں گا تم میرے دست راست ہو گے۔ تم نے سب کچھ دیکھنا ہوگا۔“ ”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“ ”اِس میں تمہارے لیے جو سب سے بڑا فائدہ ہے وہ یہ ہے کہ تم جب بھی اپنی مرضی سے کاروبار سے الگ

ہونا چاہو جو جانا میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ راضی خوشی جانا۔“ فی الحال تین چار دن بعد میرے فلیٹ آجانا۔ وہاں سے سکندر کے پاس جانا ہے۔ تمہیں مال دکھانا ہے۔ بہت ہی اعلیٰ اور عمدہ کوالٹی کا مال ہے۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں اُس کی ڈیمانڈ کے ساتھ ساتھ قیمت بھی بہت زیادہ ہے۔ چند پھیروں میں ہی مال ادھر سے ادھر کر کے ہم بے اندازہ دولت کما لیں گے۔“ اُس کی آنکھوں میں حسین سپنے دکھ رہے تھے۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو ہمیں آغاز کر دینا چاہیے۔ پھر میں کچھ عرصے بعد اپنے گھر جاؤں گا اور شادی کروں گا۔“ باسٹ نے آئندہ کا پلان بتایا تو نائب نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ میری دعا ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ میں تو اپنی محبت کو پائی نہیں سکا پر تم ضرور پالو گے۔ کیونکہ تم میں جذبہ بھی ہے۔ جرأت بھی اور ہمت بھی اور سب سے بڑھ کر تم میں قوت فیصلہ بھی موجود ہے۔ تم راہ میں آنے والی ہر مشکل کا مقابلہ کر سکتے ہو۔“ باس کے نائب کا نام تو اظہر تھا پر زیادہ لوگ اُس کے اصل نام سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی نام سے پکارتے تھے۔ باسٹ اپنی تعریف پہ پھول سا گیا۔

☆☆☆

اورنگزیب دریکتا کو شاہ زیب کا افس دکھانے پہ بھند تھے مگر وہ انکار کر رہی تھی۔ ”تایا جان میں نے کیا کرنا ہے دیکھ کے۔ آپ سب معاملات دیکھ رہے ہیں یہی کافی ہے۔“ بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار دیکھ لو ساتھ فیکٹری پہ بھی نظر ڈال آنا جہاں مال تیار ہوتا ہے۔ میں نے تمہارا پیسہ کن کن جگہوں پہ خرچ کیا ہے تمہیں وہ سب حساب بھی چیک کروانا ہے۔ ”ایسا نہ ہو کہ کل کوئی بدخواہ میرے بارے میں بدگمان کر دے۔“ ”تایا جان ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کے بارے میں کچھ برا سوچوں۔ آپ نہ پریشان ہوں۔ مجھے آپ پہ پورا یقین ہے۔“ دریکتا کا لہجہ اُس کے اعتبار کا گواہ تھا۔ اورنگزیب پر مسکون ہو گے۔ اُس نے اُن کی ایک اور پریشانی دور کر دی تھی۔

☆☆☆

منیجر صاحب گھر تشریف لائے تھے۔ سارہ نے فوراً جا کے شریں کو اطلاع دی۔ شریں مغرور قدموں سے چلتی و اکڑی گردن کے ساتھ صوفے پہ اُن کے سامنے بیٹھی تھی۔

”ہاں جی کیا کام ہے آپ کو جو اس طرح آپ کو گھر آنے کی زحمت کرنی پڑی۔“ وہ نخوت سے ناک چڑھا کے بولی۔ منیجر صاحب کو اُن کا یہ انداز ہضم نہ ہو سکا۔ وہ عمر زیب کے منہ چڑھے تھے۔ اور عمر اُن پہ بے پناہ اعتماد کرتے تھے۔ وہ کوئی بھی کاروباری فیصلہ اُن کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ جب انہوں نے اپنے کاروبار اور جائیداد کا نصف حصہ شاہ زیب کے حوالے کیا تو انہیں بتایا کہ انہیں اپنا یہ کاروبار وہ دریکتا کے حوالے کریں گے اور وہی اُس کی مالک ہوگی۔ کچھ عرصے بعد بڑی رازداری سے انہوں نے وہ کام کر دیا تھا۔ اب حالات ویسے نہیں رہے تھے۔ عمر زیب بزنس کی دیکھ بھال سے خود معذور تھے۔ ایسے میں دریکتا کو بولڈ اسٹیپ لینا چاہیے تھا۔ پر وہ خاموش تھی۔ منیجر صاحب نے دبے لفظوں میں دو تین بار اُسے کچھ بتانا چاہا پر وہ نہیں سمجھ سکی۔ وہ کھل کے بول بھی نہیں سکتے تھے۔ کھل کے بولتے تو نوکری سے فارغ کر دیئے جاتے۔ ویسے بھی وہ کیا کہتے۔ اُن کے اپنے رشتہ دار تھے سب۔ اُن کے مقابلے میں وہ منیجر صاحب کی کئی کسی بھی بات کا کیسے اعتبار کرتی۔ پھر بھی آج اُن سے رہا نہیں گیا تو وہ اُن کے گھر آئے۔ افس میں تو عمر زیب کے تینوں بھائیوں کا قبضہ تھا۔ وہ کچھ کر ہی نہیں پارے تھے۔ ”مجھے دریکتا صاحبہ سے کچھ فائلز سائن کروانی تھی۔ اس لیے گھر آیا ہوں۔“ حتی الامکان انہوں نے اپنے لہجے کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کی۔ آپ اورنگزیب صاحب ہاتھ فائلز بھجوادیتے۔“ صاحب لوگوں سے میں

نو کروں والے کام لے سکتا ہوں۔ انہوں نے بھی طنز یہ انداز میں کہا تو شریں کی تخی تخی ہی گروں کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔  
 ”ٹھیک ہے میں دریکتا کو بلواتی ہوں۔“ شریں نے پاس سے گزرتی نوکرانی کو آواز دے کر دریکتا کو بلائے گا  
 کہا۔ دریکتا کے آنے پہ شریں ادھر ہی بیٹھی رہی ایک پل کے لیے بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوئی۔ اس کی نگاہ، فیجر اور دریکتا  
 کی حرکات و سکنات پہ تھی۔ وہ کچھ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ اس نے کان ادھر ہی لگا دیئے۔ ”آپ خود آفس کا چکر لگایا  
 کریں کبھی کبھار۔“ وہ دریکتا سے کہہ رہے تھے۔ شریں کی آنکھیں رنگ بدلنے لگی۔ اسے فیجر پہ بہت غصہ آیا۔ سائینس  
 کروانے آیا تھا اور ساتھ مشورے دے رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے میں کل تایا جان کے ساتھ آؤں گی خود۔“ دریکتا اس بار اُن کی  
 فرمائش یا مشورہ رد نہیں کر پائی تھی۔

”ضرور آئیے گا میں انتظار کروں گا۔“ فیجر صاحب کا لہجہ بہت مخلصانہ تھا۔ اس سے اُن کی اپنی کوئی غرض وابستہ  
 نہیں تھی۔ ”عمر صاحب کیسے ہیں اب۔“ ”چپا کی حالت پہلے جیسی ہے کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔“ دریکتا یکدم اُداس ہو گئی  
 تھی۔ ”تو کون سے ڈاکٹر اُن کا ٹریٹ منٹ کر رہے ہیں۔“ ”کوئی بھی نہیں۔“ ”کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔“ ”اصل میں  
 ڈاکٹر نے جو دو انہیں پہلے تجویز کی تھی وہی دے رہے ہیں چپا کو۔ تایا جان لے کے گئے تھے۔ چپا کو ڈاکٹر کے پاس۔  
 انہوں نے بتایا ہے کہ چپا کی حالت ایسے ہی رہے گی۔ اُن کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ باقی جو دو اینجان  
 ہم انہیں استعمال کروا رہے ہیں ذہ دورے کی شدت کم کرنے کے لیے ہیں۔ پہلے چپا کو دورہ زیادہ دن کے بعد پڑتا تھا  
 اب اس کے دورانیے میں کمی آگئی ہے۔ تایا جان بتا رہے تھے کہ چپا کو منفل ہاسپٹل یا کسی نفسیاتی علاج گاہ  
 میں نہ داخل کروانا پڑ جائے۔ کیونکہ اب اُن کا رویہ گھر والوں کے ساتھ خطرناک اور جارحانہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب  
 تفصیل بتاتے ہوئے دریکتا کا لہجہ نرم آلود سا ہو گیا تھا۔ بیچارے فیجر صاحب خود اُداس ہو گئے۔ ”کیا میں انہیں ایک نظر  
 دیکھ سکتا ہوں۔“ ”ہاں آئیے میرے ساتھ۔“ دریکتا انہیں چپا کے کمرے کی طرف لے آئی۔ اُس نے باہر سے کمرے کا  
 لاک کھولا۔ وہ حیران حیران سے اُس کے پیچھے داخل ہوئے۔ عمر زیب صاحب گہری نیند میں تھے۔ شریں بھی اُٹھ کے اُن  
 کے پیچھے آگئی تھی۔ فیجر صاحب تاسف سے سوئے ہوئے عمر زیب کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں عجیب سی وحشت ہو رہی تھی۔  
 انہیں پس منظر میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ مگر یہ گڑبڑ کیا تھی انہیں معلوم نہیں تھا۔ دریکتا کے چہرے پہ معصومیت اور انجان  
 پن کی تحریر واضح تھی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے کہ شریں کو دیکھ کے اپنے سوال کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ وہ ملی کی  
 طرح دبے قدموں آئی تھیں۔ شکر تھا کہ انہوں نے دیکھ لیا تھا۔

فیجر صاحب اُس کے بعد جلد ہی اجازت لے کے رخصت ہو گئے۔ ”اس فیجر کی دھلائی بہت ضروری ہے۔“  
 شریں اُس کے جانے کے بعد سوچ رہی تھی۔ ابھی یہ فکر اُس کے سر پہ تھی کہ رات کو دریکتا نے تایا اور نگزیب سے کل آٹھ بج  
 جانے کا کہہ دیا۔ اُس نے فیجر کا ذکر گول کر دیا پر شریں اُس سے پہلے ہی یہ بات اُن تک پہنچا چکی تھی۔ اور نگزیب پریشان  
 سے ہو گئے۔ ”ایسا ہے کہ میں کچھ دن کے لیے شہر سے باہر ایک ضروری کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ وہاں سے آؤں گا تو  
 آفس جانا میرے ساتھ۔ آخر کو وہ تمہارا ہی تو ہے۔ تم مالک تم باس اور ہم ماتحت ہی تو ہیں تمہارے کام کرنے والے بھاگ  
 دوڑ کرنے والے۔“ تایا اور نگزیب کا لہجہ جیسے بھرا گیا تھا۔ دریکتا تڑپ ہی تو گی۔

”میں ایسا نہیں تصور کرتی ہوں۔ خدا نخواستہ ایسی سوچ کبھی میرے ذہن میں آئی ہی نہیں۔“ آپ ایسا سوچیں  
 بھی مت۔ بڑی دیر بعد دریکتا کے سبھانے اور معذرتیں کرنے کے بعد وہ کچھ نازل ہوئے تو جیسے کوئی بھجولی ہوئی خاص

بات اُن کے ذہن میں آئی۔ سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ گئے۔ ”ادھو بات کیا کرنے لگا تھا تمہارے ساتھ ذہن سے نکل ہی  
 گی۔“ ”کیا بات ہے تایا جان۔“ دریکتا اُن کی طرف متوجہ ہوگی۔ ”بیٹا یہ فیجر ہے ناں جسے عمر نے اپائنٹ کیا تھا اس کی بہت  
 ساری بے ایمانیاں اور گھپلے ان چند ماہ کے دوران میں نے پکڑے ہیں اب تو یہ ہمارے منہ کو آنے لگا ہے۔ نقصان پہنچا رہا  
 ہے ہماری ساکھ کو۔ عمر بھائی نے بڑی محنت سے اپنے اس کاروبار کو ترقی دی ہے میں اس میں کسی طرح کا نقصان برداشت  
 نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے اسے ڈس مس کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔ پھر بھی اگر تم اسے  
 بحال رکھنا چاہتی ہو تو میں اس کی راہ میں آڑ نہیں بنوں گا۔“ ”تایا جان آپ جو مناسب سمجھیں کریں میں کچھ نہیں کہتی۔“  
 کہنے کو تو اُس نے یہ بول دیا تھا مگر دل ہی دل میں فیجر صاحب کے ساتھ ہونے والی آچھ گھٹے پہلے کی باتیں یاد کر کے اُسے  
 پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ بظاہر ایسے لگتے تو نہیں تھے۔ پھر پچا بھی اُن کی تعریف ہی کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے تایا جان سچ کہہ  
 رہے ہوں۔ اُن کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ ہے۔ انہیں انسانوں کی پرکھ بھی زیادہ ہوگی ورنہ وہ فیجر صاحب کو ڈس مس کرنے  
 کا فیصلہ نہ کرتے۔ اس آخری سوچ نے اُسے عارضی طور پہ مطمئن کر دیا تھا۔ پر دل رہ رہ کے یہی گواہی دے رہا تھا کہ فیجر  
 صاحب مخلص انسان ہیں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

☆☆☆

دن بڑے بے کیف اور بے رنگ سے تھے۔ ماڑہ بھابھی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگی تھی۔ ہاتھ  
 پاؤں سوجنے لگے تھے اور چہرے پہ بھی ورم تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ تکالیف لاحق ہو گئی تھیں۔ شریں اُس کی حالت  
 اور تکلیف دیکھ دیکھ کے کڑھتی۔ اور نگزیب اُن کے مجازی خدانے گاؤں واپسی کا حکم سنایا تھا۔ ساڑھ کا واپسی کا ذرا بھی دل  
 نہیں تھا پر شریں نے کسی نہ کسی طرح اُسے بہلانے کے واپسی پہ آمادہ کر ہی لیا۔ ”ہم بہت جلد پھر واپس آجائیں گے تم معاملے  
 کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔“ ”کہاؤں ہم ہی واپس جائیں گے۔“ وہ ضدی ہو رہی تھی۔ ”صرف ہم ہی نہیں جائیں  
 گے۔“ ”پھر کون کون جائے گا۔“ ”منہ ادھر کرو۔“ شریں نے اشارہ کیا تو وہ قریب کھسک آئی۔ وہ آہستہ آہستہ سر گوشیوں  
 میں بتانے لگی۔ ساڑھ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”پھر ہم سب کب تک جائیں گے میرے کانچ کا کیا ہوگا۔“ اُسے یہ فکر بھی  
 لاحق تھا۔ ”جہاں ماڑہ پڑھتی تھی تمہارا داخلہ بھی وہیں ہوگا فکر مت کرو تمہارا سال ضائع نہیں ہوگا۔ جیسے ہی حالات  
 بہتر ہوئے ہم دوبارہ ادھر آجائیں گے۔“ ”ٹھیک ہے آپ کہتی ہیں تو مان لیتی ہوں دل ذرا بھی نہیں کر رہا ہے گاؤں جانے  
 کو۔ یہاں اتنا مزہ آتا ہے لوگ کتنے ماڈرن ہیں۔ فر فر انگلش بولتے ہیں۔ دیر سے سوتے ہیں کتنے مزے میں رہتے  
 ہیں۔“ ”تم ناشکری ہو۔ گاؤں میں کتنا رعب ہے ہم حویلی والوں کا۔ کتنی ٹورنار ہے لوگ جھک جھک کے سلام کرتے ہیں،  
 ڈرتے ہیں۔ جو تیاں سیدھی کرتے ہیں ہماری۔ شہر میں کیا ہے کوئی ہم سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہاں سب برابری کی سطح پہ  
 بات کرتے ہیں۔ یہاں ہماری چوہدر اہٹ نہیں چلتی۔ گاؤں کے اپنے مزے ہیں۔“ شریں نے اُسے گاؤں میں رہنے  
 کے ذمہ گوانے شروع کئے تو اُس کے سارے اعتراضات ختم ہو گئے۔

☆☆☆

تایا جو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے لوٹ آئے تھے۔ سب کے ساتھ بیٹھے اپنی مصروفیات کے بارے میں بتا  
 رہے تھے۔ پھر وہ بطور خاص دریکتا کی طرف متوجہ ہوئے جو وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں لگ رہی تھی۔ وہ عمر  
 زیب کے بارے میں سوچ رہی تھی اس لیے اُس کا دھیان اُن کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ ”بیٹا میں اسلام آباد میں اپنی



ایک جان پہچان والے ڈاکٹر سے ملا تھا۔ عمر زیب کی ساری رپورٹس اُسے دکھائیں سارا مسئلہ بھی ڈسلس کیا تو اُس نے ایک مشورہ دیا ہے تم اگر سننا چاہو تو۔۔۔ ”جی تایا جان آپ بتائیں انہوں نے کیا کہا۔۔۔ وہ چونک کر اپنے خیالات سے باہر آئی۔ میرا یہ دوست مشہور سرجن ہے اور دماغی امراض کا ماہر بھی۔ اُس نے کہا ہے کہ اگر ہم عمر زیب کا ماحول بدل دیں یا اُسے کسی اور جگہ لے جائیں تو ماحول اور مقام کی تبدیلی بہت فائدہ مند ہوگی اس طرح عمر کی صحت یابی کے امکانات جو بالکل معدوم ہو گئے ہیں پھر سے روشن ہو جائیں گے۔ ”سچ تایا جان ایسا ممکن ہے۔ وہ خوش ہوگی۔“ ”ہاں بالکل سچ۔ اب ہم بتاؤ راضی ہو کہ نہیں۔“ وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔ ”تایا جان کسی بات سے راضی میں کچھ سمجھی نہیں ہوں آپ کی بات۔“ وہ ابھی نگاہوں سے اُنہیں تنکے لگی۔ ”یہی ماحول اور مقام کی تبدیلی والی بات سے جو ڈاکٹر نے کہی ہے۔“

”جی تایا جان میں بالکل راضی ہوں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ میں تو خوش ہو گئی ہوں کہ اس طرح میرے پپا تو ٹھیک ہو جائیں گے۔“ ”شباباش تم نے واقعی ثابت کر دیا ہے کہ تم اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہو۔ پھر تیاری کرو۔“ ”کہاں کی تیاری تایا ابو۔“

”گاؤں چلنے کی تیاری۔ عمر کو وہیں تولے کے جانا ہے اپنوں کے درمیان رہے گا اپنوں کی بھرپور محبت ملے گی اور ٹھیک ہو جائے گا۔“ ”ٹھیک ہے تایا ابو مجھے منظور ہے۔“ ”وہاں بیٹا وہاں تمہارا بھی دل لگا رہے گا۔“ ہونہ وہ سر ہلا کے رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

پپا کے اور اپنے کپڑے اور ضرورت کی دیگر چیزیں دریکتا نے ایک بڑے بیگ میں رکھ لی تھیں۔ فارغ ہونے کے بعد سونے کے لیے لیٹی تو طرح طرح کی سوچوں نے ذہن کو گھیر لیا۔ خاص دیر کے بعد نیند نے پلکوں پہ بسیرا کیا۔ اُسے سوئے ہوئے جانے کتنی دیر ہوئی ہوگی کہ دروازے پہ بڑے زور سے دستک ہوئی۔ نیند میں ڈوبا ذہن بیدار ہوا پھر اُس کے بعد آنکھیں بمشکل کھلیں کیونکہ نیند کا شدید غلبہ تھا۔ بیڈ پر ادھر ادھر سر ہانے کی طرف سے ٹٹول کے دوپٹہ اٹھایا اور دروازے کے قریب پہنچ کے پہلے احتیاطاً پوچھا کہ کون۔ ”میں ہوں شریں تیار ہو کے باہر آ جاؤ۔ ہم بھی گاڑی میں بیٹھنے لگے ہیں۔“ ہائیں اُس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اُس نے گھوم کے دیوار گیر گھڑی پہ وقت دیکھا۔ ”ابھی تو فجر کی اذان ہونے میں بھی دیر ہے۔ پھر اتنی جلدی جانے کا مطلب۔“ وہ خود سے سوال کر رہی تھی۔ جلدی جلدی منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے۔ کپڑے تبدیل کیے اور بالوں میں اُلٹا سیدھا برس کر کے اپنا بیگ کمرے سے نکال کے باہر رکھا۔ کافی بڑا اور بھاری بیگ تھا۔ گاڑی تک لے جانا اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اُس نے جیسے ہی بیگ باہر رکھا ملازم نے آ کے اٹھایا اور جا کے گاڑی کی ڈیگی میں رکھ دیا۔ دریکتا نے الوداعی نگاہ گھر کے در و دیوار پہ ڈالی اور تھکے تھکے قدموں سے گاڑی کی سمت بڑھ گئی۔ اور نگزیب عمر کو پہلے ہی گاڑی میں لا کے بیٹھا چکے تھے۔ اس کوشش میں اُن کا سانس پھول گیا۔ سگریٹ نوشی کی لت نے کہیں کا بھی تو نہیں چھوڑا تھا۔ بہت جلدی تھک جاتے۔ کوئی محنت طلب کام تو کر ہی نہیں سکتے تھے وہ۔

عمر زیب کی آنکھیں بند تھیں وہ گاڑی کو بیک سیٹ پہ آنکھیں موندے نیم دراز تھے۔ دریکتا اُن کے قریب آ کے بیٹھ گئی۔ اور نگزیب نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھادی۔ بڑی خاموشی اور پراسرار طریقے سے اُن کے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس میں ہر ذی نفس خاموش تھا۔ مارہ کے چہرے پر البتہ تکلیف کے آثار تھے۔ کیونکہ لیڈی ڈاکٹر نے اُسے آخری تین ماہ میں مکمل ریست اور سفر نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ کچھ راستے تک تو سڑک ٹھیک تھی اُس سے آگے کا سفر سچ سچ

اللہ اللہ کر کے یہ سفر تمام ہوا۔ اور نگزیب اور عاشر نے عمر زیب کو سہارا دے کے باہر نکالا۔ اُن کی آنکھیں اب کھل چکی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کچھ بڑبڑا رہے تھے۔

”مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔“ اُنہوں نے کمزور جسم کی ساری طاقت استعمال کر کے اُن دونوں سے اپنے بازو ہرانے کی کوشش کی۔ عاشر کی گرفت اور بھی سخت ہوگی۔ ”چچا جان آپ سیدھی طرح آگے چلتے ہیں یا نہیں۔“ وہ دبے دبے لہجے میں اُنہیں غصے سے دیکھتا ہوا آگے کی طرف دھکیلتے لگا۔ دریکتا اُن کے پیچھے تھی۔ اور نگزیب نے بیٹے کو ہمائشی نگاہوں سے گھورا۔ عمر زیب کی جدوجہد جاری تھی۔ اس اثناء میں وہ برآمدہ عبور کر کے صحن تک پہنچ چکے تھے۔ دریکتا سے پپا کی بے بسی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ آگے ہو کے عاشر کے سامنے آگئی۔ ”عاشر بھائی آپ جا میں میں پپا کو خود لے جانی ہوں۔“ اور نگزیب نے بیٹے کو اشارہ کیا۔ وہ ہٹ گیا۔ دریکتا پپا کے پاس آگئی اور اُن کا بازو تھام لیا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھسیٹ گھسیٹ کے بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اگر تایا یا اُس نے اُنہیں پکڑ نہ رکھا ہوتا تو وہ کب کے زمین پر ہونچکے ہوتے۔ دریکتا کی موجودگی سے وہ کچھ پرسکون سے ہو گئے تھے۔

”عمر کی حالت ایسی نہیں کہ اسے کوئی کمزوری لڑکی سنبھال سکے۔ اس لیے میں نے عاشر کی مدد لی تھی کیونکہ غصے میں عمر کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔“

تایا اور نگزیب عمر زیب کو اندر ایک کمرے میں لا چکے تھے۔ دریکتا نے تکیہ ٹھیک کر کے اُنہیں بستر پہ بٹھایا۔ یہ وہی کمر تھا جہاں گاؤں آمد پہ اُنہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اور نگزیب چلے گئے اب دریکتا عمر زیب کے پاس اکیلی تھی۔ وہ پاؤں اوپر کر کے لیٹ گئے۔ اُن کی بند پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں وہ سر گوشیوں میں خود باتیں کر رہے تھے۔ دریکتا نے پاس آ کے سننے کی کوشش کی پر صرف اُن کے ہلتے ہونٹ ہی نظر آ رہے تھے کوشش کے باوجود کچھ سمجھ نہیں رہا تھا۔ عمر زیب کے سر اور داڑھی کے بال کافی بڑھ چکے تھے۔ اُنہیں تراش خراش کی ضرورت تھی۔ اُس کے خوش لباس پر اُن کی پشیمانی کچھ پپا کی کیا حالت ہو گئی تھی وہ پہچانے ہی نہیں جا رہے تھے۔ وہ بیڈ پہ اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ عمر زیب اب کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے پپا کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو ایک دم سے اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے پپا پہ پھر سے دورہ پڑھنے لگا ہو۔ پراُنہوں نے خاموشی سے اُسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ”شاہ زیب نے کہا تھا میں رات کو کال کروں گا میں کب سے انتظار کر رہی ہوں اُس نے کال ہی نہیں کی۔ میں پریشان ہو رہا ہوں۔“ وہ ہوش مندوں کی طرح صاف لہجے میں خود بول رہے تھے۔ دریکتا نے سماعتیں اُن کی طرف متوجہ کر دیں۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پپا سے کیا کہے۔ اُسے اپنے خیال پہ خود آگئی۔ کہ اگر وہ کچھ کہتے تو پپا کیا سمجھ پائیں گے کون سا وہ ایک نارمل انسان کی طرح ہیں۔ تھوڑی دیر بعد تایا واپس



آگے۔ اُن کے پاس عمر زیب کی ڈھیروں دو انہیں تھیں جو ڈاکٹرز مختلف اوقات میں تجویز کرتے رہے تھے۔ ان میں انجکشن اور گولیاں بھی تھیں جو عمر زیب کو آج کل استعمال کر دئی جا رہی تھیں۔

تایا نے پانی کے ساتھ عمر زیب کو دو گولیاں دیں۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے بڑبڑانا بند کر دیا۔ اُس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ وہ کھولنا چاہتا تھا پر اُن پہ منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ اُس کا ذہن مدھوشی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اندھیرے کا ایک پردہ تھا جو اُس کے دماغ اور آنکھوں کے درمیان حائل ہو رہا تھا۔

”میں نے عمر کو دوادے دی ہے اب یہ کچھ گھنٹے سکون۔۔۔ رہے گا۔ تم چاہو تو اپنے لیے دوسرا کمرہ دیکھ لو۔ سیٹ کروادوں گا۔“ ”نہیں تایا جان میرا خیال ہے کہ میں ادھر ٹھیک ہوں۔“ اُس نے انکار کر دیا۔ ”پر میں عمر کے دورے کی گارنٹی نہیں دے سکتا اور دورے کی حالت میں تمہیں پتہ ہی ہے کہ یہ کتنا خطرناک ہو جاتا ہے۔“ اُنہوں نے وارننگ دی تو دریکتا کچھ سوچنے لگی۔ آج اُس نے بہت قریب سے اور غور سے پاپا کو دیکھا تھا۔ وہاں اپنے گھر میں اُنہیں بیڈروم میں لاک رکھا جاتا تھا۔ اور نگریب تب ہی دروازہ کھولتے جب اُنہیں میڈیسن یا کھانا دینا ہوتا یا پھر نوکروں نے اُن کے کپڑے بدلنے ہوتے۔ اُنہوں نے دریکتا کو بھی عمر زیب کے دوروں کا بتا کر خوفزدہ کر دیا تھا۔ اُس نے توجہ سے پاپا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس کے دل میں خیال آیا کہ پاپا کو اُس کی دیکھ بھال، محبت اور توجہ کی ضرورت ہے وہ اُنہیں نوکروں کی خدمت کے سہارے نہیں چھوڑ سکتی۔ اُن کے سر اور داڑھی کے بال کتنے دنوں کے بڑھے ہوئے تھے۔ کسی کو خیال نہیں آیا تھا کہ اُنہیں بھی تراش خراش کی ضرورت ہے۔ وہ اُن کے پاس ادھر رہے گی اور اُن کی چھوٹی موٹی ضروریات کا خود خیال رکھے گی۔ اُس نے پکارا کہ ارادہ کر لیا تھا۔

اور نگریب نے اُس کے چہرے کے تاثرات سے شائد اُس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگایا تھا تب ہی پھر دوسرے کمرے میں رہنے پر اصرار نہیں کیا۔ اور نگریب جا ہی رہے تھے کہ اُس نے پیچھے سے پکارا۔ ”تایا جان اگر یہاں کوئی بال کاٹنے والا ہے تو پلیز بلوادیں۔ پاپا کے سر اور داڑھی کے بال بہت بڑھ گئے ہیں انہیں سیٹ کروانا ہے۔“ ”ہاں ٹھیک ہے ابھی تھوڑی دیر میں نائی یہاں پہنچ جائے گا اپنا کام کر دے گا۔ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان مت ہو۔“ تایا نے اُس کے سر کے بالوں کو اپنائیت سے سہلایا تو وہ مسکرا دی۔ تایا کتنے اچھے ہیں۔ اُس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ پاپا سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اگر تایا نہ ہوتے تو جانے اُس کا اور پاپا کا کیا ہوتا۔ اس سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکی۔ دل ڈر سا گیا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے لیے اُسے سارہ بلانے آئی۔ ”امی اور سب کھانے پہ انتظار کر رہے ہیں آ جاؤ۔“ ”میں پہلے پاپا کو کھلا دوں پھر خود کھاؤں گی۔ پاپا کے لیے کھانا بھجوادو۔“ دریکتا کو جھجک سی ہو رہی تھی۔ حالانکہ شریں تائی، سارہ، عاشق سب اُن کے گھر میں بے تکلفی سے رہتے رہے تھے۔ بغیر اجازت چیزوں کا استعمال، کھانا پینا پکوانا۔ پر اُسے یہاں اپنے تایا کے گھر میں خود سے کوئی چیز لیتے ہوئے بھی شرم آرہی تھی کہ جانے یہ لوگ کیا سوچیں گے۔ ”ٹھیک ہے امی سے کہتی ہوں آ جانا پھر.....“ سارہ وہیں سے پلٹ گئی۔ کچھ دیر بعد نوکر کے ہاتھ ٹرے میں کھانا بھجوا گیا۔ اُس نے بڑی مشکل سے پاپا کو اٹھایا اور سو سو منٹیں کر کے جتن کر کے اُنہیں تھوڑا کھانا کھلایا دریکتا نے۔ اور نگریب نے کھانے کے بعد میڈیسن دینے کو کہا تھا۔ اُس نے اُن کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے پاپا کو مشکل سے دوا بھی کھلا دی۔

تھوڑی دیر بعد اُن کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے اور آنکھیں بند ہونے لگیں۔

تب وہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے تائی شریں اور دیگر لوگوں کی طرف آئی۔ وہ سب کھانا کھا چکے تھے۔ تائی شریں نے اُسے دیکھتے ہی حویلی میں کام کرنے والی زین سے کھانا لانے کو کہا۔ جو یقیناً دریکتا کے لیے منگوا لیا جا رہا تھا۔ اُس نے آہستگی سے منع کر دیا۔ ”تائی مجھے بھوک نہیں ہے ذرا بھی۔“ اُسے اکیلے کھانے کا سوچ کر شرم ہی آگئی۔ باقی سب کھا کے نارغ بھی ہو چکے تھے وہ اکیلی بیٹھ کے کیا کھاتی۔ بھوکے رہنا بہتر تھا۔ تائی نے بھی ایک دفعہ رکی سا اصرار کیا اور اس کے انکار پہ پھر دوبارہ نہیں کہا۔

سارہ اور سارہ کی اپنی مصروفیات تھیں وہ نظر نہیں آرہی تھیں۔ تائی شریں، فوزیہ اور فرح چچی کے ساتھ باتوں میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی قدرے دور بیٹھی اُن تینوں کو دیکھ رہی تھی۔ فرح چچی نے شائد اُس کی بوریت محسوس کر لی تھی۔ اُسے اشارے سے اپنی طرف آنے کو کہا۔ وہ بے دلی سے اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ ”اب تم ادھر آ گئی ہو تو دل لگانے کی کوشش کرو۔ جہاں زندگی گزارنی پڑتی ہے وہاں دل لگانا پڑتا ہے۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ جو اس سے انحراف کرتا ہے اُسے بچھڑانا پڑتا ہے۔“ چچی نے بڑے ناصحانہ انداز سے اُسے کوئی حقیقت باور کرانے کی کوشش کی تھی۔ جو دریکتا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ ”ارے دل کیوں نہیں لگائے گی۔ اس کی ماں نے یہاں ہمارے رنگ ڈھنگ اپنا کے زندگی گزار لی۔“ شریں نے مسکراتے ہوئے باز دروازہ کر کے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔ دریکتا کو اُن کی باتیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ بس سر ہلائے جا رہی تھی۔

☆☆☆

شام کو مسکین صورت، ایک آدی آیا اور عمر زیب کے سر کے بال کاٹنے واڑھی سیٹ کی۔ دو ملازموں نے اُن کے کپڑے تبدیل کیے۔ وہ آج بہت زیادہ شور کر رہے تھے۔ لیمپ اٹھا کے ایک ملازم کے سر پہ مارنے کی کوشش کی تو وہ فزردہ ہو کے بھاگ نکلا۔ دوسرے نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ عمر زیب جا رہا نہ موڑ میں تھے۔ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے سے روک رہے تھے۔ ”میرے کپڑے دنے دو۔ میرے کپڑے دے دو۔ یہ شاہ زیب کے ہیں مجھے دے دو۔“ دریکتا نے اُن کے پینے کے لیے جو سوٹ نکالا تھا وہ اُسے ملازم کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ شور سن کے اور نگریب بھی اُٹھے۔ ہارون اور نوید بھی نکل آئے۔ کسی نہ کسی طرح کپڑے تبدیل کر دینے کا مرحلہ ختم ہوا تو دریکتا اُن کے پاس آئی۔ زیر چچا پاپا کو انجکشن لگا رہے تھے۔ دریکتا کا چہرہ اتر ا ہوا تھا۔ اُسے یہاں آ کے ایک پل بھی سکون کا احساس نہیں ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہو جائے گا عمر۔ تم مت پریشان ہو۔“ تایا اور نگریب جانے کیا سمجھتے تھے۔ اُس کے پاس آ کے اُسے تسلی دی۔ ایک منٹ ہی مسکراہٹ اُس کے لبوں پہ آ گئی۔

انجکشن لگائے جانے کے بعد عمر زیب پر سکون ہو رہے تھے۔ اُن کی جارحیت اور مدافعت رفتہ رفتہ دم توڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سوچکے تھے۔

اور نگریب، نوید اور ہارون تینوں بھائی، اُن کے پاس سے اٹھ کے قدرے الگ تھلگ ہی جگہ پہ آ گئے۔ ”عمر کی حالت دن بدن پہلے سے خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ٹرنکولائزر، سپنگ پلو اور انجکشن اس کا علاج نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد وہ ان کا عادی ہو جائے گا تو یہ گولیاں اور انجکشن اُس کے لیے بیکار ثابت ہوں گے۔“ یہ ہارون زیب نے۔ ”پھر کون اتنا فارغ ہے جو دن رات اُس کے پاس بیٹھ کے حفاظت کرے اُس کی دیکھ بھال کرے۔“ اور نگریب نے خیال لہجے میں بولے۔ ”دریکتا ہے تو سہی پاپا اُس کا علاج ضروری ہے ورنہ اُس کے اعصاب رفتہ رفتہ بالکل کمزور ہو کے

تباہ ہو جائیں گے۔“ نوید نے مشورہ دیا تو اورنگزیب نے اُسے غصے سے دیکھا۔ ”دو آئین دے تو رہے ہیں عمر کو۔ اور اُس کی دیکھ بھال میں کون سی کمی چھوڑی ہے ہم نے۔ ڈاکٹر کے پاس بھی لے گے تھے جو دوائیں ہم اُسے استعمال کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کی ہی تجویز کردہ ہیں۔“

”مگر یہ کوئی مستقل حل یا علاج نہیں ہے۔“ ہارون زیب کی دلیل کافی مضبوط تھی۔

”اب ہم اُسے یہاں لے آئے ہیں حویلی میں اپنوں کے پاس رہے گا سب کو دیکھے گا تو اُس کے ذہن پر اچھا اثر ہی پڑے گا۔ وہاں شہر میں کون تھا اس کا۔ یہاں ہم اُس کے بھائی ہیں، ہماری اولادیں ہیں بیویاں ہیں۔ سب اُس کی دیکھ بھال کریں گے۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اورنگزیب کا انداز دو ٹوک تھا۔ ہارون اور نوید بھی خاموش ہو گئے اور پھر ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ سب کو عمر کا خیال اور اُس کی دیکھ بھال بھول گئی۔ وہ اب بھی آنکھیں موندیں دوا بیون کے زیر اثر گہری نیند میں تھا۔ اُس کے لیے یہ گہری نیند ہی بہتر تھی۔ بیدار ہوتا تو شاہ زیب کو ڈھونڈتا، اُس کی فون کال کا انتظار کرتا۔ اُسے دیوانہ وار آوازیں دیتا۔ کبھی ماثرہ کو پکارتا اُس سے خود ہی پوچھتا شاہ زیب کا اور پھر خود کو خود ہی جواب دیتا۔ اُس کا ذہن ایک مخصوص ٹاپیے کی گرفت میں قید ہو گیا تھا۔ جب شاہ زیب سے اُس کی آخری بار بات ہوئی تھی اور شاہ زیب نے اس وعدے کے ساتھ فون بند کیا تھا کہ میں کل اسی وقت آپ کو پھر کال کروں گا۔ پھر نہ تو وہ دن آیا اور نہ اُس کی کال آئی۔ نہ عمر کی شاہ زیب سے بات ہوئی۔ پھر انتظار کے اُس لمحے کا قیدی بن چکا تھا۔

جب سے عمر زیب کی ذہنی حالت ابتر ہوئی تھی۔ ماثرہ ایک بار بھی اُن کا حال دیکھنے یا پوچھنے اُن کے پاس نہیں آئی تھی۔ اب تو وہ حویلی میں تھے تب بھی اُس نے یہ زحمت گوارا نہیں کی کہ عمر چچا کو ایک نظر دیکھ ہی لے۔ بے شک وہ نیم پاگل تھے سب اُن کے پاس جاتے ڈرتے تھے پر اکثر اوقات وہ دوائیوں کے زیر اثر سونے رہتے۔ نیند کے عالم میں تو وہ بالکل بے ضرر تھے۔ تب بھی اُس نے دلچسپی نہیں لی۔ کبھی دریکتا سے بھی نہیں پوچھا کہ عمر چچا کیسے ہیں۔ اُن کی حالت اب کیسی ہے۔ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا میں گن تھی۔ زیادہ تر کمرے تک ہی محدود رہتی۔

شریفاں دانی وقتاً فوقتاً گھر آ کے معائنہ کر جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ شریں پاس کے شہر سے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا کے بھی معائنہ کرواتی۔ ماثرہ کے معاملے میں وہ بہت حساس ہو رہی تھی۔

ساتھ وہ پہلی بار ماں بن رہی تھی بہت احتیاط اور دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ لاکھ وہ ماثرہ کی دلجوئی کرتی خیال رکھتی مگر اُس کی تکلیف میں حصہ دار نہیں بن سکتی تھی۔ ماثرہ اکیلے ہی سب برداشت کرتی۔

اُس کی زندگی پہ تو جیسے خزاں کا پہرا تھا۔ ہر چیز زرد اداسی میں لپٹی نظر آتی۔ کہیں کوئی دلچسپی اور اُمید نہیں تھی سوائے ایک انتظار کے۔ اس انتظار نے اُسے باقی چیزوں اور رشتوں سے لاپرواہ کر دیا تھا۔ اُسے اپنے وجود میں سانس لیتی زندگی اور اُس زندگی کو دنیا میں لانے سے ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ بحالت مجبوری وہ اس بوجھ کو برداشت کر رہی تھی۔ جس نے اُس کی ساری اسارت نہیں کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔ اُس کے پرکشش جسم کو بھدا اور بے ڈول بنا ڈالا تھا۔ نازک ہاتھ پاؤں کا حلیہ ہی بگڑ گیا تھا۔ وہ سوجنے کے بعد اتنے بد صورت اور عجیب سے لگتے اُسے۔ ماثرہ نے تو آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے دل میں اپنی بد صورتی کا خوف ساکنڈلی مارے بیٹھ گیا تھا کہ شاہ زیب کے آنے والے بچے نے اُس کی شکل کا بھی ستیاناس کر دیا ہوگا جس طرح باقی جسم کا کر دیا تھا۔ دن بہ دن وہ پھیلتی ہی جا رہی تھی۔ نازک کمر، کمر اور کمرے کو لپے بھی بھاری ہو گئے تھے۔ اُس نے اپنے اور پر توجہ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس ہونے والے بچے کے لیے اُس کے دل اور محسوسات میں کوئی مانتا نہیں جالی سی۔ نہ لولی خواہیں اور اُمید تھی۔ جانے کب اس عذاب سے رہائی ملنا تھی وہ ایک ایک دن گن کے گزار رہی تھی۔

دریکتا کو اُس کی بڑی فکر تھی۔ صبح و شام پوچھنے چلی آتی ”بھابھی آپ ٹھیک ہیں ناں اپنا خیال رکھا کریں۔ کھانا ڈٹ کے کھائیں، خوش رہیں۔“ وہ روز اسی طرح کے جملے بولتی۔ ماثرہ کے لبوں پہ زہر خند مسکراہٹ آ جاتی۔ دل ہی دل میں جھنجھلاتی۔ پر زبان سے نہ بولتی۔ شریں نے اُن دونوں بہنوں کو سختی سے ہدایت دی تھی کہ دریکتا کے ساتھ اپنا رویہ لب و لہجہ ٹھیک رکھو۔ مارے بندھے ماثرہ اُس کے سوالوں کے جواب دیتی۔ پر سائرہ اُسے زیادہ لفٹ نہیں کراتی تھی۔ دریکتا سے سامنا ہوتے ہی جھم سے اشعر لغاری اُس کی نگاہوں کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اتنا شاندار نوجوان، دریکتا کا شوہر۔ ایسا اُس کا بھی تو ہونا چاہیے۔ بلکہ اُس کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ اُس میں آخر کیا کمی ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے خوبصورت ہے، بااخلاق ہے۔ کپڑے اچھے پہنتی ہے اور کیا چاہیے بھلا کسی کو۔ اشعر لغاری دیکھنے میں کافی میچور اور دریکتا سے بڑا تھا۔ سائرہ کے خیال میں یہ اُس کی خوبی تھی۔ دریکتا اُس کی ہم عمر ہی تھی تقریباً سو اُس کی جگہ وہ بھی تو ہو سکتی ہے۔ سائرہ کے دماغ میں آج کل ایسی ہی سوچیں پل رہی تھیں۔ جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ اُسے دوبارہ آرزو اور حسرت تھی۔ اشعر لغاری کو دیکھنے کی۔ اُس سے ملنے کی۔ بات کرنے کی۔ مگر گاؤں میں یہ کہاں ممکن تھا۔ اس لیے ہی سب اُسے یہاں لے آئے تھے۔ وہاں رہتی تو اشعر سے ملنے کی امید تو تھی۔ وہ انگل کا پوچھنے یا دریکتا سے ملنے تو آتا ہی۔ وہ بھی اسی بہانے اُسے مل لیتی اور چند باتیں کر لیتی۔ ہو سکتا ہے فلموں اور کہانیوں کی طرح اس کی زندگی میں بھی کوئی انہونی ہو جاتی اور وہ اُسے پسند کر لیتا۔ دریکتا سے علیحدگی اختیار کر لیتا۔ اور ساری دنیا سے لڑکے اُسے اپنا لیتا۔ وہ کھلی آنکھوں سے یہ خواب دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ظاہر لغاری آج صبح سے ہی کچھ پریشان سے تھے۔ جانے کیوں رہ رہ کے خیال کی رومرزیب اور دریکتا کی طرف بہ رہی تھی۔ اُن کا کچھ اتنا پتہ نہیں تھا۔ آخری بار اورنگزیب سے انسلٹ کروانے کے بعد اُن کا جی چاہا ہی نہیں کہ پھر وہاں جایا جائے۔ دل مسوس کر رہ جاتے۔ اشعر وہاں گیا اور اُس نے بھی دریکتا کے رویے کی شکایت لی۔ رویوں اور رشتوں میں ایک اُن دیکھی ہی دراز آگئی تھی۔ تعلق جامد سے محسوس ہو رہے تھے۔ گمان یقین میں بدل رہے تھے۔ وہ خود وہاں جا کے دیکھنا چاہ رہے تھے کہ اس نظر نہ آنے والی دوری اور دراڑ کی وجوہات کہاں تک ہیں۔ ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جی تو نہیں چاہتا تھا پر اب وہاں جانا ناگزیر تھا۔ اشعر کی منکوحہ اور اپنے دوست کی اُس گھر میں موجودگی سے وہاں سے اُن کا بڑے مضبوط تعلق کا حوالہ موجود تھا۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی وہ اپنے آپ میں توانائی محسوس کرنے لگے۔ اُمیدیں تازہ اور جوان محسوس ہونے لگیں۔ اشعر گھر آیا تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ عمر زیب کی طرف جانے کے لیے۔ اُسے بھی فوری تیاری کا حکم ملا تو وہ انہیں دیکھ کے رہ گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا اُن کے کہنے کو نال نہیں سکتا تھا۔

کچھ منٹ میں ہی یونیفارم تبدیل کر کے اُن کے ساتھ ہولیا۔

☆☆☆

عمر زیب کے پڑ شکوہ گھر کے داخلی گیٹ پہ چوکیدار کی صورت میں بالکل اجنبی صورت متعین تھی۔ اشعر نے گیٹ پہ پہنچ کے ہارن دیا تو چھوٹا گیٹ کھول کے وہ اجنبی صورت چوکیدار باہر نکلا۔ اشعر کی گاڑی، مضبوط شخصیت اور ساتھ موجود پر ڈقار سے ظاہر لغاری کو دیکھ کے وہ خاصا متاثر نظر آنے لگا اور جھٹ ہاتھ ماتھے تک لے جا کے سلام کیا۔



اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے ہرے کے ہالکان کا پوچھا اس کے واسطے طور پر غریب کا نام نہیں لیا تھا۔ صاحب اندر ہیں آپ جائیں۔ اُس نے دونوں پٹ کھول دیئے گیٹ کے۔ اور انہیں اندر داخل ہونے کا موقعہ دے کے خود کو بیٹھنے میں ہو گیا۔

اندر موجود ایک نور اجنبی ملازم صورت لڑکے نے اُن کی آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ اور نگزیب اُن کے استقبال کے لیے خود موجود تھے۔ ”اسلام علیکم طاہر صاحب آج کیسے راستہ بھول پڑے ہیں آپ۔“ پھر انہوں نے باری باری دونوں سے زوردار قسم کا مصافحہ کیا۔ مگر ہاتھ کی گرفت کے برعکس اُس میں خلوص ناپید تھا۔ طاہر لغاری کی طرف دیکھتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ جس سے طاہر اپنے آپ میں بے چینی محسوس کرنے لگے۔ ”تشریف رکھیے۔“ انہوں نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ بیٹھے گئے تو وہی اجنبی ملازم جسے طاہر نے پہلے کبھی یہاں عمر کے گھر میں نہیں دیکھا تھا اور نگزیب کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اُسے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات لانے کو کہا اور دوباراً اُن دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ہاں جی اب بتائیں کیسے آنا ہوا۔“ اُن کے لبوں پر بڑی خوش اخلاق قسم کے میزبان والی مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔ ”ہم عمر کو دیکھنے اور اُس کا پتہ کرنے آئے ہیں۔ ساتھ میں اپنی بہو سے بھی ملنا چاہتا تھا اس لیے سوچا کہ آج چکر لگا ہی لیا جائے۔“ طاہر لغاری کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اور نگزیب اور ملازموں کے سوا گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔ عورتوں والی مخصوص گہما گہمی بھی ناپید لگ رہی تھی۔ ”اوہو آپ کو بتانا یاد ہی نہیں رہا۔“ اور نگزیب سر پہ ہاتھ مار کے بولے تو طاہر لغاری کو لگا جیسے کوئی خاص بات ہو۔ وہ اضطرابی انداز میں اُن کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اشعر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ جیسے یہاں موجود ہی نہ ہو۔ ”عمر زیب تو ملک سے باہر ہے میں نے ڈاکٹر سے مشورے کیے بعد اُسے امریکہ بھجوا دیا ہے۔ جہاں اُس کا علاج ہو رہا ہے۔ دریکتا بھی ساتھ ہے عمر کے۔“ اور نگزیب اُن کی سماعتوں پر ہم گرا کے بالکل مطمئن تھے۔ ”دیکھ گئے وہ دونوں مجھے بتایا کیوں نہیں۔“ طاہر لغاری صوفے سے کھڑے ہو گئے۔ ”آپ بیٹھیں میں سب بتاتا ہوں۔ اصل میں عمر کی حالت کچھ زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اسی وجہ سے جلدی جلدی میں سب کچھ ہوا۔ کسی کو بھی بتانے یا اطلاع کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں اس پر معذرت خواہ ہوں۔“ اور نگزیب کے چہرے پر شرمندگی کا تاثر تھا۔ اس خبر نے اشعر کو بھی حیران کر دیا تھا۔ وہ بھی توجہ دیتے پہ مجبور ہو گیا۔

طاہر لغاری خود کو تھکا تھکا سا محسوس کرنے لگے۔ ”اچھا مجھے دریکتا کا کوئی نمبر دے دیں تاکہ میں اُسے رابطہ کر کے پوچھ تو سکوں۔“ امید کی ایک کرن نظر آئی تھی۔

”اس کے لیے معذرت چاہوں گا۔ دریکتا کا آج صبح فون آیا تھا کہ ہاسپٹل میں اُس کا موبائل فون کہیں گر گیا ہے وہ جیسے ہی کوئی اور فون لے گی مجھے بتا دے گی۔ اُس نے جب مجھے بتایا میں فوراً آپ کو نمبر دوں گا آپ رابطہ کر لیجیے گا۔“ طاہر لغاری نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ اشعر انہیں دیکھ کے پریشان ہو گیا۔

”ٹیک! اٹ ایزی پاپا۔“ وہ انہیں تسلی دینے لگا۔ وہ اُس کی طرف دیکھ کے پھیکے انداز میں مسکرائے اور اُنھنے کا اشارہ کیا۔

اور نگزیب نے بہت زور مارا کہ کچھ دیر اور بیٹھیں گپ شپ کرتے ہیں۔ پر وہ نہیں مانے۔ گیٹ سے باہر آئے انہوں نے چند لمبے لمبے سانس لیے۔ جیسے اُن کے وجود میں سخت ٹھنسن ہو اور وہ اُسے نکالنا چاہ رہے ہوں۔

پاپا آپ کو ایک دم سے کیا ہو گیا ہے۔ اشعر نے پوچھا۔ ”بیٹا مجھے کوئی بات لٹک رہی ہے۔ عمر زیب دریکتا کے ساتھ باہر بھی چلا گیا اور ہمیں کوئی اطلاع دینا بھی گوارا نہیں کیا گیا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے یہ سب جھوٹ ہے۔“ پاپا آپ چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذہن پر سوار کر لیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے عمر انکل واقعی ملک سے باہر ہی ہوں۔“

وہ عام سے نلچے میں بولا۔ وہ اس وقت اُن کے ذہن کو سوچوں اور ٹینشن سے آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے بانٹتے طور پر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا۔ پر طاہر چڑ سے گئے۔ ”ہاں تمہیں کیوں فکر ہونے لگی۔ وہاں جا کے اجنبیوں کی طرح بیٹھے رہے کوئی بات تک نہیں کی۔ تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ عمر کے ساتھ تمہاری منکوحہ بھی تو ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں کوئی احساس ہی نہیں ہے۔“ انہوں نے اُس کی کلاس لے ڈالی اشعر مسکرائے لگا۔ طاہر بے چین سے تھے۔ ”کمال ہے عمر میرا دوست امریکہ پہنچ گیا اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔“ آپ کے دوست کے ساتھ میری منکوحہ بھی تو ہے آپ بھول رہے ہیں۔ اشعر نے شرارتی انداز میں یاد دہانی کروائی تو وہ اُسے گھورنے لگے۔ اشعر نے ساری توجہ ڈرا یونگ پہ مرکوز کر دی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر اس خاموشی کو طاہر نے ہی توڑا۔ ”گھر کے ملازم بھی نئے ہیں۔ یہ بھی قابل غور بات ہے۔“

”پاپا آپ مت فکر کریں عام ہی باتوں کو خواہ مخواہ ذہن پر سوار کر رہے ہیں۔ اہمیت دے رہے ہیں۔ اُن کی مرضی گھر کے مالک ہیں جس کو چاہیں رکھیں جس کو چاہیں نکالیں۔ یہ میرے اور آپ کے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ اُن کے گھر کا مسئلہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ نوکروں کی کارکردگی سے مطمئن نہ ہوں یا انہیں اتنے نوکر مل گئے ہوں اور انہوں نے پرانے نوکروں کو نکال دیا ہوں۔ اور رہی بات عمر انکل کو علاج کی خاطر ملک سے باہر بھجوانے کی تو اس میں نہ پریشانی والی بات ہے اور نہ حیرانی والی۔ کیونکہ اور نگزیب انکل اور اُن کی وائف نے پہلے بھی کہا تھا کہ ہم عمر کو علاج کی خاطر ملک سے باہر بھی بھجوائیں گے اگر وہ یہاں سے ٹھیک نہ ہوئے تو۔ اور یہ ذہنی بیماریاں اتنی جلدی ٹھیک نہیں ہوتی آپ کو پتہ ہی ہوگا۔

امریکہ میں دماغی امراض کے بہترین معالج موجود ہیں۔ سو عمر انکل کی فیملی نے اُن کو وہاں بھجوا دیا ہوگا۔ اور بات رہ جاتی ہے ہمیں نہ بتانے کی یا اطلاع نہ کرنے کی تو اس کی وجہ اُن کی گھریلو پریشانیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ عمر انکل کے ساتھ جو حادثہ ہوا یہ اتنا جلدی بھولنے والا نہیں ہے۔ گھر کا ہر فرد پریشانی کا شکار ہوگا اس لیے اُن کے ذہن میں یہ بات رہی ہی نہیں ہوگی کہ ہمیں اطلاع کروائی جائے۔“ اُس نے اپنی طرف سے انہیں مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پھر اُن کی سوتی ایک نلچے پہ اٹک گی۔ ”اچھا اور یکتا تو مجھے بتا سکتی تھی یا فون ہی کر سکتی تھی۔“ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارا نمبر اُن کے پاس موجود ہی نہ ہو۔ اشعر کے پاس ہر بات کا ریڈی میڈ جواب تیار تھا۔ طاہر لغاری خاموش ہی ہو گئے۔

☆☆☆

اور نگزیب سر پکڑے بیٹھے تھے۔ اس بات کا اندازہ انہیں پہلے سے تھا کہ کیا کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔ اس کے حل بھی انہوں نے کچھ نہ کچھ تیار کر لیے تھے۔ پر یہ پریشانیاں اور مشکلات اتنی جلدی سامنے آ جائیں گیں اس کا انہیں بہر حال پتہ نہیں تھا۔ کسی نہ کسی سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ اور یہ مشورہ شریں سے بڑھ کر کون دے سکتا تھا۔

اتنی جلدی طاہر لغاری اپنے بیٹے کے ساتھ پوچھنے چلا آئے گا یہ اُن کی سوچ میں بھی نہ تھا۔ دریکتا کے نمبر کا آج انہوں نے بہانہ کر کے نال دیا تھا مگر آئندہ کے لیے یہ بہانہ نہیں چل سکتا تھا۔

اس کا حل بھی موجود تھا۔ آئندہ کسی پریشانی کی صورت میں انہیں کیا کیا کرنا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا۔

☆☆☆

تھا۔ اور وہ شخص اپنے اس فرض سے ہی غافل تھا۔ دریکتا کو اس کے ساتھ اپنا ذہن تصادم یاد آیا تو ایک تلخ سی مسکراہٹ لبوں پہ آ کے دم توڑ گئی۔

☆☆☆

اورنگزیب شریں کو آہستہ آہستہ کچھ بتا رہے تھے جب دریکتا اُن کے پاس آئی۔ نوکرانی کی زبانی اُسے بتایا کہ آدھ کا پتہ چلا تھا اور وہ چلی آئی تھی۔ دریکتا کو دیکھتے ہی انہوں نے شریں سے بات چیت کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اُس کی طرف متوجہ ہو گئے جو مضطرب سی لگ رہی تھی۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئی۔ ”کیا بات ہے پریشان لگ رہی ہو؟“ اورنگزیب اُس کی اندرونی کیفیت ہاڑ گئے تھے۔ ”نہیں تایا جان پریشان تو نہیں ہوں۔“ اُس نے ہنستے ہوئے تردید کی۔ ”پھر کیا بات ہے تمہارا چہرہ اتنا رہا ہے کہ کسی کشمکش میں ہو؟“

وہ چہرہ اڑھنے کے فن سے آشنا تھے۔ اُس کی بات پہ یقین نہیں کیا تھا۔ ”تایا جان مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے۔“ اُسے یاد آ گیا کہ اُس کا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہے۔ ”یہ لو میرا لے لو میں اور خرید لوں گا بلکہ میرے پاس ایک اور فون موجود ہے۔“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا موبائل فون اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ”نہیں تایا جان یہ آپ خود استعمال کریں کیونکہ میرے پاس سم بھی نہیں ہے کیونکہ میرا فون خود ہی کہیں غائب ہو گیا ہے۔“

”اچھا چلو تمہیں صبح ہی یا فون اور سم مل جائے گی۔“ وہ شاہانہ انداز میں بولے۔ دریکتا طاہر انکل کے بارے میں معلوم کرتے ہوئے جھجک سی گئی۔ ”تایا جان ہمارے گاؤں آنے کے بعد طاہر انکل یا اُن کے گھر میں سے کوئی پتہ پتا پوچھنے تو نہیں آیا؟“ اُس نے تایا اورنگزیب سے نظریں ملاسنے سے گریز برتا تھا۔ شریں نے آنکھوں آنکھوں میں اورنگزیب کو اشارہ کیا۔ ”کوئی بھی نہیں آیا۔ میں خود اتنا حیران ہوں کہ عمر کا یہ دوست بڑے دعوے کرتا تھا۔ عمر کے ساتھ دوستی کا دم بھرتا تھا اور جب سے عمر کا یہ حال ہوا۔ چند بار کے علاوہ اُسے پوچھنے بھی نہیں آیا۔ چند دن پہلے دفتری سلسلے میں ایک تقریب ہوئی وہاں ”تمہارے پتا“ کا یہ دوست طاہر لغاری بھی آیا ہوا تھا۔ مجھ پہ نظر پڑی تو رخ موڑ لیا۔ میں خود اٹھ کے قریب گیا سلام دعا کی۔ تو بڑے رد کھے پھیلے انداز میں سلام کا جواب دیا۔ میں نے خود ہی عمر کے بارے میں بتایا۔ آگے سے وہ کچھ نہیں بولا۔ بلکہ عمر کو گاؤں لانے سے پہلے میں نے گھر جا کے بتایا تھا کہ ہم اُسے گاؤں لے کے جا رہے ہیں۔ تب بھی اُس نے کچھ نہیں پوچھا۔ سچ پوچھو تو طاہر لغاری اور اُس کے بیٹے اشعر کے رویے سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ عمر کو بہت جلدی تھی ان لوگوں سے رشتہ جوڑنے کی۔ میں بہت حیران ہوں کہ اتنی جلدی یہ لوگ بدل گئے ہیں۔ ابھی تو صرف عمر نے نکاح کیا تھا بیٹی کا اگر رخصتی کر دیتا تو جانے کیا ہوتا۔ خیر میں جاؤں گا طاہر کے گھر اور اُسے پوچھوں گا اُس کی بیگانگی اور مردہری کا سبب۔ ہم نے بیٹی دی ہوئی ہے کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ طاہر کو اس رشتے کا تو احساس کرنا چاہیے۔“ ایک لحاظ سے وہ بھی تو اپنی جگہ ٹھیک ہے۔“ شریں بلا کے سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”دریکتا کے ساتھ ساتھ اورنگزیب بھی چونک گئے۔“ ”تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ طاہر لغاری اپنی جگہ ٹھیک ہے؟“ اورنگزیب نے پوچھا۔ ”عمر بھائی کا یہ دوست اکثر رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات آپ کے علم میں ہے ناں کہ عمر بھائی نے خود غنیمتیں کر کے طاہر لغاری سے نکاح کے لیے کہا تھا۔ مارے بندے ملگنی تو کر لی تھی انہوں نے یا عمر بھائی نے جب دریکتا سے نکاح کے لیے خود سے اصرار کیا تو طاہر بھائی نے بیٹے سے کہا۔ دریکتا کے مستقبل کے ساتھ انہیں بہت ساری جائیداد اور فوائد نظر آ رہے تھے سو اشعر نے بھی نکاح کر لیا۔“

دریکتا ہر اسان نگاہوں سے کبھی شریں تاکی اور کبھی تایا اورنگزیب کو دیکھ رہی تھی۔ ان انکشافات نے اُس کے پاؤں تلے

اورنگزیب ہارون اور عاتر کے سپرد اُس کی ذمہ داری چھوڑ کے خود ہنگامی طور پہ گاؤں آئے تھے۔ کچھ چیزوں اور واقعات کے بارے میں بتانا ضروری تھا۔ نوید بھی گاؤں میں تھا۔ اُسے دفتری معاملات اُلجھن سی ہونے لگی تھی ساتھ وہ اکتا گیا تھا۔ اتنا لبا انتظار اُس کے بس سے باہر تھا۔ اورنگزیب کی پلاننگ اُس کی عقل سے بعید تھی۔ وہ گاؤں میں اپنی چوہدراہٹ اور نور میں خوش تھا۔ ہارون فی الحال کسی امید میں اورنگزیب کے ساتھ ہی تھا۔

☆☆☆

گاؤں آئے ہوئے انہیں تین ہفتے سے زائد ہو گئے تھے۔ عمرزیب کی حالت میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دریکتا کی تعلیم کا حرج ہو رہا تھا۔ اُس کی اُسے اتنی فکر نہیں تھی جتنی اپنے پتا کی تھی۔ اورنگزیب تایا تو اپنے ڈاکٹر دوست کے بلند وبال دعوؤں کے ہمراہ عمرزیب کو گاؤں لے کے آئے تھے کہ یہاں کے ماحول میں رہ کے اس کی ذہنی حالت رفتہ رفتہ سنبھل جائے گی اور اس کا واحد علاج ہی یہی ہے۔ اُن کی ذہنی حالت کیا سنبھلنی تھی۔ چوبیس گھنٹے ایک کمرے میں بند اکثر اوقات مدہوشی کی حالت میں رہتے۔ کھانا بھی مشکل سے کھاتے۔ کوئی آکے دیکھتا تک نہ تھا۔ ہاں نوید چچا کھڑے کھڑے پوچھتے کہ کیسی طبیعت ہے اب عمر بھائی کی۔ باقی کسی کے پاس شاید اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ شریں تاکی بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی تھی۔ ہاں دریکتا پہ نظر پڑتی تو انہیں دھیان آتا کہ عمرزیب کا بھی پوچھ لینا چاہیے۔ ہاں بھابھی، سارہ یا باقی دونوں چچا کی اولادوں کو اپنے عمر چچا سے ایسی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی ایک بیمار نیم پاگل شخص کی اُن کے نزدیک ایسی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔ جو دن رات اُن کی پٹی سے لگے بیٹھے رہتے۔ لے دے کے دریکتا کی جگہ جو باپ کو دیکھ دیکھ کے جلتی تڑپتی۔ اُس کا سیل فون پر سرار طور پہ اُس کے بیگ سے غائب ہو گیا تھا۔ اُس نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ مگر اُس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ایک نیا موبائل فون خریدا جائے۔ کبھی کبھی اُسے کسی ہمدرد کی سخت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنے دکھوں اور آنسوؤں کو اندر سونے کا ہنر جانتی تھی۔ سو کبھی دوستوں سے بھی کھل کے بات نہیں کرتی تھی۔ یہ عادت اب پختہ ہو چکی تھی۔ لیکن احساس ہو رہا تھا اُسے کہ مجھے کسی سے بات کرنی چاہیے۔ یہ احساس ہوتے ہی اُسے طاہر انکل یاد آ گئے۔ وہ پتا کے مخلص اور قریبی دوست تھے۔ دریکتا کو اُن کے آنے سے پتا کی خیر خبر ملنے سے بڑی ڈھارس ملتی تھی۔ لیکن انہوں نے بھی اچانک آنا جانا ختم کر دیا تھا۔ پھر ایک دن اُن کا وہ مغرور سا بیٹا آیا اور اسے کچھ عجیب سی باتیں سنا کے چلا گیا۔ پھر ایک لمبی خاموشی تھی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ وہ طاہر انکل سے دل ہی دل میں شکوہ کیا تھا۔ اُنہیں خبر تو لینی چاہیے تھی۔ بے شک پتا اپنے حواس میں نہیں تھے پروہ تو ٹھیک تھی تندرست تھی۔ ان کے گاؤں آئے سے پہلے بھی پتا کا پوچھنے نہیں آئے۔

اب تو گاؤں آئے ہوئے بھی اتنے دن ہو گئے تھے۔ اُن کا کوئی اتنا پتہ ہی نہیں تھا۔ نہ ہی تایا نے کوئی ذکر کیا تھا۔ دریکتا کے دل میں تھا کہ ہو سکتا ہے اُن کی غیر موجودگی میں طاہر انکل پوچھنے آئے ہوں۔ اگر یہ بات ہوتی تو تایا ضرور اُسے بتاتے۔ اُسے رونا آنے لگا۔ پتانے کتنے جاؤں سے طاہر انکل کے بیٹے کے ساتھ اُس کا نکاح کیا تھا۔ اُس شخص نے اُسے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا۔ اُس کی زندگی کتنی مشکلات اور پریشانیوں کا شکار تھی۔ وہ اکیلی ہی سب کچھ سہہ رہی تھی۔ صبر کر رہی تھی۔ کیا فائدہ تھا اس نام نہاد بندھن کا جب اُس شخص نے اُس کے اور اپنے مابین رشتے کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہے رخصتی نہیں ہوئی تھی ابھی پروہ اُس کی منکوہ تھی۔ اُس کی ان حالات میں خبر گیری کرنا اشعر کا فرض تھا۔

”کیا یہ سب ممکن ہوگا جو آپ سوچ رہے ہیں۔“ شریں نے سوچ میں ڈوبے اور نگزیب سے پوچھا تو وہ چونک کر کہنے لگی۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ میں پہلے سیدھے طریقے سے جا کے بات کر دوں گا خود طاہر لغاری کے گھر جا کے۔ کہہ دوں گا کہ دریکتا اس رشتے کو برقرار نہیں رکھنا چاہتی۔ میرا نہیں خیال کہ اس بات کے بعد وہ انکار کریں گے۔“ پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو..... آپ کیا کریں گے۔“ ایک اور حل بھی ہے ناں میرے پاس۔“ وہ چٹکی بجا کے بولے۔ ”وہ کون سا حل ہے مجھے بھی تو بتائیں۔“ شریں کے چہرے پہ دبا دبا تجسس تھا۔ ”اس کام کے لیے عدالت ہے ناں میں دریکتا کی طرف سے خلع کا مقدمہ کر دوں گا۔ طاہر لغاری بہت عزت دار خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی عزت بچانے کی خاطر خلع دے دے گا۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ عدالت میں جانے کی نوبت آئے۔ کیونکہ عزت داروں کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے۔ جب گھر کی باتیں عدالتوں میں اچھالی جائیں۔ طاہر لغاری کو عدالت کی دھمکی ہی کافی ہوگی۔ معاملہ عدالت کے باہر ہی نمٹ جائے گا۔“ اور نگزیب انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے خوف واقف تھے۔ انہیں اتفاقاً ہی ایک ذریعے سے یہ بات پتہ چلی تھی کہ عمر زیب نے طاہر لغاری سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔ پھر اُس کے ذہن نے دو اور دو چار کے فلسفے پہ بہت کچھ خود تیار کر لیا تھا۔

”اچھا طاہر لغاری مان جائے گا پھر اشعر لغاری کا کیا ہوگا۔ وہ دیکھنے میں ہی کسی اور طرح کا نظر آتا ہے۔“ ”نم دیکھتی جاؤ۔ طاہر لغاری بیٹے کو خود راضی کر لے گا خلع کے لیے۔“ اور نگزیب کو بڑی امید تھی اُس کی امید بے جا بھی نہیں تھی۔

”میں پھر اپنے عاشر سے دریکتا کا بیاہ کروں گی جب ساری مشکلات اور رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔“ ”ارے آہستہ بول کسی اور نے سن لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

اور نگزیب نے شریں کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں کسی سے ڈرتی ہوں۔ کسی نے سنا ہے تو سن لے۔“ ”کہن بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہوتی۔“ اور نگزیب نے غصے سے کہا تو شریں خاموش ہو گئی۔

عمر زیب حسب معمول دواؤں کے زیر اثر سو رہے تھے۔ یہاں دریکتا کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا وہ گھٹ گھٹ گھٹ کے رو رہی تھی کہ آواز کمرے سے باہر نہ جائے۔ ”عمر کے سوئے ہوئے بے خبر چہرے کی طرف تکتے تکتے اُس نے کتنے شکوے کر ڈالے تھے۔ وہ ٹھیک ہوتے تو وہ اپنے سوالوں کے جواب حاصل کر کے رہتی۔ جو حقیقت نے اُس کے دماغ میں پیدا کر دیئے تھے۔ بڑی دیر بعد خود بہ خود ہی آنسو تھم گئے۔ بظاہر اتنے مخلص اور مہربان نظر آنے والے طاہر انکل کی کراہی کی وجہ پچا کا فیصلہ تھا۔ اس سوچ نے اُس کے اندر خود سے نفرت اور بے زاری پیدا کر دی تھی۔

شریں کا رویہ کانی حد تک بدل چکا تھا۔ وہ پہلے والی لاپرواہی اُس نے اپنے وجود سے الگ کر دی تھی۔ دریکتا خڑبھڑاتی تھی۔ ”بتائی میں شہرا نے گھر جانا چاہتی ہوں۔ پچا کے ساتھ۔ میری تعلیم کا حرج ہو رہا ہے۔“ بتائی شریں اُس کے کمرے میں اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ دریکتا نے آخر کار بول ہی دیا۔ وہ چند ٹائیے بالکل خاموشی سے زمین کی طرف دیکھتی

سے زمین ہی سرکادی تھی۔ کہ یہ نکاح پچا کے متیس کرنے سے واسطے تر لے کرنے سے ہوا ہے۔ اُسے مجبوری کے عالم میں گلے میں طوق بنا کے ڈالا گیا ہے۔ کیا وہ اتنی گئی گزری تھی۔ پچا کو ان کی منت کرنی پڑی۔ کیا وہ شکل و صورت میں کم تھی یا اُس کے کریکٹر میں کوئی خرابی تھی جو پچا کو ان لوگوں کی منتیں کرنی پڑیں کہ خدارا میری بیٹی کو اپنالو۔ کیوں کیا اُس کے لیے کوئی رشتہ تو نہ ہو سکتا تھا۔ وہ لولی لنگڑی تھی یا پھر ساری دنیا میں لڑکے ناپید ہو گئے تھے۔ اُس کے نسوانی پندار کا شیشہ بُری طرح چکنا چور ہوا تھا سارا نسوانی غرور قدموں تلے روند گیا تھا۔ عورت کا غرور ہی اسی بات میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ من چاہی ہے اُسے اپنا یا گیا ہے نہ کہ بھیک اور خیرات کی طرح قبول کیا گیا ہے۔ اُس کا یہ غرور ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کاش کہ شریں بتائی یہ منحوس بات اُسے نہ بتاتی۔ اپنے دل میں ہی رکھتی۔ کم سے کم وہ اتنا دکھی تو نہ ہوتی۔ اتنی تو ہیں اور کم مانگی کا احساس تو نہ ہوتا۔ کاش وہ پچا سے جواب طلب کر سکتی۔ اُن سے پوچھ سکتی کہ پچا آپ نے خیرات کی طرح کیوں مجھے اُن کی جھولی میں ڈالا۔ جیسے میں بوجھ تھی۔ آپ نے زبردستی طاہر انکل کے بیٹے بکے سر مجھے منڈھ دیا۔

اُس کے کانوں میں شریں بتائی کی تکلیف وہ آواز ابھی تک آرہی تھی۔ ”طاہر لغاری خود اب کہتا ہوگا کہ عمر نے مجھے زبردستی گھر بلا کے اپنی بیٹی دی ہے۔ ارے ہم نے بھی ماڑہ کا رشتہ دیا تھا عمر کو۔ مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد۔ حالانکہ شاہ زیب کوئی غیر نہیں تھا۔ اور ایک عمر بھائی ہیں خود بول کے بیٹی دی۔ اس طرح خود اپنے منہ سے بیٹی کے رشتے کے لیے کہا جائے تو سامنے والا بندہ بھی سوچتا ہوگا کہ بیٹی میں کوئی عیب ہوگا جب ہی سر سے بوجھ کی اتاری ہے۔ اسی وجہ سے تو طاہر اکڑ رہا ہے۔“ دریکتا کا دل چاہ رہا تھا یہاں سے اٹھ کے بھاگ جائے۔ ”ہاں نیک بخت تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہ سامنے کی بات مجھے نظر ہی نہیں آئی۔ اسی وجہ سے طاہر کا رویہ تکلیف دہ حد تک اجنبیوں کی طرح ہے۔ پر تم نے دریکتا کے سامنے یہ ذکر چھپڑ کے اچھا نہیں کیا۔ اب دیکھو کتنی پریشان ہوگی ہے۔“ اور نگزیب نے شریں کو گھورا تو اُس نے جھٹ دریکتا کو سینے سے لگایا۔ ”ٹھیک ہی تو کہتی ہوں میرے دل میں کتنی آرزو تھی کہ اسے اپنے عاشق کی دلہن بناؤں۔ عمر بھائی کی کتنی منتیں کیں پر نہیں مانے۔“ دریکتا نے ذرا سی ہمدردی پاتے ہی رونا شروع کر دیا۔ کتنے دن کے رُکے ہوئے آنسو تھے وہ دل کے زہر کو آنکھوں کے راستے بہا رہی تھی۔ شریں ہولے ہولے سے اُسے سہلا رہی تھی۔ چپ کر رہی تھی۔ پڑیہ ملاں دریکتا کے دل سے ختم ہونے والا نہیں تھا کہ پچا نے خود سے بول کے طاہر انکل کو رشتے کے لیے کہا اور پھر نکاح کے لیے منتیں کیں۔ اسی وجہ سے افراتفری میں اتنی جلدی اُس کا نکاح ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے وہ باتیں پوری جزئیات کے ساتھ یاد آرہی تھی۔

”خیر بیٹا دل چھوٹا نہ کرو میں طاہر کے گھر جاؤں گا اُسے پوچھوں گا۔ ہم کوئی ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں جو وہ اتنی بیگانگی اور اکڑ دکھا رہا ہے۔ اُس کا رویہ ظاہر تو یہی کر رہا ہے کہ جیسے وہ اس رشتے کو قائم رکھنا نہ چاہ رہا ہو۔“

تایا اور نگزیب نے یہ حوصلہ دیا اور ساتھ ہی ایک نئے امکان کی طرف بھی اشارہ کیا۔ ”ارے نہیں قائم رکھنا چاہتا تو نہ رکھے۔ ہماری بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ میں تو اپنے عاشق کی دلہن بناؤں گی اسے۔“ وہ پیار بھری نگاہوں سے شمار ہونے والے انداز سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ دریکتا اب بھی ہولے ہولے رو رہی تھی۔ وہ اپنے زیاں پ ماتم کناں تھی۔ بتائی شریں کے ارادوں پہ دھیان نہیں دے پائی تھی۔ نہ اس وقت اُسے اتنا ہوش تھا۔ وہ بات بھی ذہن سے نکل گئی تھی جس کی خاطر وہ تایا کے پاس آئی تھی۔ وہ انہیں یہ کہنے آئی تھی کہ میں پچا کو لے کے شہرا اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری تعلیم کا حرج ہو رہا ہے۔ پر حالات ایسے ہونے کہ یہ بات اُسے بھول ہی گئی۔ وہ جہاں سے چلی تھی وہیں کی

رہی۔ جیسے اس کشمکش میں ہو کہ کیا بولے کیا نہ بولے۔ میں نے تمہیں بتانا تو نہیں تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی مگر تمہاری سہ سے مجبور ہو کر بتا رہی ہوں..... وہ اس کے بعد خاموش ہوگی۔

دریختا نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تائی آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ رُک کیوں گی ہیں۔“ ”رُک کیوں گی ہے تم نے جانے تم میں سننے کا حوصلہ ہے بھی کہ نہیں۔“

وہ پھر کہتے کہتے رُک کی تو دریختا بے قرار ہوگی۔ ”پلیز تائی مجھے بتائیں کیا بات ہے۔“

”تو سنو ظاہر لغاری کے بیٹے اشعر لغاری نے شہر تمہارے گھر پہ فائرنگ کروائی ہے۔“

”تمہارے تائی اُن کے گھر گئے تھے کہ آپ لوگ بھول ہی گئے ہیں۔ رشتوں کی نزاکت کو۔ وہاں تو ٹھوڑی توڑ

میں نہیں ہوگی۔ جس کے بعد انتقامی طور پہ اُس نے فائرنگ کروائی۔ شکر ہے کہ گھر میں ملازموں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ورنہ میرے سہاگ کو کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی.....؟“

”خیر اس کے بعد بھی اگر تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو تو جاؤ۔ میں خود تمہیں اور عمر بھائی کو بچھو ادوں گی۔ اور نگزیر تو وقتاً فوقتاً تمہاری خبر گیری کرتے رہیں گے۔ پھر تم خود ہی سنبھالنا سب کچھ۔ کیونکہ مجھے اپنے بیٹے اور سہاگ کی ضرورت

ہے اُن کی سلامتی عزیز ہے۔ میں انہیں اس آگ میں کودنے کی اجازت نہیں دوں گی۔ جو عمر بھائی کی بے وقوفی کی وجہ سے لگی ہے۔“ شریں غصے میں تھی۔ دریختا وہیں سن سی ہوگی۔ اُف یہ کیا کچھ ہو رہا تھا۔ تو کیا شہر اُسے پپا کے ساتھ نوکروں کے

رحم و کرم پہ اکیلا رہنا پڑے گا جو تائی خبر گیری کی بات کر رہی تھی۔ ”میں تمہیں یہ سب بتانے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پر تم شہر اپنے گھر جانے کی ضد کر رہی ہو تو تنہا

بتایا ہے۔ میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔ جب کہو گی۔“ ”نہیں تائی اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اُس نے تیزی سے حوصلوں کی گرتی دیوار کو تھامنے کی آخری

کوشش کی۔ شریں کا چہرہ ایک دم پُر سکون ہو گیا۔ وہ دریختا کے سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھتے ہوئے کوئی حساب لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

ظاہر لغاری نے اپنے طور پہ عمر کے حلقہ احباب سے پتہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ کب امریکہ گیا ہے۔ اُسے اس وقت سخت حیرت ہوئی کہ اُس کی طرح باقی لوگ بھی عمر زیب کی امریکہ روانگی سے لاعلم تھے۔ آخر عمر کو اتنے راز دارانہ

طریقے سے امریکہ بھجوانے کی کیا وجہ تھی؟ ظاہر لغاری کی توجہ اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی طرف تھی۔ اُس کے ذہن میں سیدھی سیدھی ایک ہی بات آ رہی تھی کہ عمر اور دریختا کسی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس سے آگے وہ کوئی بھی منطقی خیال

دل میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ جانے ظاہر لغاری کے جی میں کیا سمائی کہ اشعر کے آفس پہنچ گیا۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُنہیں یہاں اپنے آفس میں دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی کیونکہ اس سے پہلے وہ یہاں ایک بار بھی نہیں آئے تھے۔ وہ اپنی

سے ہاں گیا اور ٹیبل کے پیچھے سے باہر آ گیا۔ ”خیریت پپا آپ اور یہاں۔“ ظاہر لغاری کوئی اور وقت ہوتا تو اُس کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے۔ پر ابھی پریشانی سے مسکرا رہے

بے جان مسکراہٹ۔ ”ہاں خیریت ہی ہے بس آج میں نے عمر کے ملنے جلنے والوں سے پوچھا کہ وہ کب امریکہ گیا۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں اس وجہ سے تمہارے پاس آیا ہوں۔“ ”میرے پاس اس وجہ سے کیا مطلب؟“

کا پتہ چلاؤ۔“ وہ جھجلا سے گئے تو اشعر انہیں دیکھ کر رہ گیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ عمر زیب اور دریختا کے بارے میں ہم سے

جھوٹ بولا جا رہا ہو۔ کچھ چھپایا جا رہا ہو۔ سازش ہے یہ عمر کے بھائیوں کی۔ وہ مجھے بتاتا رہتا تھا اپنے خاندان اور بھائیوں

کے بارے میں۔ عمر اور اُس کی اولاد سے زیادہ انہیں عمر کی جائیداد اور بینک بیلنس سے زیادہ دلچسپی ہے۔ شاہ زیب کی شادی اور الگ گھر میں شفٹ ہونے کے بعد اور نگزیر اور اُس کے بیٹے نے شاہ زیب کے کاروبار میں مداخلت شروع

کر دی اور چند ماہ میں ہی سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا۔ کاروبار کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ اب اُن کی نگاہیں عمر کے کاروبار کی طرف لگی ہوں گی۔ عمر ایک نیم پاگل بیٹے کے غم میں دیوانہ باپ۔ اُسے کیا پتہ کہ اُس کے گرد کیا ہو رہا ہے۔ اور نگزیر اور

اُس کے دونوں بھائی عمر کی فیکٹری اور آفس میں ہی ہوتے ہیں۔ باقی رہ گئی دریختا وہ ٹھہری ایک کمزور اور نازک سی لڑکی۔ دنیا کی چالباز یوں اور مکاریوں کا اُسے کیا پتہ۔ سو عمر کے رشتہ داروں کی بن آئی ہے۔ اپنے فائدے کے لیے اُن باپ بیٹی کو غائب کروا دیا ہے۔

بولتے بولتے ظاہر ہانپنے لگے تو اشعر نے شانے پہ دباؤ ڈال کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”اشعر تم کچھ کرو۔ عمر زیب میرا دوست ہے۔ اُس کی مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے۔“ وہ لجاجت سے بولے۔

اشعر کچھ سوچ رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے آپ گھر جائیں میں کرتا ہوں کچھ۔ آپ زیادہ پریشان مت ہوں۔“ اُس نے ظاہر لغاری کو گھر بچھو ادیا۔ اور خود اپنے ماتحتوں کو بتا کے عمر زیب کے آفس پہنچ گیا۔

وہ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ بڑا شاندار ویل ڈیکور۔ ہڈ آفس تھا۔ دل ہی دل میں اُس نے سراہا۔ اور نگزیر اور ہارن زیب دونوں بھائی ادھر بیٹھے تھے۔ اور نگزیر کے ذہن میں اشعر کو دیکھتے ہی خطرے کی گھنٹی بجی۔ اُس نے اندرونی

خوف پہ بڑی تیزی سے قابو پایا۔ اور اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ”آئیے سر کیسے آنا ہوا۔“ لہجہ اُس کا طنزیہ ہی تھا۔ اشعر نے نظر انداز کر دیا۔ اُس نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بجائے ڈائریکٹ دریختا کے بارے میں پوچھا۔ ”مجھے اپنی منگوا

سے بات کرنی ہے مجھے اُن کا کونیکٹ۔“ ”ہر چاہیے۔“ ”اوہ ضرور بات کریں۔ لیس ابھی بات کریں۔“ اور نگزیر نے اُسے نمبر بتانے کے بجائے اپنا سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف تیل جا رہی تھی۔ ”دریختا پپا میں ہوں

اور نگزیر، ہاں خیریت ہی ہے یہ اپنے اشعر لغاری صاحب تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ انہیں شاید کوئی شک ہے ہم پہ۔ تم انہیں بتا دو اپنے بارے میں کہ تم اور عمر بالکل خیریت سے ہو۔“ اور نگزیر نے فون کا اسپیکر آن کیا ہوا تھا۔ ایک ایک

لفظ اشعر کی سماعتوں نے صاف طور پہ سنا تھا۔ ”مجھے اُن سے کوئی بات نہیں کرنی۔ انہیں بتادیں۔ میں اس وقت پپا کے پاس ہوں۔“ اور نگزیر نے فاتحانہ نگاہوں سے اشعر کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنا غصہ چھپا لیا تھا۔ ”یہ بات تم خود کہہ دو

آفس سے۔“ اور نگزیر نے طنزیہ انداز میں سیل فون اشعر کی طرف بڑھایا۔ اُس نے کان سے لگایا اور اُس سے پہلے اسپیکر آف کیا۔ ”دریختا میں اشعر لغاری بات کر رہا ہوں۔ پپا کچھ پریشان سے ہیں سو اس.....“ اُس سے پہلے کہ وہ بات

پوری کرتا۔ دریختا نے بولنا شروع کر دیا۔ ”میں نے آپ سے یا انکل سے کوئی بات نہیں کرنی۔ آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ مہربانی ہوگی آپ کی۔ اور انکل کو شکریہ بول دیجیے گا کہ وہ ہماری خاطر اتنا پریشان ہوئے۔“ اس کے

ساتھ ہی دوسری طرف سے لائن کاٹ دی گی۔ اشعر کا جی چار ہا تھا کہ فون دیوار پہ دے مارے اتنی انسلیٹ جیسے وہ کوئی گرا پڑا انسان ہو۔ اُس کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ پپا خواہ مخواہ اُن کی خاطر اتنا پریشان ہو رہے تھے۔ جبکہ اُن محترمہ کو کوئی پرواہی نہیں تھی۔ کسی کی پریشانی کی فکر ہی نہیں تھی۔ اشعر اُسے لاپرواہ اور عام سی لڑکی تصور کرتا آیا تھا۔ پر یہ تو کچھ اور ہی نکلی تھی۔

”خیر: کچھ لیس گے محترمہ دریکتا صاحبہ آپ کو بھی“۔ وہ دل میں بولا تھا۔ ساتھ ہی میل فون واپس اور نگزیب کی طرف بڑھایا۔ ”نمبر نوٹ کر لیں دریکتا کا۔ وہ پاکستان آئی ہوئی ہے عمر کے ساتھ۔ ہو سکتا ہے تھوڑے دن تک پھر جائے۔“ انہوں نے اس بار بڑے نارمل طریقے سے یہ جملے ادا کیے تھے۔ ”نہیں مجھے نمبر کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر کبھی۔ خیر چلتا ہوں“۔ اشعر آفس سے باہر آ گیا۔ اپنے آفس روائگی سے پہلے اُس نے وہیں کھڑے کھڑے طاہر لغاری کو کال کی اور دریکتا سے ہونے والی گفتگو کا احوال بتایا۔ مگر اصل باتیں گول کر گیا بس اتنا کہا کہ عمر انکل اور دریکتا بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ یہ بات بھی چھپا گیا کہ دریکتا اور عمر انکل پاکستان آگئے ہیں۔ طاہر اب خوش اور مطمئن تھے۔ اور اپنے بے جا خدشات پر مسکرا رہے تھے۔

طاہر خوش تھے پر اشعر ایک آن دیکھی ہی آگ میں سلگ رہا تھا۔ پاپا کو اصل بات بتا کر وہ پریشان نہیں کرنا چاہا رہا تھا۔ خود ہی سب کچھ دیکھنا معلوم کرنا تھا۔ دریکتا نے آئندہ کال کرنے سے منع کر دیا تھا پر اب اُس پر ضد سوار ہو گئی تھی اُن پرستی ہاتھ باندھ کے سر جھکا کے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ اس بات کو پینے والا نہیں تھا۔ نہ برداشت کرنے والا تھا۔ طاہر لغاری نے عمر زیب کی مجبور یوں اور اُن کے رشتہ داریوں کو سوال بنا کے اُسے اپنے بیٹے کو بلیک میل کیا جذباتی طور پر۔ اپنے بیٹے کو دوست کی مجبور یوں پر قربان کر دیا۔ دوست کی مجبور یوں کی اہمیت بیٹے سے زیادہ تھی۔ مارے بندھے اُسے عمر انکل کی صاحبزادی سے نکاح کرنا پڑا۔ گویا پوری زندگی کا معاہدہ کرنا پڑا۔ ادھر طاہر لغاری دوست اور اُس کی بیٹی کے غم میں ادھ سوئے ہوئے جا رہے تھے۔

انہیں اپنے دوست، اُن کی بیٹی اور پھر اُس سے وابستہ رشتے کا کتنا احساس تھا۔ پریشان ہوتے رہے۔ اور ان محترمہ کو کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

عجیب روکے سرد انداز میں بات کی اور پھر حکم بھی صادر کر دیا کہ آئندہ مجھے کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ ایک لڑکی وہ بھی نازک اور کمزوری لڑکی بقول طاہر لغاری کے۔ اُسے حکم دے رہی تھی۔ یعنی اشعر لغاری کی سراسر توہین کر رہی تھی۔ وہ اسے بتائے گا بتا کے رہے گا کہ بی بی میں کوئی گلی یا سڑک سے گزرنے والا عام سانو جوان نہیں ہوں اجنبی نہیں ہوں۔ تمہارا شوہر ہوں۔ جملہ حقوق محفوظ ہیں تمہارے میرے نام۔ تم اتنی اکڑ کس بات کی دکھا رہی ہو۔ کس بات کا زعم ہے تمہیں۔ مجھے تم سے بات کرنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

اشعر نے بڑے غصے میں گاڑی کی اسپید بڑھائی تھی۔ دوبار تو گاڑی فٹ پاتھ پہ چڑھتے چڑھتے پئی۔

☆☆☆

دریکتا نے فون بند کر کے صوفے پہ اچھال دیا۔ جیسے وہ فون نہ ہو کوئی سانپ ہو۔ اور اُسے ڈس لے گا۔ تاپا نے اچانک غیر متوقع طور پہ کال کی تھی کہ لو اشعر لغاری سے بات کر دو اور اپنی خیریت سے آگاہ کر دو۔ دریکتا نے فون پہ کبھی اُس سے بات نہیں کی تھی۔ اس وقت اُس میں بے پناہ طاقت آگئی تھی اپنی بات کہنے کے لیے۔ اور اُس نے بڑے واضح انداز میں کہہ دیا کہ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔ اُس نے اشعر لغاری کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ کوئی اور خوش ہوا ہونہ ہو۔ اور نگزیب بہت سرور ہو رہے تھے۔

دریکتا نے تو کمال کر دیا تھا۔ اشعر لغاری کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ اُس کی اکڑ فون ہی نکال کے رکھ دی تھی۔ اب آئندہ کے نیے گراؤ ٹھہرا اور صاف تھا۔ اشعر اور طاہر لغاری کے دل میں اور دریکتا کے اس تلخ انداز سے بال تو

آہی گیا ہوگا۔ اب اور نگزیب نے فائدہ اٹھانا تھا۔ جب دریکتا رشتہ توڑنا چاہا رہی تھی تو اشعر لغاری کون تھا رشتہ جوڑ کے رکھنے والا۔ بہت جلد اور نگزیب نے طاہر لغاری اور اشعر سے ملنا تھا۔ تاکہ جلد از جلد یہ بوجھ بھی سر سے اترے۔

☆☆☆

سائرہ اور دریکتا کا ایڈیشن ایک ساتھ ہوا تھا۔ دو ماہ فارغ رہنے کے بعد اُس نے پھر سے کتابیں کھولی تھیں۔ یہ وہی کالج تھا جہاں ماڑہ نے شاہ زیب سے رشتہ طے ہونے اور اُن کے گھر سے واپسی پہ داخلہ لیا تھا۔ اُس میں بڑے کالج والی بات نہیں تھی پھر بھی دریکتا نے کپڑے دماڑ کر لیا تھا۔ کہ اسے اب گاؤں روہ کے اسی کالج میں تعلیم حاصل کرنی ہے۔ سائرہ شور کرتی تھی احتجاج کرتی تھی کہ اسے یہاں نہیں پڑھنا۔ پر اُس کے احتجاج کو کوئی خاطر میں لانے والا نہیں تھا۔ اُس کے برعکس اپنی قسمت پہ صابر و شاکر ہو گئی تھی۔ شاہ زیب کی موت کے بعد تمام تر حالات اُس نے قسمت کے کھاتے میں ڈال دیئے تھے۔ اُس کا پاپا کے ساتھ یہاں آنا، یہ انکشاف کہ پاپا نے خود زبردستی اُس کا رشتہ طاہر انکل کے بیٹے کو دیا، اُن لوگوں کی سرد مہری، بے رخی، پھر اُن کے گھر پہ اشعر لغاری کی فائرنگ، دریکتا نے سب کو قسمت کا لکھا تصور کر لیا تھا۔ وہ شہر اپنے گھر میں جانے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جہاں اشعر جیسے بے حس بے ضمیر شخص نے اُس کے پاپا کے خوابوں کے نکل کو تاراج کرنے کی کوشش کی۔ اُسے اپنی زندگی عزیز تھی۔ کیا خبر وہ اگر پاپا کے ساتھ وہاں چلی جاتی تو اشعر لغاری پھر سے اپنے مذموم عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتا۔ پہلی بار وہ وہاں نہیں تھی بیچ گی۔ لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ دوسری بار بھی بیچ جاتی۔ اُسے خود سے بھی زیادہ پاپا کی سلامتی اور زندگی عزیز تھی۔ بے شک وہ پاگل تھے پر زندہ تو تھے ناں۔ لہذا اُن کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ وہ سانس لے رہے تھے۔ دریکتا کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس لیے گاؤں سے قریبی اس چھوٹے شہر کے کالج میں داخلہ لیتے ہوئے اُس نے کوئی چوں چرا نہیں کی تھی۔

زندگی ایک لگی بندھی ڈگر پہ زواں دواں تھی۔ جس میں صرف خوشی اور اُمید کی ایک ہی کرن تھی۔ اور یہ اُمید کی کرن شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے حوالے سے تھی۔

وہ کالج جاتی تو عمر زیب کی دیکھ بھال دو ملازم کرتے۔ شریں تائی، نوید بیچا، اور اُن کی بیوی کھڑے کھڑے عمر زیب کو دیکھ جاتے۔ عمر زیب زیادہ تر سوئے رہتے یا جاگ رہے ہوتے تو خلاؤں میں گھورتے، خود سے باتیں کرتے، خود ہنستے خود روتے۔ اس دوران اگر اُن پہ دورہ پڑتا تو ملازم انہیں سنبھالتے۔ نوید کے دل میں جانے کس طرح یہ خیال آیا تھا کہ عمر زیب کو کسی بہت ہی اچھے ڈاکٹر اور علاج کی ضرورت ہے۔ اور نگزیب نے اُسے بُری طرح جھڑک دیا تھا۔ ”وہ پاگل ہی ٹھیک ہے۔ جس دن ٹھیک ہو گیا صدے سے اُس کا دل پھٹ جائے گا۔“ اور نگزیب نے پھر وہی بات دہرائی۔ تو نوید خاموش ہو گیا۔ لیکن اُس کا ضمیر کہتا تھا کہ عمر کا علاج ہونا چاہیے۔ اُسے ہوش مندوں کی طرح جینے کا حق ملنا چاہیے۔ ضروری تو نہیں ٹھیک ہونے کے بعد اُس کا دل صدے سے پھٹ جائے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے ٹھیک ہونے کے بعد شاہ زیب کے بچے کو دیکھ کے وہ اپنے سب غم بھول جائے اور اسی بچے میں ہی کھو جائے۔

نوید اکیلے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تمام تر اختیارات بڑے بھائی کے سپرد تھے۔ پھر شریں بھابھی بھی شوہر کے ساتھ تھی۔ بلکہ اور نگزیب نے جو کیا تھا اپنی خواہش اور مرضی سے کم اور شریں کے ایما پہ زیادہ کیا تھا۔ نوید اور ہارون بھی چاہتے تھے کہ فائدے میں انہیں بھی حصہ ملے۔ دریکتا لڑکی ہے۔ شادی کے بعد پرانے گھر چلی جائے گی اُس نے بھلا اتنی دولت اور جائیداد لے کے کیا کرنا ہے۔ اس سے اچھا نہیں ہے کہ یہ دولت اُس کے تاپا اور بیچا اپنے فائدے کے لیے



استعمال کریں۔ مردوں کی ضروریات زیادہ ہوتی ہیں اور عمر کے پاس تینوں بھائیوں سے زیادہ دولت ہے۔ اگر وہ اُس میں سے کچھ لے لیتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ عمر کوئی غیر تو نہیں اُن کا بھائی ہے اور بھائی کے بھائی پہ سو حق ہوتے ہیں۔ یہ خیالات اور نگزیب نے ہی نوید اور ہارون کے دماغ میں ڈالے تھے۔

نوید تو اُن سے الگ ہی ہو گیا تھا اور اپنی بیوی کو بھی اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ ہمارے پاس جو کچھ اپنا ہے بہت ہے ہمیں عمر کے حصے میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ وہ اپنی چوہدر اہٹ میں خوش تھا اور عمر کا علاج بھی کروانا چاہتا تھا۔

اسجد ہوشل سے چھٹیوں میں گھر آتا تو نوید اُس سے مشورہ کرتے کہ باقی دونوں بھائیوں کو اس بات پہ کیسے آمادہ کیا جاسکتا ہے کہ عمر کے علاج کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔ یوں خود سے پرانی میڈیسن دینا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ عمر کو کب تک نیند میں غرق رکھا جاسکتا تھا۔ جب وہ ان دوائیوں کا عادی ہو جاتا تو پھر اُسے سلا یا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ تب وہ زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس بات کو اور نگزیب سمجھ ہی نہیں پارہا تھا نہ اس پہ دھیان دے رہا تھا۔ اور یہی اُس کی غلطی تھی۔ نوید کے خیال میں ضروری نہیں کہ اور نگزیب اس سے متفق ہوتا۔ اُس کے سامنے عمر کے علاج سے زیادہ اہم مسائل تھے وہ چوکھی لڑ رہا تھا۔ اور ایک ایک بات کا خیال رکھنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

ماثرہ کو بہت شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ ذہین نے دیکھا تو شریں کو بلا لیا۔ ماثرہ کا ماتھا پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ شریں اُس کے سر ہانے بیٹھ گئی۔ ”اب مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے“۔ اُس نے شریں کے دونوں ہاتھ سختی سے پکڑ لیے تو وہ گھبرا گئی۔ ”میں ابھی ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہتی ہوں۔ اور ذہین تم سب ضروری چیزیں بیگ میں ڈالو۔ اور ہاں دریکٹا کو میرے پاس بھیجو ابھی اور اسی وقت۔ کسی کام میں بھی دیر نہ ہو“۔ شریں کا لہجہ تھکنا نہ تھا۔ ذہین اُلٹے قدموں لوٹی۔ پہلے دریکٹا کو بڑی بی بی کا بلاوا دیا اور پھر بیگ تیار کرنے لگی۔ اُس نے چند اُن سلسلے کپڑے ہی بیگ میں ڈالے اور یا ماثرہ بی بی کا ایک سوٹ۔

کیونکہ شریں بی بی نے آنے والے ننھے مہمان کے لیے کوئی خریداری نہیں کی تھی اور نہ ہی گھر میں کچھ بنایا تھا۔ نہ چھوٹے چھوٹے لنگوٹ، نہ بچھونے نہ ننھی مٹی شریں اور فراک نہ کچھ اور۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اللہ کی شان بے نیازی تھی۔ شاہ زیب کے ہونے والے بچے کے لیے کسی تیاری کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔

ذہین بیگ لے کے دوبارہ شریں کے پاس آگئی اور بیگ میں رکھی چیزوں کی تفصیل بتائی تو وہ اُس پہ آگ بگولہ ہونے لگی۔ حالانکہ یہ کام نانیوں، دادیوں کے ہوتے ہیں وہ ننھے بچے کی آمد سے پہلے ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں تیار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ شریں نے اس پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ باقی رہ گئی دریکٹا وہ کنواری لڑکی تھی۔ اُسے ان چیزوں سے نہ واسطہ پڑا تھا اور نہ اُسے علم تھا۔ ماثرہ نے بھی تو کوئی توجہ نہیں دی تھی اس پہ ذہین پہ گرجنے برسنے کے بعد شریں کو دریکٹا کا خیال آیا جو ابھی تک کبھی شریں اور کبھی ذہین کو دیکھ رہی تھی۔ ”دریکٹا ماثرہ کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی ہے تم میرے ساتھ ہاسپٹل چلو گی۔ جاؤ کپڑے تبدیل کر آؤ“۔ شریں نے ماثرہ کی تکلیف کا کچھ ایسے انداز میں ذکر کیا کہ دریکٹا کو حیا سی آگئی۔ شریں کو کسی شادی شدہ عورت تجربے کا عورت کو ساتھ لے کے جانا چاہیے تھا۔ نہ جانے دریکٹا کو ساتھ لے جانے میں کیا مصلحت کارفرما تھی۔ نوذیہ بھابھی کو بھی خبر ہو گئی تھی۔ وہ شریں کے کہے بغیر ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اُس نے وہ بے الفاظ میں دریکٹا کو ہاسپٹل ساتھ لے جانے پہ اعتراض کیا جسے شریں نے رد کر دیا۔

”میں اکیلی کس کس چیز کو دیکھوں گی۔ اچھا ہے یہ ساتھ ہوگی تو..... آخر کو شاہ زیب کے ہونے والے بچے کی پھوپھو ہے۔ اور اس رشتے سے اس پہ بڑے فرض عائد ہوتے ہیں۔ نوذیہ نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ شریں بھابھی سے بحث میں آگے نکلتا مشکل تھا۔

☆☆☆

نوذیہ نے ماثرہ کو پکڑ کے سیٹ پہ بٹھایا۔ اُس کے چہرے سے شدید تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ شریں اُس پہ سورتیں پڑھ پڑھ کے پھونکنے لگی۔ ماثرہ کی تکلیف میں بجائے کمی کے اضافہ ہو رہا تھا۔ ماثرہ کو دیکھ دیکھ کے شریں کو ایک برسوں پرانی رات یاد آگئی جب آئلہ اسی طرح درد سے تڑپ رہی تھی۔ شریں اُس کے پاس تھی پر کوئی اتفاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب بالکل وہی منظر تھا۔ شریں کانپ سی گی۔ ”اے اللہ میری بیٹی کو سلامت رکھنا“۔ اُس کے دل سے دعا نکلی تھی۔ ساتھ ہی پرانی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ شریں نے جان بوجھ کے آئلہ کو ہاسپٹل لے جانے میں عمر کو فون کرنے میں دیر لگائی تھی۔ اُسے آئلہ کی تکلیف سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مگر اب جب اپنی بیٹی تڑپ رہی تھی کراہ رہی تھی شریں کو بے پناہ اذیت ہو رہی تھی۔ اللہ یاد آ رہا تھا۔ لبوں پہ فریاد تھی دعا تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

☆☆☆

شریں کو ایک ایک لمحہ قیامت کی گھڑی کی طرح لگ رہا تھا۔ سفر ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وقت جیسے قہم سا گیا تھا۔ ماثرہ اب بالکل نیم جان ہو رہی تھی۔ طاقت ہی نہیں بچی تھی اُس میں۔

اور نگزیب نے سرکاری ہاسپٹل میں ماثرہ کا نام لکھوایا تھا۔ ہاسپٹل تھا تو سرکاری پر ماثرہ کے لیے وی۔ آئی۔ پی۔ روم اور علاج تھا۔ کانی بڑا ہاسپٹل تھا ہر قسم کی جدید مشینری اور طبی آلات سے آراستہ۔ اور نگزیب نے شریں کے مشورے پہ اس ہاسپٹل میں ماثرہ کا نام لکھوایا تھا۔ جہاں ایک الگ وارڈ وی آئی پی مریضوں کے لیے تھا بس پیسے دیں اور ہر قسم کی سہولت حاصل کریں۔ اور نگزیب نے اپنی بیٹی کے لیے بھی علاج کی مہنگی سے مہنگی سہولت حاصل کی ہوئی تھی۔ وہ ہاسپٹل لیبر روم میں پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے سب سے پہلے اُس کا بی بی دیکھا اور چیک اپ کیا۔ اُس کے چہرے پہ پریشانی سی تھی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے“۔ شریں ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے رو پڑی۔ ”نہیں خطرے والی بات نہیں ہے آپ بس دعا کریں اپنی بیٹی کے لیے“۔ وہ اُس کے شانے پہ تھپکی دے کے آئے بڑھ گئی۔ شریں دل ہی دل میں آیت کریمہ کا ورد کرنے لگی۔ نوذیہ قریب ماریٹ سے ہونے والے بچے کے لیے ضروری اشیاء لے آئی۔ کیونکہ دریکٹا نے نوذیہ چچی کو بتایا کہ شریں تائی نے کچھ نہیں خریدا ہے۔ نوکرانی پہ شور کر رہی تھیں۔ نوذیہ نے اپنے حساب سے خریداری کر لی تھی۔

شریں لیبر روم کے باہر کوریڈر میں اضطراب کے عالم میں چکر لگا رہی تھی۔ دریکٹا اور نوذیہ اُس سے کانی دور بیٹھی ہوئی تھیں۔ دریکٹا تو بالکل خاموش تھی۔ نوذیہ کو اچانک یاد آیا کہ چھوٹے بچے کے لیے خریدی گئی چیزیں وہ اُس کمرے میں ہی چھوڑ کے آگئی ہے جہاں ماثرہ کو ہاسپٹل لانے کے بعد تھوڑی دیر بٹھایا گیا تھا۔

”دریکٹا جا کے وہ بیگ لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی اٹھا کے لے گیا ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو سمجھو ہماری خیر نہیں ہے۔ شریں بھابھی کے ہاتھوں۔ میزے تو گھنٹوں میں در در ہتا ہے تمہیں پتہ ہے اس لیے جاؤ اور خود جلدی

وہ کرا جس کا فوزیہ چچی بتا رہی تھیں یہاں سے کافی فاصلے پہ تھا۔ پر وہاں بیگ تھا جس میں چھوٹے سے آنے والے مہمان کے کپڑے بھی تھے۔ سو دریکتا کو بیگ لانے میں تامل نہ ہوا۔ وہ دل میں دعا کرتی گئی کہ بیگ وہاں موجود ہو۔ اور خوش قسمتی سے بیگ وہاں ہی موجود تھا۔ وہ کرا رہی سپشن کے ساتھ تھا۔ اور بیگ ایک بیخ کی آڑ میں پڑا تھا۔ شاید اسی لیے کسی کی نظر نہیں پڑی تھی اُس پہ۔ اُس نے بیگ اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے چلتی اوپر بیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی جب کسی سے اُس کی زوردار نگر ہوئی۔ اور بیگ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اُسے ناک پہ تکلیف ہو رہی تھی اور آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

غلطی اُس کی اپنی تھی۔ اپنے خیالوں میں مگن ادھر ادھر دیکھے بغیر تیزی سے بیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی۔ اشعر اُسے دیکھ کر حیران تھا۔ وہ اپنے ایک کولیگ کی عیادت کرنے آیا ہوا تھا اور اب اُسے دیکھنے کے بعد واپس جا رہا تھا جب دریکتا سے اُس سے ٹکرائی۔ وہ بھی اُسے پہچان چکی تھی اور اپنی تکلیف پہ قابو بھی پالیا تھا۔ بیگ اٹھانے کے دو سائینڈ سے نکلنا چاہتی تھی جب اشعر نے اُس کا بازو تھام لیا۔ اس گرفت میں جا رہا نہ پن تھا غصہ تھا سختی تھی۔ وہ ڈر گئی۔ ”چھوڑیں میرا بازو تائی میرا انتظار کر رہی ہیں۔ ماثرہ بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ دریکتا اپنا بازو دیکڑے جانے پہ رو ہانسی ہو رہی تھی۔ اشعر کو اُس پاس سے گزرنے والوں کی جیسے کوئی پرواہی نہیں تھی۔ ”کہاں بیٹھی ہو چھپ کہ تم۔ اُس آ پتہ میں بہت جلد چلا لوں گا۔“ وہ دانت پیستے ہوئے اُس کے کان میں جیسے غرایا اور بازو چھوڑ کر تیزی سے بیڑھیاں اُتر گیا۔ دریکتا سے کتنی دیر بلا ہی نہیں گیا جیسے وہ اُسے پہنا تا ناز کر گیا ہو۔

☆☆☆

فوزیہ نے اُسے بیگ سمیت آتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ ”پر اُس کے چہرے پہ اڑتی ہوئیاں دیکھ کر پوچھ بیٹھی ”کیا ہوا ہے؟“ وہ وہ ہاسپٹل میں نہیں نے اشعر لغاری کو دیکھا ہے۔ بیڑھیاں چڑھ کے ادھر آپ کی طرف آ رہی تھی کہ وہ نظر آ گیا اور.....“۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی شریں تائی کو ریڈور کر اس کرتی اُن کی طرف آگئی تو بے تالی سے پوچھا تو شریں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری بچی کے لیے دعا کرو اُس کی مشکل جلد آسان ہو جائے۔“ شریں تالی کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی لگ رہی تھی جیسے روتی رہی ہوں۔“۔ ارے بھابھی ہماری دعائیں ماثرہ کے ساتھ ہیں۔ بس آپ سے غلطی ہوئی ہے۔ جب پتہ تھا کہ ڈیوری نزدیک ہے تو تین چار دن پہلے ہی آپ کو ماثرہ کو لے کر شہر آ جانا چاہیے تھا۔ ہم اس سفر اور تکلیف سے بچ جاتے جو ماثرہ اکیلی برداشت کر رہی ہے۔“ فوزیہ نے پورے خلوص سے کہا۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو بس مت ماری گئی تھی میری۔ ماثرہ کتنی دیر سے عذاب میں گرفتار ہے نہ جان چھوٹ رہی ہے نہ کچھ۔“ شریں ہاتھ ملتے ہوئے بولی تو فوزیہ ماثرہ کا درد جیسے اپنے دل میں محسوس کرنے لگی۔ ”بس دعا کرو ماثرہ خیریت سے فارغ ہو جائے۔ میری بچی جب سے اُمید سے ہوئی ہے۔ درد پہ درد جھیل رہی ہے۔“ شریں کہتے کہتے تلخ ہونے لگی۔ دریکتا کو اُن کی باتیں سن کے شرم سی آنے لگی۔ وہ اُن سے قدرے ہو کے بیٹھ گئی اور دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔

☆☆☆

اشعر تپا تپا سرخ چہرے ایسے گھر میں داخل ہوا تو طاہر لغاری دیکھتے ہی چونک گئے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ اشعر انہیں سلام کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ حالانکہ پہلے آفس سے آ کر وہ اُن کے پاس بیٹھا کرتا۔ دن بھر کا احوال

ساتا۔ اُس نے آج صبح ڈیوٹی پہ جانے سے پہلے انہیں بتایا تھا کہ وہ آفس سے اُٹھ کے ہاسپٹل جائے گا۔ اُس کے ایک کولیگ کو گولی لگی تھی۔ اشعر نے اُسے دیکھنے جانا تھا۔

طاہر لغاری پوچھنے اُس کے کمرے میں چلے آئے۔ وہ چیخ کر کے بیٹھا تھا اسی وقت۔ آئیے پہا۔ اُس نے مسکراہٹ ہونوں پہ سجالی تھی۔ ”تم ٹھیک تو ہونا۔ آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئے اور سیدھے ادھر چلے آئے۔ میرے پاس بیٹھے بھی نہیں۔“

”پہا میں ٹھیک ہوں۔ بس میرے کولیگ کی حالت ٹھیک نہیں۔ اس وجہ سے میں کچھ پریشان ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں سب چلتا ہے۔“ تھوڑی دیر میں ہی وہ نارمل ہو کے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ طاہر لغاری کو اُس نے آج بھی دریکتا سے ہونے والے تصادم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ وہ ذرا ذرا بات پہ پریشان ہو جاتے تھے۔ اگر انہیں پتہ چل جاتا کہ دریکتا اُن کی ہونے والی بہو اور عمر انکل پاکستان میں موجود ہیں تو انہوں نے اُسی وقت ضد پکڑ لینی تھی کہ مجھے ابھی لے کے جاؤ۔ اور محترمہ دریکتا جو فون پہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بھلا ملنے کے لیے کیسے راضی ہوتی۔ اور یہ جان کے طاہر لغاری کو جو شاک لگنا تھا وہ اُن کو اُس شاک سے بچانا چاہتا تھا۔ پہلے تو خود اُسے دریکتا سے ایک بھر پور ملاقات کر کے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ مجھ سے کیوں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اُس جواب کے بعد اور ساری تفصیلات معلوم کرنے کے بعد وہ طاہر لغاری کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اُسے پہلے انہیں سب کچھ بتا کر وہ پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ایک قیامت خیز انتظار کے بعد لیبر روم کا دروازہ کھلا اور سب سے پہلے نرسز اور اُس کے پیچھے ڈاکٹر باہر آئی۔ شریں بے تالی سے اُن کی سمت بڑھی۔ اُس کے پیچھے دریکتا اور فوزیہ تھی۔

”مبارک ہو آپ کی بیٹی نے خوبصورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا ہے۔ مگر ابھی اُن کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے۔ فی الحال آپ انتظار کریں وہ بے ہوش ہے۔ جیسے ہی اُن کی حالت سنبھلتی ہے آپ اُن سے مل لیجیے گا۔ ہاں آپ بے بی کو دیکھ سکتی ہیں۔“

وہ انہیں بتا کے دوبارہ لیبر روم کی طرف بڑھ گی۔ شریں کا جگمگا تا پُرامید چہرہ پھر سے بگھ گیا۔ وہ برسوں کی بیمار نظر آنے لگی اور پھر سے ماضی میں پہنچ گئی جب آنکھ نے درد اور کرب کے سمندر کو عبور کر کے ایک بیٹی کو جنم دیا تھا اور خود داعی اجل کو لبیک کہہ گی تھی۔ اس کی دفعہ بھی ڈاکٹر نے یہی کہا تھا کہ اللہ نے بہت پیاری بیٹی دی ہے مگر ہم آنکھ کو نہیں بچا سکے۔

شریوں کو یوں لگا جیسے یہ الفاظ معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ابھی ابھی اُن کے کانوں میں کسی نے کہے ہوں۔ کہ ”مبارک ہو۔ اللہ نے بہت پیارا بیٹا دیا ہے۔ مگر ہم ماثرہ کو نہیں بچا سکے ہیں۔“ اُن کے دل کو جیسے کسی نے منھی میں مسلا۔ وہ کوریڈور میں ہی سجدے میں گر گئی۔ ”اے اللہ میری ماثرہ کو سلامت رکھنا۔ اُسے زندہ رکھنا۔ اُسے لمبی زندگی دینا۔“ یہ ایک بیقرار ماں کے سینے سے نکلی ہوئی پکار تھی۔ اس پکار میں درد تھا۔ اضطراب تھا۔ آہیں تھی، آنسو تھے۔ جو عرش اوندی سے تکرار ہے تھے۔ ماثرہ کی اکھڑی سانسیں رفتہ رفتہ معمول پہ آنے لگیں۔ شریں کی دعا ایک بیقرار ماں کے دل کی بھارتیہ نے سن لی تھی۔

مائرہ کی بے ہوشی رفتہ رفتہ ٹوٹنے لگی۔ دھند میں ڈوبا ذہن بیدار ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں کھلیں۔ ڈاکٹر اُس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ مائرہ کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ بیماری لڑکی جو پہلی بار ماں بنی تھی۔ اس کا کیس بہت پیچیدہ تھا۔ ایک بار تو زس اور ڈاکٹر بھی گھبرا گئی تھی۔ جو مائرہ کے کیس کو ذیل کر رہی تھی۔

مائرہ نئی زندگی کو جو دھم لاتے ہوئے ادھ موٹی ہوئی جا رہی تھی۔ اُس کی سانسیں اکھڑ گئی تھی۔ لیکن خدا نے کرم کیا تھا۔ مائرہ کو مکمل طور پر ہوش آ گیا تھا۔

☆☆☆

شریں بے تابی سے اندر مائرہ کی طرف بھاگی۔ فوزیہ اور دریکتا اُس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ مائرہ کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی پر وہ ماں کو دیکھ کے مسکرا دی۔ شریں نے اُس کے ماتھے پر جھک کے پیار کیا۔ ”میری بیٹی کیسی ہے۔ اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“ ”میں ٹھیک ہوں۔“ مائرہ کی آواز میں نقاب تھی۔ اتنے میں زس ننھے منے وجود کو اپنے ہاتھوں میں اٹھائے اُن کی طرف بڑھی۔ ”بہت ہی خوبصورت بچہ دیا ہے اللہ نے آپ کو۔ شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی اور نوانا بالکل ٹھیک ہیں۔“ زس نے بچہ شریں کی طرف بڑھایا۔ اُس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تب دریکتا نے آگے بڑھ کر بچے کو خود زس کے ہاتھوں سے لیا۔ زس کو نانی کے اس بیگانگی بھرے رویے پر زیادہ دیر حیران ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔ وہ خوبصورت سی لڑکی جس نے بچے کو اُس کے ہاتھ سے لیا تھا۔ بچے کو چومتے ہوئے روئے جا رہی تھی ساتھ کچھ بول رہی تھی۔ فوزیہ چچی نے تھوڑی دیر بعد بچہ دریکتا کے ہاتھوں سے لے لیا۔ ”ماشا اللہ بہت خوبصورت ہے لگتا ہے شاہ زیب نے دوسرا جنم لیا ہے۔ ہو بہو اُس کی کاپی ہے۔ بچپن میں شاہ زیب بالکل ایسا ہی تھا۔ دیکھیں تو شریں بھابھی اپنے نواسے کو ذرا۔“ فوزیہ نے بچہ اُن کی طرف بڑھایا پر انہوں نے ہاتھ آگے نہیں کیے۔ ”دریکتا کو داسے۔ میں مائرہ کے پاس ہوں۔ دیکھ نہیں رہی موت کی دہلیز کو چھو کے لوٹی ہے۔“ وہ مڑ کے مائرہ کی طرف متوجہ ہوگی۔ فوزیہ نے سمجھ نہ آنے والے انداز میں کندھے اُچکائے۔ اتنے میں اُسی زس نے بچہ دوبارہ اُن سے لے لیا تھا۔ فوزیہ اور دریکتا دونوں سائیڈ پر آگے بیٹھ گئیں۔ دریکتا تائی شریں کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ انہوں نے نواسے کو دیکھ کے کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لا تعلقی سے مائرہ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ دریکتا ہولے ہولے رو رہی تھی۔ فونو نے اُسے کندھے سے لگا لیا۔ ”اب کیوں رو رہی ہو۔ دیکھو کتنا خوبصورت پیدا دیا ہے اللہ نے مائرہ کو اور تم پھوپھو بن گئی ہو۔ عمر بھائی جب دیکھیں گے تو ہوسکتا ہے کہ اُن کی ذہنی صحت پہ اچھا اثر پڑے۔ پر یہ شریں بھابھی کا رویہ میری عقل سے بالاتر ہے۔ نواسے کو دیکھ کے ذرا خوش نہیں ہوئی۔ ٹھیک ہے مائرہ نے بہت تکلیف اٹھائی ہے پر.....“ فوزیہ چچی تاسف زدہ تھی۔ دریکتا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ تو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی سوچ رہی تھی اگر شاہ زیب زندہ ہوتا تو اپنے بیٹے کو دیکھ کے کتنا خوش ہوتا۔ پاپا اگر ٹھیک ہوتے تو وہ شاہ زیب کی نشانی کو پا کر اپنے سب دکھ بھول جاتے۔ اُس کی زندگی میں کتنے ”اگر“ اور کتنے ”کاش“ جمع ہو گئے تھے۔

☆☆☆

زس فیڈ کروانے کے لیے بچے کو مائرہ کے پاس لائی تو اُس کے پاس بیٹھی شریں نے دھیرے سے انکار کر دیا۔ سر ہلایا اور مائرہ کو آنکھوں میں اشارہ کیا ”میری بیٹی کی حالت ابھی اس طرح کی نہیں ہے کہ فیڈ کر داسکے۔ آپ اسے

نی الحال اوپر کا دودھ ہی دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ زس کچھ بولنا چاہ رہی تھی پر شریں کا دونوک انداز دیکھ کر اُلٹے قدموں لوٹ گئی۔ جب بچے کی ماں کو خود ہی بچے کی پروا نہیں تھی تو اُسے کیا پڑی تھی کچھ بتانے کی یا ماں کے دودھ کے فوائد گوانے کی۔ ان بڑے لوگوں کے بڑے کام تھے بڑی بڑی سوچیں تھیں۔ جو اُن جیسے چھوٹے لوگوں سے نہیں ملتی تھی۔

☆☆☆

زس کے جانے کے بعد شریں کچھ بڑبڑانے لگی۔ ”ارے جسے دیکھو سر پہ چڑھا آ رہا ہے بچے کا یہ بچے کا وہ۔ اب تم نے پہلے ہی اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔ اب بچے کو فیڈ بھی کرواؤ۔ ان ہسپتال والوں کو تو کسی پہ بھی رحم نہیں آتا۔ انسان ہی نہیں ہے کوئی ان کی نظر میں۔ اب تم بھی بیوقوفی میں آ کے خود فیڈ کروانا شروع نہ کر دینا۔ اب اس دریکتا کو ہی دیکھ لو۔ ماں پیدا کرتے ہی مر گئی تھی۔ تو کیا اسے ماں کا دودھ ملا تھا۔ فیڈر پی کے بڑی ہوئی۔ اب بھر پور جوان اور صحت مند ہے۔ بچے کو ماں جب اپنا دودھ پلاتی ہے تو بچے کی محبت ماں سے بڑھ جاتی ہے۔ کل کو جدائی اور دوری کا ثنا عذاب لگنے لگتا ہے۔ اس لیے بچے کو گلے کا ہارمت بناؤ۔ اپنے بارے میں سوچو۔ اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچو۔ جو مائیں بچوں کے پیچھے اپنی زندگی تباہ کر دیتی ہیں۔ اُن کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ارے یہ اولاد بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ بال بوس کے بڑا کرو تو کھی احسان کو نہیں مانتی۔ خاص طور پر یہ لڑکے تو ماں کو خاطر میں لاتے ہی نہیں ہیں۔“

”تم نے ابھی زندگی کی خوشی دیکھی ہی کہاں۔ شادی ہوئی۔ سال بعد شاہ زیب تمہیں چھوڑ گیا۔ اُس کے جانے کے بعد تمہیں ماں بننے کا پتہ چلا۔ شادی کے ایک سال آٹھ ماہ بعد تم ماں بن گئی۔ اس عرصے میں کیا خوشی دیکھی یا پائی تم نے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ارے عورت کے لیے اُس کا شوہر اور اپنا گھر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اپنی گزشتہ زندگی بھول جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔ صرف اور صرف خود کو یاد رکھو۔“ شریں اپنا فلسفہ اُس کے دماغ میں اُنڈیل رہی تھی۔ مائرہ سر ہلارہی تھی۔ شریں مطمئن تھی کہ اُس کی باتیں مائرہ کی سمجھ میں آ رہی ہیں۔

☆☆☆

عمر حسب معمول بیٹھے کسی غیر مرئی شے کو دیکھ رہے تھے۔ آج وہ بڑا بڑا بھی نہیں رہے تھے۔ کافی دیر سے خاموش تھے۔ مائرہ ہاسپٹل سے گھر آ چکی تھی۔ زس نے چھوٹے بچے کو اٹھایا ہوا تھا۔ مائرہ تو لیٹی ہوئی تھی۔ انہیں آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی۔ مائرہ وہ تو آتے ساتھ ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ شریں بھی تھکن کی شکایت کر رہی تھی اُس نے زس کو اشارہ کیا کہ بچے کو یہاں سے لے جاؤ۔ وہ اٹھا کے آگئی۔ دریکتا نے دیکھا تو اُسے لے لیا۔ عمر خاموش تھے۔ دریکتا خوش فہمی کا شکار تھی کہ شاید پاپا شاہ زیب کے بچے کو دیکھ کے خوش ہو جائیں اور جس طرح فلموں میں ہوتا ہے کہ کوئی عارضہ ایک پل میں ساری زندگی بدل دیتا ہے ہوسکتا ہے اس طرح وہ ایک دم ٹھیک ہو جائیں۔ اسی خوش فہمی اور ڈھیروں توقعات کے ساتھ وہ اس ننھے سے فرشتے کو لے کر پاپا کے پاس آئی۔ جو بالکل گم صم سے تھے۔

”پاپا دیکھیں شاہ زیب کا بیٹا۔“ اُس نے بچے کو ذرا سا اُن کی طرف آگے کیا تاکہ وہ اُسے دیکھ سکیں۔ پر وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں تھے۔ اُسی غیر مرئی نکتے کو گھورتے رہے جس طرح اُس کے آنے سے پہلے گھور رہے تھے۔ وہ کچھ امید لگا ہوں سے اُن کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید خون کی کشش ہی اپنا اثر دکھا جائے۔ پر ایسا کوئی معجزہ نہیں ہوا۔ ہاں البتہ بچے نے کبھی سا کے رونا شروع کر دیا۔ اُس کی آواز سے عمر زیب کا ارتکاز ٹوٹ گیا تب انہوں نے دریکتا اور بچے کی

طرف دیکھا۔ پر ان نگاہوں میں شناسائی یا پہچان کی کوئی رشتہ نہیں تھی۔ بلکہ اُن آنکھوں میں عجیب سی جارحیت در آئی۔ انہوں نے در یکتا کے کچھ سوچنے سمجھنے سے بیشتر تقریباً جھپٹ کے بچے کو اُس سے لے لیا۔ در یکتا نے گھبرا کے زور سے چیخ ماری۔ اُس کے چیخ مارنے کی دیر تھی۔ عمر نے بچے کو وہیں بیڈ پہ بچھا اور خود در یکتا کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بچے نے زور سے چلانا شروع کر دیا۔ یہ اُس کی تکلیف کا اظہار تھا۔ در یکتا نے بڑی طرح چہینیں مارنا شروع کر دیں۔ عمر نے اُسے بالوں سے پکڑ لیا اور زوردار جھٹکا دیا۔ باہر سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئی۔ یہ ملازم اور ذہین تھی ساتھ ساتھ۔ بچے کے رونے کی آواز اور در یکتا کی چیخوں میں بے پناہ خوف اور درد تھا۔

دو ملازموں نے آ کے در یکتا کو عمر زیب سے چھڑا لیا اور ذہین نے بڑھ کے بڑی طرح روتے بچے کو اٹھایا اور تقریباً بھاگنے کے انداز سے نکلی۔

در یکتا کھانس رہی تھی۔ عمر اُس کا گلا دباتے رہے تھے۔ اُس کی گردن پہ نشان بنے پڑ گئے تھے۔ کوئی جا کے نوید کو بلا لایا تھا۔ اُنہوں نے عمر کو انجکشن لگایا تو وہ پُرسکون ہوئے۔ سارہ در یکتا کو دیکھ کے ڈر گئی تھی۔ جب وہ آوازیں سن کے ادھر آئی تو عمر در یکتا کا گلا دبا رہے تھے اور اُس کی آنکھیں جیسے باہر کی طرف اُبلتی پڑ رہی تھی۔ سارہ اُسے وہاں سے لے آئی۔

در یکتا کو حلق میں بہت درد ہو رہا تھا۔ عمر نے تو جیسے سارا غصہ اور طاقت اُسی پہ صرف کر دی تھی۔ ”تمہیں جب پتہ ہے کہ عمر چچا کو دورہ پڑتا ہے تم اُن کے پاس کیوں جاتی ہو۔ میں تو حیران ہوں کہ تم اُس کمرے میں رہتی کیسی ہو۔ تمہیں اپنی جان عزیز نہیں۔“ سارہ حیرانی سے اُسے سوال کر رہی تھی۔ در یکتا کے چہرے پہ ابھی تک تکلیف کے آثار تھے۔ وہ میرے پناہ میں اُنہیں کیسے چھوڑ دوں۔ اور مجھے کیا پتہ کہ اُن پہ دورہ پڑ جائے گا۔ میں تو شاہ زیب بھائی کا بیٹا اُنہیں دکھانے لے گئی تھی کہ ہو سکتا ہے اُن کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی آجائے۔ پر کیا پتہ تھا ایسا ہوگا۔

”لو پاگلوں کا کیا بھروسہ کسی وقت کیا کر جائیں۔ تمہیں خود احتیاط کرنی چاہیے۔“ سارہ نے بڑوں کی طرح نصیحت کی۔ ”ارے ہاں سنا ہے کہ ابو تمہارے سسرال جائیں گے اور خلع کی ثابت کریں گے کیونکہ اُن کا رویہ بہت خراب ہے۔“ سارہ نے سنی سنائی بات اُس کے سامنے دہرائی تو در یکتا کے سارے اعصاب تن سے گئے۔

”ویسے تمہارا ہنزینڈ بہت ڈشنگ ہے دیکھنے میں تم سے سات آٹھ سال بڑا لگتا ہے پر اُس کی اس میچورٹی میں بہت اثریشن ہے۔ میں نے جھٹ سے دعا مانگ لی کہ مجھے بھی ایسا ہی لائف پازنر ملے۔ میں تمہیں بہت لگی کہتی تھی کہ کیا اتنا ڈشنگ ہینڈم ہے۔ ہنزینڈ ہے پر اب افسوس ہوتا ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے گا۔“

میں نے سنا ہے کہ عمر چچا نے خود اُن لوگوں کو تمہارے رشتے کا کہا تھا۔ ”سارہ اُس کی دلی حالت سے بے خبر اپنی ہانکے جارہی تھی اور در یکتا کو اپنے رخسار احساس توہین سے لال ہونے لگ رہے تھے۔“ گویا یہ بات سب کو پتہ چل گئی ہے۔ سارہ اُس سے زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ پر ابھی اُسے اپنی اس کزن پہ بہت ترس آ رہا تھا۔ جسے اُس کا شوہر رخصتی سے پہلے ہی چھوڑنے والا تھا۔ اس بات سے اُسے عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ شریں نے کہا تھا کہ ادھر اشعر لعلی سے خلع ملتے ہی وہ در یکتا کو اپنی بہو بنا لیں گی۔ عاشر بھائی موٹے، غصیلے جڑ جڑے، ذرا ذرا سی بات پہ آپے سے باہر ہو جانے والے۔ بھلا در یکتا اُن کے ساتھ کیسی لگے گی۔ وہ اکثر یہ تصور کرتی۔ ای نے سختی سے منع کیا ہوا تھا کہ اُس بات کا

ذکر کسی سے مت کرنا ورنہ فوزیہ اور فرح چچی کا مزاج بگڑ جائے گا۔ وہ اُسی امید پہ اپنا کوئی حصہ نہیں مانگ رہیں کہ اورنگزیب در یکتا کو خلع دلوا کے اُس کے بیٹے کے ساتھ شادی کروائیں گے۔ اُنہوں نے دونوں بھائیوں سے کوئی بات کی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے قاسم یا اسجد میں سے در یکتا جس کی بھی بیوی بن جاتی اُس کے وارے نیارے ہو جاتے۔ باقی کا حصہ اورنگزیب کا تھا آخر وہ بھی تو عمر کے بھائی تھے۔ کچھ بُرا تو نہیں سوچ رہے تھے۔ در یکتا کی شادی اگر اپنے خاندان میں ہو جاتی تو اس میں کیا برائی تھی۔ آخر کو اپنے تھے۔ خاندان کی جائیداد بھی خاندان میں رہ جاتی۔

پر نوید اس درد سے باہر ہو چکے تھے۔ اسجد نے صاف کہہ دیا تھا کہ در یکتا اُس کے لیے بہن جیسی ہے۔ میں کبھی بھی اُس سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ اس بات پہ ماں باپ سے لڑا تھا کہ آپ کی سوچ کیسی ہے ایک بیٹی کو سازشوں سے خلع کروائیں گے۔ ایسے آپ کو کیا ملے گا۔ میری بھی دو بہنیں ہیں۔ کل کو اُن کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ اُس کے سمجھانے کا اثر کافی خوشگوار تھا۔ نوید باز آگئے تھے اور اُنہوں نے اورنگزیب بھائی سے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ مجھے عمر بھائی کی دولت میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ اُنہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اور باقیوں کو اُن کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

اورنگزیب تو خوش تھے کہ در یکتا کے اُمیدواروں میں سے ایک کی کمی ہو گئی تھی۔ باقی قاسم رہ گیا تھا۔ اُنہوں نے بالابالا ہی خلع کے بعد اپنے بیٹے عاشر کے ساتھ در یکتا کے نکاح کا پلان بھی مکمل کر لیا تھا۔ نکاح کے بعد کسی نے کیا باگاڑ لینا تھا۔

عمر زیب نے در یکتا کا نکاح خاندان سے باہر اپنے دوست کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ عمر کا فیصلہ کسی کو بھی پسند نہیں آیا تھا۔ اس ناپسندیدگی میں اورنگزیب بھی شامل تھے۔ وہ کوئی بُرا تو نہیں کر رہے تھے۔ اگر در یکتا کی شادی پھر سے خاندان میں کرنے کی سوچ رہے تھے تو آخر اُنہوں نے بھی تو ماہرہ کی شادی خاندان میں ہی کی تھی۔ پھر عمر کیوں خاندانی روایات سے بغاوت پہ اتر آتا تھا۔ اس بغاوت کی سزا اُسے ملنا ضروری تھی۔

شریں کے دل میں زہر بھرا تھا اور اورنگزیب اُس کی ہر بات مانتا تھا۔ اب نہ آکر رہی تھی اور نہ عمر پہلے جیسا ہوش مند رہا تھا پر شریں کے دل میں وہی رنجش تھی۔ کہ عمر نے دوبار اُس کی بہن بیٹا کو ٹھکرایا۔ اور اس کی سزا اُسے قدرت سے مل رہی تھی۔ (شریں کے خیال میں)۔

☆☆☆

ذہین روتے روتے بچے کو اٹھائے ماہرہ کی طرف گئی تو شریں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ ”کہاں جا رہی ہو۔“ اُس کی آواز میں کڑک تھی۔ ”جی ماہرہ بی بی کی طرف لے کے جا رہی ہوں۔ یہ بہت دیر سے رو رہا ہے۔ جب سے سو کے اٹھا ہے روئے جا رہا ہے۔“ تو ماہرہ کیا کرے یہ رو رہا ہے تو..... جا کے در یکتا کے حوالے کرو۔ اور تم نہیں سنبھال سکتی چھٹانک بھر کے بچے کو۔ جھٹ ماہرہ کی طرف بھاگتی ہو۔“ شریں نے چٹاخ سے ایک تھپڑ ذہین کے منہ پہ جڑا۔ تو اپنی جھونک میں وہ لڑکھڑاسی گی۔ ”حرام خور کس بات کے پیسے لیتی ہو۔ اسے سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس کی پھوپھی بھی ہے۔ اُس کا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔ جب دیکھو ماہرہ کے سر پہ سوار ہو جاتی ہو۔ جاؤ اسے فیڈر بنا کے دو۔ بھوکا ہوگا یہ۔ اس لیے رو رہا ہے۔ جاؤ شاباش۔“ آخر میں شریں نے خود ہی لہجہ نرم کر لیا تو ذہین کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تھپڑ کھانے کے سہم گئی تھی۔



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیک اور ریڈیو مائیک کے ساتھ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اب تو ماثرہ سے ملنا بہت ضروری تھا۔ بہت ہی ضروری۔ اُس نے بڑا انتظار کیا تھا اس وقت کا۔ اور ماثرہ کا پیچھا بھی اس بوجھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اب باسط نے اپنی سوچوں کو اپنے خوابوں کو تعبیر کی صورت دینی تھی۔

☆☆☆

اور نگزیب اور اُن کے گھر، حیرت کی بات تھی۔ اُن کے انداز میں کینہ پروری اور جارحیت تو اشعر نے اسی دن محسوس کر لی تھی۔ جب عمر انکل کے آفس میں اُن سے ملاقات ہوئی تھی اور آج وہی کینہ پروری چہرے سے چھائے وہ اُن کے گھر چلے آئے تھے۔ اخلاق کے تقاضے تو پورے کرنے تھے۔ بہر حال اُن کے تیوروں سے لگ نہیں رہا تھا کہ وہ کسی اچھی نیت سے اُن کے پاس آئے ہیں۔ ملازم نے فوراً ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلوا کے انہیں اندر بٹھایا اور موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈرنک مختلف لوازمات سمیت اُن کے آگے لا کے رکھا۔

ظاہر لغاری گھر میں ہی تھے اور یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں اور نگزیب کے آنے کی خبر نہ ہو پاتی۔ وہ تو سنتے ہی خوش ہو گئے اور جوتے پہن کے فوراً اُن کی طرف چلے آئے۔ حالانکہ دوپہر میں وہ کچھ دیر آرام کرنے کے خادی تھے اور اس آرام میں کسی کوخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اشعر نے خود انہیں اور نگزیب انکل کے آنے کا بتایا تھا۔ اُن کی باقی ماندہ نیند اڑ ہی تو گئی۔

بڑے خلوص سے اور نگزیب سے بغل گیر ہوئے۔ اُن کا رویہ قدرے سرد سا تھا۔ بالکل اُس کولڈ ڈرنک کی طرح جو اور نگزیب کے سامنے ٹیبل پہ پڑا تھا۔ اور نگزیب نے اُسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ ظاہر نے خود گلاس اُن کی طرف بڑھایا۔ ”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے“۔ انہوں نے گلاس پرے کر دیا۔ ”کیسے آنا ہوا ہے“۔ ظاہر کی خوش مزاجی اور نگزیب کی سرد مہری کے باوجود عروج پہ تھی۔

”میں بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ سوچا تو کچھ اور تھا پر وہ مناسب نہیں لگا سو اس لیے آپ کے پاس حاضر ہو گیا۔“ وہ اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گئے۔ ظاہر بے تابی سے اُن کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگے۔

اور نگزیب نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہیں حقیقی معنوں میں حیران و پریشان کر دیا۔ ”میں دریکتا کی خلع کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں“۔ وہ یوں کہہ رہے تھے جیسے عام ہی بات ہو۔

اشعر کی کپٹی کی دائیں رگ پھڑکنے لگی۔ جو اُس کے شدید غصے اور رد عمل کا اظہار تھا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں“۔ اشعر غصے میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ظاہر نے اُس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔ انہیں صورتحال کی سنگینی اور اشعر کے غصے کا بھی پتہ تھا۔ ”میاں صاحبزادے آرام سے بیٹھو۔ آپ سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود سے نہیں آیا ہوں اور نہ مجھے اس طرح آنے پہ کوئی خوشی ہے“۔ اور نگزیب کا لہجہ اب بالکل ہی بدل گیا۔ صورت حال کے مطابق اُس نے اپنے رویے میں لچک پیدا کر لی تھی۔

”تو پھر آپ کس کے کہنے پہ یہاں آئے ہیں“۔ اشعر کے غصے میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔

”میں دریکتا کے کہنے پہ اُس کے زور دینے پہ اور مجبور کرنے پہ آپ کے پاس آیا ہوں۔ وہ خلع مانگ رہی ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ اس تعلق کو مزید برقرار رکھنا نہیں چاہتی۔ عاقل و بالغ ہے۔ بااختیار ہے کوئی اُسے روکنے والا نہیں ہے اور نہ وہ میری سن رہی ہے“۔ میں نے اپنی اولاد اور اُس میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ اُسے پیار سے کہا لاڈ سے کہا کہ یہ اچھا نہیں ہے۔ پر اُس کی ایک ہی رٹ ہے کہ اُسے خلع چاہیے۔ میں اس پہ بے حد شرمندہ ہوں۔ میری ایک بیٹی اور

ابھی تک بچے کا نام نہیں رکھا گیا تھا اور نہ ہی کسی نے دلچسپی لی تھی۔ دریکتا نے خود ہی اُسے طیب کہہ کے بلانا شروع کر دیا تھا۔ آخر بچے کا کوئی نام ہونا تو ضروری تھا۔ ذہین کے لیے بھی آسانی ہو گئی تھی۔ اب وہ روتا تو وہ دریکتا کے پاس آ کے کہتی کہ طیب رورہا ہے یہ کر رہا ہے وہ کر رہا ہے۔ وہ روتا بھی تو بہت زیادہ تھا۔ جیسے چیخ چیخ کے ماں کی بے زحنی کا احتجاج کر رہا ہو جس نے ابھی تک اُسے غور سے دیکھا تک نہ تھا۔ شروع میں ہاسپٹل سے آنے کے بعد کچھ دن طیب ماثرہ کے کمرے میں ہی سویا۔ ساتھ ذہین بھی ہوتی۔ چار دن بعد شریں نے حکم صادر کر دیا کہ طیب کو ماثرہ کے پاس لے جاؤ۔ ذہین کو ماثرہ کے برابر والا کمرادے دیا گیا۔ اب وہ طیب کے رونے پہ پہلے کی طرح ماثرہ کی طرف نہیں بھاگتی تھی۔ خود ہی شانے سے لگا کے تھپکتی۔ یا پھر دریکتا کو بتاتی۔ وہ اُسے ماثرہ بی بی کی طرح جھڑکتی نہیں تھی بلکہ طیب کو اُس کی گود سے لے لیتی۔ اور حیرت انگیز طور پہ طیب اُس کے پاس جاتے ہی اُس کے سینے سے لگ کے خاموش ہو جاتا اور ذہین کو تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کا نام مل جاتا۔

☆☆☆

بیبا اُسے سینے سے لگائے کتنی دیر اپنی ممتا اُس پہ نثار کرتی رہی۔

باسط آ گیا تھا اس بار وہ کچھ دیر سے آیا تھا۔ اس لیے بیبا بے قراری تھی۔ ”اس بار بڑے دن لگا دیئے“۔ وہ اُن کا چہرہ ہاتھ میں تھامے دیکھ رہی تھی۔ ”ای اب میں نے وہاں اپنا کاروبار شروع کر دیا ہے ایک دوست کے ساتھ۔ اس لیے لیٹ آیا۔ اپنا کاروبار ہے اس لیے ذمہ داری بھی زیادہ ہے“۔ ”اللہ تمہیں اور ترقی اور کامیابی دے۔ خیر بیٹھو میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے چائے بناتی ہوں“۔

بیبا جانے لگی تھی۔ باسط نے روک لیا۔

”ای اس وقت کسی چیز کا بھی دل نہیں ہے میرے پاس بیٹھیں کچھ دیر“۔ وہ اُسے نثار ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں حمزہ احمد بھی چلے آئے۔ اور باسط کے باقی بھائی بہن بھی اُس کے گرد جمع ہو گئے۔ اُس نے سب کو اُن کے گفت و بے۔

”ای اب میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں دو گھنٹے بعد مجھے اٹھادینا۔ یہاں ایک بندے سے ملنا ہے اپنے کام کے سلسلے میں“۔ باسط نے صوفے سے اٹھ کے کھڑے ہوتے ہوئے ایک زوردار انگڑائی لی۔ ”ہاں سو جاؤ میں دروازہ بند کر جاتی ہوں۔ ارے میں ایک بات بتانا بھول ہی گئی کہ ماثرہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بہت خوبصورت اور صحت مند ہے۔ میں ابھی تک اُسے دیکھنے جا نہیں پائی ہوں۔ میں اور تم دونوں اکٹھے چلیں گے“۔

بیبا جاتے جاتے دروازے سے پلٹ آئی اور اُسے یہ اطلاع دی۔ وہ ماثرہ کے گھر بیٹے کی پیدائش کا یوں خوشی خوشی بتا رہی تھی جیسے وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ باسط کے دل میں ناپسندیدگی کی ایک لہری اُٹھی۔ جسے اُس نے مشکل سے دبایا۔ ”ہاں امی ضرور چلیں گے“۔ اتنا کہہ کے اُس نے چادر میں منہ چھپا لیا جیسے سخت نیند آ رہی ہو۔ حالانکہ اب اُس کی نیند اڑ گئی تھی۔

بیبا دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

ماثرہ کے گھر بیٹا۔ شاہ زیب اور اُس کی قبرتوں، شدتوں کی یادگار جیتی جاگتی نشانی۔ اُس نے تکیہ دونوں بازوؤں میں دبا کے دہرا کر دیا۔ جیسے ساری نفرت، جلن، کڑھن اس تکیے پہ نکالنا چاہ رہا ہو۔

بھی ہے۔ اس کے علاوہ میرے دو بھائیوں کی بھی بیٹیاں ہیں۔ اگر اس خلع کے بدلے آپ ان میں سے جس کا بھی رشتہ طلب کریں میں حاضر ہوں۔ کیونکہ وہ کسی طرح بھی نہیں مان رہی۔ اور میں یہاں مجبور ہوں۔“

اور نگزیب کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

وہ سچ سچ ایک مجبور باپ نظر آ رہا تھا اور جس رعونت سمیت ان کے گھر آیا تھا وہ اب کہیں سے بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

طاہر لغاری سر پکڑ کے بیٹھ گئے تھے۔ پر اشعر کے چہرے پہ چٹانوں کی سی سختی اور دشمنی تھی۔ وہ خاموش ہو گئے۔ بیٹھ جانے والوں میں سے نہیں تھا۔ ”آپ کو دریکتا نے یہاں میرے پاس بھیجا ہے ناں تو سن لیں اور اُسے بھی جا کے بتا دیں کہ میں اُسے خلع نہیں دوں گا۔“ اُس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا تو اور نگزیب نے ایک اور کوشش کی۔ ”میرے سامنے کی بات ہے وہ تمہارے ساتھ بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ جب ایک فریق راضی ہی نہیں ہے تو ایسے بندھن زبردستی جوڑے رکھنے کا کیا فائدہ۔“ مجھے فائدے اور نقصان سے کچھ نہیں لینا بس اگر میں نے کہہ دیا ہے کہ میں خلع نہیں دوں گا تو نہیں دوں گا۔“

”تو ٹھیک ہے پھر آپ عدالت میں آ جائیں آپ دونوں۔“ اور نگزیب نے کھڑے ہو کر طاہر لغاری سے کہا اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا پر اشعر نے اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ ”میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں کہ بات عدالت سے باہر ہی طے ہو جائے کیونکہ اُس نے مجھے کہہ کے بھیجا تھا کہ میں فیصلہ کن جواب لے آؤں۔ آپ بھی عزت دار ہیں اور ہم لوگ بھی روایتی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری طرح طاہر صاحب آپ بھی نہیں چاہیں گے کہ گھر کی باتیں عدالت میں ڈسکس ہوں۔“

”مجھے کچھ بھی بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہم عزت اور غیرت کے پیچھے جان دینے والے لوگ ہیں۔ اور دریکتا صاحبہ کو معلوم نہیں ہے کہ اُس کا پالا کس شخص سے پڑا ہے۔ بہت جلد سمجھ جائے گی۔ میں خود آؤں گا اُسے سمجھانے۔“

طاہر لغاری پریشانی سے کبھی اور نگزیب کو اور کبھی اشعر کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں بہت ساری باتوں کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ الجھ رہے تھے۔ اشعر نے انہیں اس لیے نہیں بتایا کہ وہ پریشان ہوں گے۔ اب اور نگزیب کے ذریعے انہیں وہ باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ وہ اُسے پوچھنا چاہ رہے تھے کہ دریکتا اور عمر کب آئے ہیں واپس۔ مگر موضوع اس وقت اتنا گھمبیر طریقے سے زیر بحث تھا کہ وہ کوئی سوال کر ہی نہیں پار رہے تھے۔ یا انہیں موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

”اچھا میں چلتا ہوں اگر صلح و صفائی سے بات طے ہو جاتی تو اچھا تھا۔ پھر بھی میں انتظار کروں گا آپ کے مثبت جواب کا۔ کیونکہ میں جگ ہنسائی سے بچنا چاہ رہا ہوں۔“ جاتے جاتے اور نگزیب نے پھر کہا تو اشعر پھر گیا۔ ”ہماری طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں ہے آپ میرے گھر بیٹھ کے میری توہین کر رہے ہیں۔ آپ عمر انکل کے بھائی ہیں اس ناطے سے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آپ کی جگہ یہ بات کوئی اور کرتا تو میں اُسے شوٹ کر چکا ہوتا۔ بس بہت ہو چکا ہے۔ بات عدالت میں جائے یا کہیں اور۔ میں اپنی عزت اور اُن کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ آئندہ میرے گھر میں دریکتا کے ترجمان بن کے مت آئیے گا اور نگزیب انکل۔ ورنہ پھر میں بھی آپ سے کسی اور طرح ملوں گا۔“ اشعر کا لہجہ کسی کمزور دل انسان کے لیے برداشت کرنا مشکل تھا۔ اور نگزیب بھی ایک ٹائپ کے لیے سوچ میں پڑا

مجھے۔ پھر سر جھٹک کے اُس کی طرف دیکھا اور طاہر لغاری سے ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔ وہ ابھی تک پریشانی سے نظریں جمائے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں سے ابھی ابھی اور نگزیب نکل کے گئے تھے۔

”اشعر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر واپس آ آیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ اور دریکتا یہ خلع کا مطالبہ کیوں کر رہی ہے۔“ طاہر لغاری حد سے زیادہ پریشانی کا شکار تھے۔ ”پہا سب پتہ چل جائے گا کہ ایسا ویسا کیوں ہو رہا ہے۔ یہ اور نگزیب انکل جن کو اُن ”محترمہ“ نے ترجمان بنا کے یہاں بھیجا وہ در پردہ دھمکی دے رہے تھے عدالت جانے کی۔ میں عدالت سے نہیں ڈرتا۔“ ”تم ڈرا سکون سے مجھے بات کرنے دو خود دریکتا سے۔ اُس کے بعد دیکھا جائے گا۔“ طاہر لغاری کو تھوڑی امید کی روشنی نظر آئی۔ ”نہیں پاپا آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے میں خود کروں گا۔ رشتہ آپ کی مرضی سے طے ہوا ہے اور اسے میں اپنی مرضی سے نبھاؤں گا۔ آپ کسی بات کی فکر مت کریں۔“ وہ بہت ضد کا شکار لگ رہا تھا۔ طاہر لغاری خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔

☆☆☆

جب سے عمر کو دورہ پڑا تھا آخری بار۔ اُس کے بعد نوید پچانے دریکتا کو اپنا کمر الگ کرنے کہا تھا۔ اُن کے سمجھانے اور اپنی حفاظت کے نقطہ نگاہ سے تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئی تھی۔ عمر اب اکیسے ہوتے تھے۔ دریکتا کو یہ بات پسند تو نہیں تھی پر مجبوری تھی۔ وہ پیپا کے ساتھ ایک کمرے میں تھی تو اُسے خاموشی سے تحفظ کا احساس تھا۔ جو الگ کمرے میں رہنے سونے سے ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اور نگزیب شریں تائی دونوں دریکتا کے ارد گرد موجود تھے۔ اور نگزیب نے آج کی ملاقات اُن کے گھر جانے کی تفصیل زیب داستان کے ساتھ شریں اور دریکتا کو بتائی تھی۔ ”دریکتا تم میرے لیے ساڑھ اور ماڑھ کی طرح ہو۔ میں تمہارا پڑا نہیں سوچ سکتا۔ اشعر ایک کرپٹ پولیس آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی لحاظ سے بھی نہایت گیا گزرا انسان ہے۔ آج جب میں اُن کے گھر گیا۔ طاہر لغاری اور اُس کے رویے کا سبب پوچھنے تو مجھے بہت ذلیل کیا اُن لوگوں نے۔ میری تو کچھ عقل میں سما ہی نہیں رہا ہے کہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عمر نے آخر یہ غلطی کیوں کی۔ اشعر لغاری نے عمر کا زیادہ حصہ ملک سے باہر گزارا۔ وہ وہاں کیا تھا کیا نہ کرتا تھا۔ کیسے رہتا تھا کیسے لوگوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ اُس کی سوسائٹی کسی تھی۔ عمر بھائی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ بس بے دقتی کی جو جلدی میں تمہارا نکاح وہاں کر دیا۔ اُن باپ بیٹے کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں؟ میں تمہیں بتا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے صرف تمہاری اجازت درکار ہے۔ کہ میں عدالت میں خلع کی درخواست دائر کروں۔“ دریکتا خاموش تھی۔ اُسے شریں نے دوبارہ پوچھا تو اُس نے ہولے سے اراہات میں ہلا دیا۔

”تمہاری بھلائی اور بہتری کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر تمہاری مرضی یہ نہیں ہے تو میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ دھوم دھام سے تمہیں رخصت کروں گا بیٹیوں کی طرح۔“ ”نہیں بتایا جان جو آپ کہتے ہیں دو ٹھیک ہے۔“ یکدم وہ بڑبڑاسی گئی جیسے اس خیال سے ہی گھبرا گئی ہو۔ اشعر کے ساتھ رخصت ہونے کے خیال سے ہی اُس کے سینے چھوٹ گئے۔ اشعر کا غزاہٹ بھرا لہجہ اور جنگلی گرفت اُس کی یادداشت میں تازہ تھی۔ اُسے کیا پڑی ہے ایک



فضول اور کرپٹ شخص کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کی۔ تاجا جان اُس کے بھلے کی ہی بات کر رہے تھے۔ بڑے تھے بہتر جانتے تھے سب کچھ۔

اس کے ساتھ ساتھ ذہن کے کسی چور گوشے میں کہیں کچھ غلط تو نہیں ہو رہا یہ سوال بھی کھلبلی مچا رہا تھا۔

☆☆☆

شوخی رنگ کی میرون شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس ماثرہ نہا کے ابھی ابھی ہاتھ روم سے باہر نکلی تھی۔ کیلے بال سنوارنے کے بعد اُس نے کپڑوں کا ہرنگ دد پٹہ اٹھا کے شانوں پہ ڈالا اور خود کو آئینے میں غور سے دیکھا۔ آج کتنے عرصے بعد خود کو یوں دیکھا تھا۔

ورنہ بھدے، بے ڈول سراپے سو جھے ہاتھ پاؤں، زرد رخساروں سمیت خود کو دیکھنے سے اُسے ڈر لگتا رہا تھا۔ اب نہ تو اُس کا سراپا بے ڈول اور بھدا تھا نہ ہاتھ پاؤں سو جھے تھے اور نہ رخسار زرد تھے۔ اُس کا جسم پرانی سلم اور نرم حالت میں واپس آچکا تھا۔ نازک کمر، پیٹ پہلے کی طرح اندر اور اضافی چربی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اُس نے گھوم گھوم کے ہر زاویے سے خود کو دیکھا۔ کہیں سے بھی تو کوئی کمی نہیں لگ رہی تھی اور نہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے دو ماہ پہلے کسی بچے کو جنم دیا ہے۔ دیئے ہی تانا ہوا کمان جسم اور وہی خد خد تھے۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اور ایک مغرور مسکراہٹ اُس کے لبوں پہ ابھری۔

باسط ڈرائنگ روم میں آیا بیٹھا تھا۔ ماثرہ کو اطلاع مل چکی تھی۔ پرا بھی تک وہ خالہ اور باسط سے جا کے ملی نہیں تھی۔ وہ پوری تیاری کے ساتھ اُن کے سامنے جانا چاہتی تھی۔ باسط کی بے تاب نگاہیں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں۔

وہ پُر غرور چال چلتی خالہ بیٹا کے سامنے جاڑکی اور سلام کیا۔ اُنہوں نے کھڑے ہو کے اُس کا ماتھا چوما اور کتنی دیر سینے سے لگائے رکھا۔ ماثرہ کو دیکھ دیکھ کے بیٹا کا کلیجہ جیسے خون ہو رہا تھا۔ اتنی کم عمری میں ماثرہ کو یہ داغ لگ گیا تھا اور ایک بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ اُس کا دکھ بیٹا دل میں محسوس کرتی تھی۔ میرون کپڑوں میں ملبوس نکلے بالوں اور وہلے دھلائے چہرے کے ساتھ بھلا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ جب شاہ زیب پیدا ہوا تو ماثرہ چند ماہ کی تھی۔

وہ اور شاہ زیب تقریباً ہم عمر تھے چند ماہ کا فرق تھا ماثرہ شاہ زیب سے تین ماہ ہی چھوٹی تھی صرف۔ وہ بھی اتنی کم عمری میں یہ دنیا چھوڑ گیا اور ماثرہ بھی یہ صدمہ برداشت کر گئی۔ اب آئندہ کے لیے اسے کوئی دکھ نہ دکھانا میرے رب ”بیٹا نے اُس کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ ماثرہ بیٹا خالہ سے ملنے کے بعد باسط کی طرف متوجہ ہوئی جو اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں میں شوق، وارفتگی، لگن اور ایک انجانا سا پیغام کتنا واضح تھا۔

اس خاموش پیغام کو ماثرہ نے بہت جلد پڑھ لیا تھا۔ ”کیسے ہو باسط آپ۔ کب آئے ہو“۔ اُس کا انداز مخاطب بدل چکا تھا۔ باسط کو حیرت کا جھکا لگا۔ ماثرہ نے اُسے آپ کہہ کے مخاطب کیا۔ اُس کی سامنتوں کو دھوکا تو نہیں ہوا تھا۔ ”میل تو بالکل ٹھیک ہوں اور مجھے آئے ہوئے کافی سال ہو چکے ہیں“۔ وہ بہت شگفتہ لہجے میں بولا تو شرین کے ساتھ ساتھ بیٹا بھی ہنس پڑی۔ باسط تو ذرا بھی نہیں بدلا۔ جس مزاج ویسی ہی ہے۔ ”شرین شہد آگئیں لہجے میں بولی۔ اتنے میں ماثرہ باسط کے ساتھ قدرے فاصلے پہ بیٹھ گئی۔ وہ اُس کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ کھوج رہا تھا۔

شرین بیٹا کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ”ارے ماثرہ کا بیٹا کہاں ہے ابھی تک دیکھا نہیں ہے“۔

129  
بیٹا کو خود ہی خیال آیا کہ اُنہیں آئے کافی دیر ہو گئی ہے مگر ابھی تک اُنہوں نے طیب کو نہیں دیکھا ہے۔ ”وہ سو رہا ہوگا میں ذہین سے کہتی ہوں لے آئے“۔ شرین آواز دینے لگی تھی کہ بیٹا نے روک دیا۔ ”رہنے دیں آپا جب جاگے گا میں دیکھ لوں گی“۔ ”چلو ٹھیک ہے“۔ شرین نے شکر ادا کیا۔

ماثرہ کے بیٹے کے ذکر پہ باسط کا چہرہ عجیب سا ہو گیا جیسے اُسے اچھا نہ لگا ہو۔ ”آپا دیکھتا کیسی ہے“۔ بیٹا نے جان بوجھ کے عمر کا نام لینے سے گریز کیا۔ ”وہ بھی ٹھیک ہے کالج گئی ہوئی ہے۔ میں آج کل بہت پریشان ہوں“۔ شرین نے اپنے تاثرات میں تاسف پیدا کر ہی لیا تھا۔ ”کیوں اُس کے کالج جانے سے آپ کیوں پریشان ہیں آپا“۔ بیٹا کو دیکھتا کے کالج جانے اور شرین کی پریشانی کی وجہ میں کوئی تال میل محسوس نہیں ہوا تھا۔ ”ارے یہ کب کہا کہ میں اُس کے کالج جانے سے پریشان ہوں۔ بات اصل میں کچھ اور ہے۔“ شرین نے لہجے میں از حد پراسرار میت بھری۔ ”کیا بات ہے آپا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں“۔ ”نہلے سے دیکھتا اپنے شوہر سے خلع مانگ رہی ہے“۔

شرین اپنی بات کہنے کے بعد اب بیٹا کے چہرے پہ اس کا رد عمل تلاش کر رہی تھی۔ ”نہیں آپا ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ دیکھتا ایسی لگتی تو نہیں اور رخصتی سے پہلے ایسا کیا ہوا ہے جو وہ خلع مانگ رہی ہے“۔ بیٹا کی نگاہوں میں دیر لگتا کا حیران اور معصوم سا چہرہ گھوم گیا۔ جس پہ وقت نے ابھی کوئی پختگی تحریر نہیں کی تھی۔ وہ دیکھتا جس کی آنکھوں میں اب اداسی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ وہ کیسے اتنی بڑی بات کر سکتی ہے۔

”بس تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے“۔ شرین کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اُس نے یہ جملہ بہت آہستہ آواز میں کہا۔ ”عمر نے کسی کو ٹھکرایا تھا اور آج کوئی اُس کی بیٹی کو ٹھکرا رہا ہے۔ عمر نے خود دیکھتا کے رشتے کے لیے اپنے دوست سے کہا تھا۔ اور بیٹی اب خود ہی اپنے منہ سے خلع مانگ رہی ہے۔“ شرین نے اپنے تئیں جیسے کوئی عظیم انکشاف کیا تھا۔ بیٹا کو آپا کی یہ باتیں بڑی لگی۔ اتنے برس گزر گئے وہ ابھی تک پرانی کڑواہٹوں کو دل میں رکھے ہوئے تھی۔ شکر تھا کہ باسط نے اُن کے ہاتھ نہیں سنے۔ جو آپا نے اُس کے اور عمر زیب کے حوالے سے کہے تھے۔ وہ ماثرہ کے ساتھ باتوں میں لگا تھا جانے اُس پہ کیا اثر ہوتا۔ اُنہوں نے اپنے ماضی کے بد صورت باب کو اپنی اولاد سے پوشیدہ ہی رکھا تھا۔

بیٹا نے کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ جانے کیا بات تھی جو بات خلع تک آ پہنچی تھی۔ ”ویسے آپا آپ کو سمجھانا چاہیے تھا اُسے کہ یہ حماقت نہ کرے“۔ ”خود مختار ہے دولت و جائیداد کا غرور ہے، فرح نے اپنے قاسم کے لیے امید لگائی ہوئی ہے کہ خلع ہو جائے تو وہ فائدہ اٹھائے۔ ویسے ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔ ارے وہ دیر لگتا کا شوہر کوئی اچھا نوجوان نہیں ہے۔ پولیس آفیسر ہے اور تمہیں تو پتہ ہے کہ پولیس والے کیسے ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے خاندان کا بھی نہیں ہے۔ اچھا ہے دیر لگتا کو خلع مل جاتی ہے تو.....“

بیٹا کو آپا شرین کے پل پل بدلتی باتوں پہ حیرت ہو رہی تھی۔ کہاں تو پہلے وہ خوش ہو رہی تھی اور اب دیر لگتا کو حق بجانب تصور کر رہی تھی۔ اُس نے شکر کیا کہ گفتگو کا موضوع تبدیل ہوا۔

عمر زیب بھی اسی حوصلے میں تھا پر بیٹا کو جرات نہیں ہوئی کہ اُسے ایک نظر دیکھ سکے۔ سب کہتے تھے وہ پاگل ہو گیا ہے دیوانہ ہو گیا ہے۔ شاہ زیب کی موت نے اُسے ہوش سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اُسے دکھ ہوتا تھا۔ اُس میں اتنا حوصلہ



نہیں تھا عمر کو اس طرح اس حال میں دیکھنے کا۔ دل مسوس کر کے رہ گی۔

☆☆☆

باسط اور مائرہ باہر آگئے تھے۔

باسط پرانی باؤلی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مائرہ کا کندھا اس کے کندھے سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں اردگرد سے خبر تھے۔ ”پھر کیا سوچا ہے آئندہ کا“۔ بہت دیر کی چھائی خاموشی کو باسط نے ہی توڑا۔ ”میں کیوں سوچوں آئندہ کا۔ جس کام ہے وہ سوچے“۔ مائرہ شانے پہ آنچل درست کرتی اُس سے دور ہو کے بیٹھ گئی۔ ڈبے سے سورج کی الوداعی کرنیں اُس کے بالوں اور ماتھے کو بوسہ دے رہی تھی۔ باسط یک ٹک دیکھے گیا۔ کیا تھا اس چہرے میں کیسا سحر تھا اس وجود میں۔ جس نے کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیا تھا۔ نہ اتنی فرصت دی تھی کہ کسی اور کو سوچے۔ وہ پرانی ہو کے بھی پرانی نہیں تھی۔ باسط نے بارہا خوابوں، خیالوں میں اُسے اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ اُس کی لگن اُس کی چاہت کی شدت میں کچھ ایسا جنون کچھ ایسا خلوص تو تھا جو قدرت نے پھر سے باسط کے ساتھ مائرہ کے ملاپ کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ اپنے جذبے پہ نازاں تھا۔

اپنی محبت پہ غرور تھا اُسے۔

وہ اُسے پھر سے حاصل کرنے جا رہا تھا۔

اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جو اُسے مائرہ کے ساتھ ایک ہونے سے روک سکتی وہ اس پوزیشن میں تھا کہ سب رکاوٹوں کو عبور کر سکے۔ اب شریں خالہ کی بھی تو یہی آرزو تھی کہ مائرہ بیٹا کی بہو بن جائے۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ جب کب اپنے منہ سے اس کا اظہار کرتی ہے۔ باسط کما ر ہا تھا اور اچھا خاصا کما ر ہا تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی کماؤ پوت بن گیا تھا۔ اتنی سی عمر میں اُس نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا۔ دوسرے لڑکے اُسے حسد کرنے لگے تھے۔

خاندان کی عورتوں کے لیے وہ رول ماڈل تھا۔

”میں سوچ تو رہا ہوں“۔ ”کیا“ مائرہ بے تابی سے بولی۔ ”وہی جو مجھے کرنا چاہیے۔ میں اس بار اسی لیے آیا ہوں“۔ باسط نے واضح اشارہ دے دیا۔ مائرہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”اب میرے پاس سب کچھ ہے میں تمہیں حاصل کر سکتا ہوں“۔ اپنی خوشی میں مائرہ کو باسط کی حقارت بھری نظر کا احساس ہی نہیں ہوا۔

”اب تو شریں خالہ انکار بھی نہیں کریں گی بلکہ شکر کریں گی۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں“۔ باسط اُن کی طرف جھکا۔ مائرہ انکار ہی نہ کر سکی۔ بے بسی سے زمین کو بکنے لگی۔

آج باسط نے اپنی فتح کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا تھا۔

مائرہ اب ناقابل حصول نہیں رہی تھی۔

ایک بچے کی ماں، جوان بیوہ، داغ لگا چاند۔

باسط کا جی چار ہا تھا۔ زور زور سے قہقہے لگائے۔ اُس کا پورا چہرہ ہلکی سی مسکراہٹ سے منور تھا۔

☆☆☆

طیب بہت بے چین تھا۔

زمین سے چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ کندھے سے لگائے ٹہل ٹہل کے تھک گئی تھی۔ دریکتا اس کے

بارہی تھی۔ رات کو اُسے پڑھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ طیب کے رونے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ اُس نے چین بند کر کے رکھ دیا۔ اُسے طیب کے رونے سے عجیب سی بے قراری ہو رہی تھی۔

اُس نے زمین کے ہاتھوں سے طیب کو لے لیا تو اُس نے سکون کا سانس لیا۔ وہ شل سی ہو رہی تھی۔ ”زمین طیب کیوں رویا ہے اتنا زیادہ؟“ ”چھوٹی بی بی اس کو بخار ہے ساتھ موشن لگے ہیں“۔ تو کوئی اسے ڈاکٹر کے پاس لے کے نہیں گیا۔ ”دریکتا طیب کو تھپک رہی تھی۔

”میں نے شریں بی بی سے کہا کہ طیب کو بخار ہے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں کوئی ڈاکٹر ہوں جو مجھے بارہی ہوں۔ کوئی دوا دے دو۔ تو فریج میں جو سیرپ پڑا تھا وہ میں نے دے دیا“۔ زمین نے سادگی سے بتایا تو دریکتا سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئی۔

”تو تم مائرہ بھابھی کو جا کے بتاتی ناں۔ خود سے اسے سیرپ دینے کی کیا ضرورت تھی؟“ ”دریکتا اُس پہ غصے ہو گئی تو زمین نے نہ سمجھ آنے والی نگاہوں سے اُسے دیکھا کہیں وہ انجان بننے کا مظاہرہ تو نہیں کر رہی تھی۔

کیا اُسے اپنے گرد و نواح میں ہونے والی تبدیلیوں کی خبر نہیں ہے۔ ”مجھے شریں بی بی نے منع کیا ہوا ہے کہ طیب کے معاملے میں مائرہ بی بی سے کوئی بات نہ کی جائے۔ جب سے اُن کی بہن اور اُن کا بیٹا آیا ہے انہوں سے سختی سے کہا ہے کہ طیب کو مائرہ بی بی کی طرف نہ لایا جائے۔ اب اس میں میری کیا غلطی ہے“۔ وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی۔ اس میں کیا دوش تھا ایک نوکرانی کا۔ وہ ایک معمولی سی تنخواہ پانے والی عورت تھی۔ مالکوں کو کیا کہہ سکتی تھی۔ اور مالک بھی بے حس انسانیت سے عاری۔ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی تھی۔ مائرہ نے طیب کو کبھی خود فیذ نہیں کروایا تھا۔ رات کو وہ زمین کے پاس ہوتا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے بیٹے کو پیدا کر کے بھول گئی ہے۔ ایسی بے حس ماں۔ اُس نے نہیں دیکھی تھی۔

”اچھا تائی شریں نے ایسا کہا ہے“۔ دریکتا نے خود کھای کی۔ ”جی ہاں“ زمین نے اُس کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ بھی سن لی تھی۔ ”طیب ساری ساری رات روتا ہے چپ ہونے میں ہی نہیں آتا“۔ زمین بے چارگی سے بولی۔ ”میں اسے خود سلاؤں گی۔ تم آرام کرو“۔ دریکتا طیب کو کندھے سے لگائے لگائے اسی طرح اپنے کمرے میں آگئی۔ زمین اُس کے پیچھے پیچھے طیب کا بستر بھی لے آئی۔ دریکتا نے طیب کی دیگر چیزیں بھی لانے کو کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ کیونکہ طیب بہت بڑا بچہ تھا۔ اپنی پیدائش کے وقت وہ موٹا تازہ اور سرخ سفید تھا۔

صرف دو ماہ میں ہی مرجھائے ہوئے پھول جیسا زرد ہو گیا تھا۔ اوپر کا دودھ پینے سے اُس کا پیٹ خراب ہی رہتا۔ رات کو بستر گیل کرنا تو زمین نیند کے نشے میں مدہوش ہوتی۔ کبھی ہمپر تبدیل کرتی کبھی سو جاتی۔ وہ روتا رہتا اور خود ہی تھک ہار کے نڈھال ہونے لگتا تو سو جاتا۔

زمین سب کچھ لے آئی۔ اس کی حرکات میں پھرتی تھی۔ ”اب یہ رات کو میرے پاس ہی رہے گا۔ ہاں دن کو تمہارے پاس ہوگا۔ اس کا اچھے طریقے سے خیال رکھنا۔ میں کل اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی میرے ساتھ چلنا“۔ ”ٹھیک ہے میں ضرور جاؤں گی“۔ زمین نے سر ہلایا۔

☆☆☆

طیب اُس کی گود میں آتے ہی پُرسکون ہو گیا۔ دریکتا اُسے دیکھتے دیکھتے رو پڑی۔ اُس کے ایک ایک نقش میں شاہ زیب کی شبابہت تھی۔ دریکتا کے بے آواز آنسو طیب کے معصوم چہرے پہ گرے تو وہ کسمانے لگا۔ دریکتا نے انگلی کی

پوروں سے اُس کے چہرے سے آنسو صاف کیے تو وہ اپنی حیران آنکھیں کھولے اُسے تھکنے لگا۔ دریکتا نے اپنے ہونٹ اُس کے ماتھے پر رکھ دیئے۔ طیب اب ذرا بھی نہیں رو رہا تھا۔ کچھ منٹ بعد وہ بے خبر سو گیا تو دریکتا آہستگی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آگئی۔

اُس کا رُخ برآمدے سے آگے باغ کی طرف تھا۔

اس وقت ذل بے حد گھٹن کا شکار تھا۔ وہ کھلی نضا میں سانس لینا چاہتی تھی۔

صبح سے آگے برآمدے کے اختتام پہ دیوار تھی جس کے پتھروں بیچ چھوٹا سا ککڑی کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس دروازے کی دوسری جانب باغ تھا۔ کبھی کبھی وہ اُدھر گھومنے چلی جاتی تھی۔ وہاں اُسے سکون ملتا تھا۔ مگر رات کے اس وقت وہ سکون سے وہاں بیٹھ کے کچھ سوچنا چاہتی تھی۔

دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا۔ اُس نے زیادہ غور نہیں کیا اور دیر دیر سے قدم اٹھاتی آگے بڑھتی گئی۔ پتھر کا صلیب پر سنگ مرمر کی بیچ بنی ہوئی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گئی اور سر پیچھے کی طرف جھکا دیا۔

کچھ دیر میں ہی اُسے احساس ہوا کہ اُس کے ارد گرد کوئی اور بھی موجود ہے۔ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ریزہ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ہلکی ہلکی آوازیں اُس کی سماعتوں سے ٹکرائیں ساتھ ہی قدموں کی آواز اُبھری۔ قدموں کی چاپ اسی طرف قریب آتی لگ رہی تھی۔ اُس کے جسم کے جساموں نے ٹھنڈا پسینہ اُٹھانا شروع کر دیا۔

درختوں کے سائے سے دو ہیو لے اُبھرے۔ قریب آنے پہ اُس نے پہچان لیا کہ یہ ماثرہ اور اُس کا کزن ہانیٹا ہے۔ کل شام ہی تو وہ لوگ آئے تھے۔ اور دریکتا اُن سے ملتی تھی۔ شریں نے کچھ دن کے لیے یہیں زکنے پہ اصرار کیا تھا۔ سو وہ لوگ ادھر ہی تھے۔

ماثرہ کا نفرتی قبیلہ دریکتا کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ فوراً پیچھے ہو گئی۔ اُن دونوں کی نظر اُس پہ نہیں پڑی تھی۔ باتیں کرتے چلتے ہوئے دوسری سمت کی طرف مڑ گئے۔ دریکتا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ماثرہ کا کندھا چلتے ہوئے باسط سے ٹکرا رہا تھا۔ دونوں پاس پاس ہو کے ہی تو چل رہے تھے۔ دریکتا کی آنکھوں میں کچھ چھینے لگا۔ دل پہلے بھی گھٹن کا شکار تھا۔ اب اور بھی بوجھل ہو رہا تھا۔ دُکھ، افسوس، حیرانی، بے چارگی، بے بسی، یا کچھ اور۔ وہ اس وقت اپنے احساسات کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھی۔

ہاں آنکھوں میں جیسے ریت چبھ رہی تھی۔

ماثرہ اور باسط دوسری طرف مڑ گئے۔ اُن کی پشت دریکتا کی طرف تھی۔ باسط کا ہاتھ ماثرہ کی کمر پہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اُس نے بے دھیانی میں یہ فعل سرانجام دیا ہے اور ماثرہ بھی بے خبر ہے۔

دریکتا کے دماغ میں جیسے ایک خیال خود بہ خود ہی پختہ ہو گیا کہ طیب نے باپ کے بعد ماں کو بھی کھو دیا ہے۔ خیال کتنا سفاک اور بے رحم تھا کوئی دریکتا سے پوچھتا۔ اُس کی ناگوں نے تو اُس کا بوجھ ہی سہارنے سے انکار کر دیا۔ کتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہی۔

کبھی طیب جاگ نہ گیا ہو۔ اس خیال نے اُس نے حوصلوں کی گرتی دیوار کو مضبوط کیا اور وہ اٹھنے کے قابل ہوئی۔

طیب اُسی طرح بے خبری کی فینڈ سو یا ہوا اپنے ساتھ ہونے والے لطم اور نا انصافی سے لاعلم تھا۔ کبھی کبھی یہ لاعلمی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔

☆☆☆

طاہر لغاری فون کان سے لگائے دوسری طرف سے آتی آواز کو خاموشی سے سن رہے تھے۔

”طاہر بھائی میں اور آپ سے کیا کہوں۔ عمر میرا چھوٹا بھائی ہے اُس کے ناطے سے آپ میرے بھی چھوٹے بھائی ہو۔ اشعر میاں کو سمجھائیں کہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ میں نے دریکتا کو بہت سمجھایا ہے۔ میں اُسے مار تو نہیں سکتا۔ اُس کے ساتھ زبردستی کر سکتا ہوں۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ دونوں خاندانوں کی عزت عدالت میں اُچھلے۔ اشعر خود ہی خلع دے دے۔ آپ بات کریں بیٹا ہے آپ کا۔“ اور نگزیب کی ایک ہی رٹ تھی۔

”میں خود دریکتا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس سے ایک بار سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم سے بدظن کیوں ہو گئی ہے۔“ طاہر بھائی وہ نہیں ملنا چاہتی بات تک نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔ اشعر جذباتی ہے جو ان خون ہے۔“

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اتنے چاڑ اور ارا مانوں سے عمر نے یہ رشتہ نکاح کیا اور اب ہم اسے ختم کر دیں۔ آپ کس طرح کی بات کر رہے ہیں۔ یہ کوئی گڈی گڈی کا کھیل تو نہیں ہے۔“

میں اشعر سے کس طرح کہوں کہ وہ خلع دے دے۔ عمر اپنے حواسوں میں ہوتا تو اور بات تھی۔ دریکتا بے وقوف ہے اور آپ بھی اُس کی بے وقوفی میں اُس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ طاہر قدرے غصے میں آگئے تو دوسری طرف موجود اور نگزیب کے لیے بھی مزید اداکاری جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔“

”ٹھیک ہے پھر اب عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔ آپ گھر کی بات گھر میں نہیں رکھنا چاہتے تو مرضی آپ کی۔“ انہوں نے کھٹاک سے فون ہی بند کر دیا۔ شکر کا مقام تھا کہ اشعر نہیں تھا اور اُس نے کوئی بات نہیں سنی تھی۔ ورنہ اُسے سنبھالنا ایسا ہی تھا۔ جیسے کسی بچہ ہوئے شیر کو واپس پنجرے میں داخل ہونے پہ مجبور کرنا۔

اُن کا ذہن مختلف سمتوں میں سوچ رہا تھا اور ہر سوچ ایک ہی بات پہ ختم ہو رہی تھی کہ خلع کا فیصلہ دریکتا کا اپنا نہیں ہے۔ اُسے مجبور کیا گیا ہے۔ یا تو دھمکی دی گئی ہے یا کوئی اور بات ہوئی ہے جو وہ انتہائی قدم اٹھانے پہ مجبور ہوئی۔ طاہر لغاری اب ہر صورت اُسے ملنا چاہ رہے تھے۔ وہ نہ صرف اُن کے عزیز دوست کی بیٹی بلکہ اُن کے بیٹے کی منکوحہ بھی تھی۔ کوئی اُنہیں ملنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ بس یہ بات اشعر کو معلوم نہیں ہونی چاہیے تھی کہ وہ دریکتا سے ملنے گئے ہیں۔

وہ گاؤں حویلی میں تھی اور گاؤں اتنا دور نہیں تھا۔ اشعر سے کوئی مناسب سا بہانہ کیا جاسکتا تھا۔

حالات خطرناک رُخ اختیار کر رہے تھے۔ ”اللہ عمر اور اُس کے خاندان پہ رحم کرنا۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے دعا کی۔

☆☆☆

طاہر لغاری جلدی جلدی ناشتہ کر رہے تھے۔ اُن کے برعکس اشعر آرام آرام سے کھا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے جاگنگ کر کے آیا تھا نہا کے فریش ہونے کے بعد ناشتے کی ٹیبل پہ آیا تو پتا اُس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اُس کے آتے ہی

انہوں نے چائے کے لیے لیے گھونٹ بھرے۔ اور سلاخیں کے دو تین نوالے لیے۔

"پہا آج بہت جلدی میں ہیں کہیں جانا ہے۔" اشعر ہاتھ روک کے انہیں تھکنے لگ گیا۔ "ہاں میں نے سیالکوٹ جانا ہے۔ اپنے ایک دوست سے ملنا ہے۔ فاروقی صاحب سے۔ ایک کام ہے۔ ڈرائیور کے ساتھ جاؤں گا۔ اور رات تک آ جاؤں گا۔ بلکہ پہلے لوٹ آؤں گا۔ کون سا میں نے وہاں پہ قیام کرنا ہے۔ وہ نظریں چیراے جرات سے رہے تھے۔"

"اد کے پہا میں بھی لکھتا ہوں۔ آفس کے لیے۔ فاروقی انکل کو میرا بھی سلام کہیے گا۔" "ہاں بیٹا ضرور کہوں گا۔" "اد کے پہا اللہ حافظ۔" اس نے ٹیبل سے موبائل فون اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ "خیریت سے جاؤ اور خیریت سے آؤ۔" لہجے چوڑے خو برو سے بیٹے کو انہوں نے دل سے دعا دی۔

ڈرائیور طاہر لغاری کے انتظار میں تھا۔ اشعر کے نکتے ہی طاہر نے بھی اسے گاڑی اشارت کرنے کا اشارہ کیا۔



شریں کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ طاہر لغاری گاؤں ان کے گھر بھی آسکتے ہیں۔ نہ اورنگزیب نے اس حوالے سے اسے گائیڈ کیا تھا۔ انہیں سچے ہوئے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑ کر وہ خود دریکٹا کے پاس آگئی۔ اسے بتانا اور پڑھانا ضروری تھا۔ ورنہ ساری محنت پہ پانی پھر جانا تھا۔ "اٹھو دریکٹا میرے ساتھ ڈرائنگ روم تک چلو۔ طاہر لغاری آیا ہوا ہے۔ وہ تو لڑنے کے موڈ میں ہے۔ تم نے بس یہ کہنا ہے کہ تمہیں خلع چاہیے۔ اگر اس موقعے پہ تم نرم ہو گئی تو ساری زندگی روتی رہو گی اور یہ لوگ تمہیں طعنے دے دے کے مار ڈالیں گے۔ پہلے خود اس کے بیٹے نے فارنگ کردانی تمہارے گھر۔ پھر اورنگزیب سے بدتمیزی کی اور اب لڑنے کے لیے گھر چلے آئے ہیں۔ آؤ اپنا دل مضبوط کرو اور اس میں نے جو کہا ہے وہ سب طاہر لغاری سے کہہ دو۔ تاکہ اسے یقین آجائے کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کر رہا۔ ورنہ یہ لوگ ہماری جان کو آجائیں گے۔"

شریں کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ اس قدر اور اتنی جلدی حواس باختہ ہونے والی ہوتی تھی۔

"ٹھیک ہے تابی۔ آئیے میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" اپنی توہین کا احساس رگ رگ میں جاگ پڑا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی تھی۔ طاہر لغاری اسے دیکھ کے فرط محبت سے اس کی طرف بڑھے۔ پر وہ بچتی، ان سے گریزاں انہیں نظر انداز کرتی۔ جا کے دور بیٹھ گی۔

طاہر لغاری کے اٹھے ہوئے ہاتھ ان کے پہلو میں گر گئے۔ "کیسی ہو بیٹا" ان کے دل کا دکھ ان کے لہجے سے جھانک رہا تھا۔ دریکٹا کے دل کو جیسے کسی نے منھی میں مسلا۔ اسے لگا کہ جیسے وہ ٹھیک نہیں کر رہی ہے۔ "ہاں بھائی صاحب دریکٹا آگئی ہے۔ جو کہنا ہے کہیں جلدی"۔ شریں کا انداز اہانت آمیز تھا۔ طاہر کو بڑی مشکل سے ہضم ہوا نظر انداز کر کے دریکٹا کی طرف متوجہ ہوئے جو سر جھکائے ہاتھ گود میں دھرے بیٹھی یہاں ہوتے ہوئے بھی اس ماحول اور اس منظر کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔ "بیٹا تمہیں مجھ سے یا اشعر سے کوئی شکایت ہے تو بتاؤ۔ میں تمہارے خلع کے مطالبے سے بہت آپ سیٹ ہوں اور اشعر بھی غصے میں ہے۔ میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں کہ شکوے شکایت تمہارے دل میں ہیں انہیں سنوں اور پھر دور کروں۔" وہ کتنی محبت سے بول رہے تھے۔ نہیں نہیں طاہر انکل ایسے نہیں ہو سکتے جس طرح اس نے کہا۔

اس نے بے بسی سے سر دائیں بائیں جھٹکا۔ شریں کی وارننگ دیتی نگاہ اس سے ٹکرائی تو جیسے ہوش آ گیا۔ ساری باتیں فنا ہو گئیں یاد رہا بھی تو اتنا کہ طاہر انکل اور اشعر لغاری نے اس کے گھر پہ فارنگ کردانی۔ اورنگزیب تاپا کی بے بسی کی۔ اور اشعر کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ اس کی نسوانیت اور عزت نفس کے نازک شیشے کو کرچی کرچی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کوئی شک ہی نہیں تھا۔ دو بار کا تقصوم دریکٹا کو ابھی تک یاد تھا۔

ہاسپٹل میں تو اس نے صاف دھمکی دی تھی۔ اس نے اسے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کا رویہ ہی منہ پر ثابت تھا۔

"جی انکل مجھے خلع چاہیے۔ میں اس رشتے کو مزید آگے بڑھانا نہیں چاہتی۔ میری طرف سے ات آج ختم نہیں۔ میرے ساتھ کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ یہ سراسر میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے لہذا اس نے بہت عصاب اور مضبوطی سے کہا۔ ایک ایک لفظ کا مفہوم واضح تھا۔ کوئی ابہرا نہیں تھا۔

اتنا کہہ کے دریکٹا باہر آگئی۔ اسے لگا کہ اگر کچھ ذرا اور وہاں بیٹھی تو ظاہر انکل کے دھماکے ہوتے چہرے کو دیکھیں پائے گی جہاں حیرت، بے یقینی مثبت ہو کے رہ گئی تھی۔

"بھائی صاحب آپ نے سن لیا ہے ہاں دریکٹا کی زبانی سب کچھ۔ وہ یہاں بہت خوش ہے۔ ہم سب اس کے اپنے ہیں۔ اس کے دکھ درد کے ساتھ ہی۔ یہاں آ کے وہ اپنے نم بھول گئی ہے۔ اسے عمر بھائی کا فیصلہ اپنے لیے مناسب لگا تو اس نے لب کھولے کہ مجھے خلع چاہیے۔ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے لیے جو بھی پسند کرے۔ کوئی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔ ہمارا مذہب اسلام بھی لڑکی کو اپنی پسند ناپسند بتانے کا بزوں تک اپنی بات پہنچانے کا پورا پورا حق ہے۔ یہ کوئی پرانا زمانہ نہیں ہے۔ جب لڑکیوں کے ساتھ زبردستی کی جاتی تھی۔ عمر بھائی نے اسے بغیر پوچھے آپ کے لیے اسے اس کا نکاح کر دیا۔ اب وہ اس بات کا اختیار کھتی ہے کہ چاہے تو اس نکاح کو برقرار رکھنے چاہے تو ختم کر دے۔ یہ پڑھی لکھی ہے سمجھدار ہے۔ اس کے انکار کی ایک وجہ اس کی اپنی پسند بھی ہے۔ شریں کچھ دیر سانس لینے کے بعد کہی تو طاہر لغاری بے تاب ہو گئے کہ جانے ان خاتون کے منہ سے کون سا انکشاف سامنے آئے۔

"وہ میرے بیٹے عاشر کو پسند کرتی ہے اور عاشر بھی"۔ ظاہر کے حواس تھرا گئے۔ اس طرف تو ان کا خیال کبھی نہیں تھا کہ دریکٹا کسی کو پسند بھی کر سکتی ہے۔ طاہر لغاری نے عمر زیب کے آفس میں ایک بار عاشر کو دیکھا تھا۔ اسے نڈ کا مونا سا لڑکا جو شکل سے ہی جھگڑالو اور تیز نظر آتا تھا۔ اس میں کوئی ایسی خاص کشش نہیں تھی جو دریکٹا اسے لگتی۔ پر انہیں یقین دلایا جا رہا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ ان کی طبیعت مگدسی ہو گئی۔ جلد از جلد وہ یہاں سے نکلنا چاہتے تھے۔ مگر جانے سے پہلے وہ ایک نظر عمر کو دیکھنا چاہتے تھے۔ پر سامنے جو خاتون بیٹھی تھی وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر سکتی۔ سو خاموشی سے حویلی کا آہنی گیٹ عبور کر کے باہر آ گئے۔

ڈرائیور خلاف توقع انہیں اتنا جلدی آتا دیکھ کر الرٹ ہو کے بیٹھ گیا اور گاڑی اشارت کر دی۔ طاہر خاموشی سے بیٹھی سیٹ پہ نیم دراز ہو گئے۔ جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آئے ہوں۔

دایبسی کا سفر بڑی تکلیف دہ تھا۔ آتے ہوئے امید کے ہزاروں ننھے ننھے جگنو ان کی منھی میں تھے۔ جو راستے کا کبھی رہ گئے تھے۔

اشعر کو کیسے بتائیں گے کیا دلائل دیں گے کس طرح وہ ان کی بات مانے گا۔ اب یہی پریشانی ان کے دماغ

حمزہ احمد اور بیٹا حیرت سے باسط کی طرف دیکھ رہے تھے جس نے ابھی ابھی کچھ عجیب سی خواہش کا اظہار کیا اور وہ چڑچڑا ہوا ہوا تھا۔ صبح سے اٹھیاں کر کے بے حال ہو رہا تھا۔ اُس نے تائی شریں کو بتایا تو انہوں نے لا پرواہی سے ذہین کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ مائرہ اُن کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ”بھابھی آپ طیب کو پکارتے ہیں؟“

چادر اوڑھ لوں پھر جاتی ہوں ڈاکٹر کے پاس۔ دریکتا نے طیبہ کو مائرہ کی جانب بڑھایا۔ اُس نے ہاتھ آگے کر کے طیبہ کو گود میں اٹھانے کے بجائے کہا یہاں صوفے پہ لٹا دو۔ وہ اپنے ناخنوں کی تراش خراش میں لگی ہوئی تھی۔ دریکتا ناچار طیبہ کو صوفے پہ لٹا کے چادر لینے آئی۔ وہ جیسے ہی اُسے لٹا کے گئی اُس نے پیچھے سے گلا پھاڑ پھاڑ کے روننا شروع کر دیا۔

”طیب کو اٹھا دو رو رہا ہے۔“ انہوں نے شان بے نیازی سے حکم دیا۔ اتنے میں دریکتا واپس آگئی اور طیبہ کو ذہین کے پاس لے لیا۔ مائرہ اُسی بے نیازی سے ناخنوں کے ساتھ مصروف عمل تھی۔ اس اعلیٰ درجہ کی بے حسی کے مظاہر سے پہلے ہی دل ہی دل میں مل کھا کے رہ گئی۔

جیسے اپنے ناخنوں کو شپ وینے کے علاوہ کوئی ضروری کام ہے ہی نہیں۔

”دریکتا نے طیبہ کو اچھے طریقے سے سنبھال لیا ہے۔ ذہین بھی ساتھ دیتی ہے اس کا۔“ اُن دونوں کے جانے کے بعد شریں تعریفی لہجے میں بولی۔ تو مائرہ سر ہلا کے رہ گئی۔ وہ دل ہی دل میں حساب لگا رہی تھی کہ باسط بیٹا خالہ کو کبھی بھیجے گا۔ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر رانی رشتے کے لیے آئیں گی۔ اُسے گئے ہوئے پانچ دن ہو چکے تھے۔

مائرہ تمہارا دھیان کہاں ہے میں کتنی دیر سے بول رہی ہوں۔“ شریں نے اُس کی عدم توجہ محسوس کر لی۔ ”اوہ ہونگی ای، آپ نے کچھ کہا۔“ وہ ہڑبڑا کے اُن کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کن سوچوں میں گم ہو۔“ وہ ای..... مائرہ کہتے کہتے

دیر زکی۔“ باسط نے کہا تھا کہ جا کے ای کو بھیجوں گا رشتے کے لیے۔“ ہاں مجھے بھی اس نے ایسا اشارنا کہا تھا۔ اگر ای جاننا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہارے تو نصیب کھل جائیں گے۔ باسط کا بزنس بہت اچھا ہے۔ پتہ نہیں حمزہ بھائی ماں کے کہ نہیں۔“ شریں بہنوئی کی طرف سے تھوڑا مایوس ہوئی۔ پہلے انہوں نے بہت چاؤ سے رشتہ مانگا تھا۔ اُس وقت شریں نے بہانہ کیا کہ اورنگزیب اپنے بھائی کو زبان دے چکے ہیں ساتھ یہ کہ مائرہ ابھی پڑھ رہی ہے۔

جب شریں کے بہنوئی حمزہ نے کہا کہ باسط بھی تو پڑھ رہا ہے ابھی۔ ہم کون سا ابھی شادی کرنے والے ہیں۔ حمزہ بھانپ گیا تھا کہ اُس کی سالی بہانہ کر رہی ہے اب شریں کو اسی بات کا ڈر تھا۔

”ای میرے دل میں بھی یہ بات تھی کہ ہو سکتا ہے حمزہ خالو نہ مانیں۔ پر باسط نے کہا ہے کہ اُس کی بات کی جرأت گھر والوں میں نہیں ہے۔“ شریں کا مہر چھایا چہرہ کھل سا اٹھا۔ ”یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ آخر کو کما کے سب کو کھانے پر ہر سکھ دیا ہوا ہے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو۔ اور پھر تم میں کیا کمی ہے جو کسی کو اعتراض ہوگا۔ بیٹے کی ماں بنی اس پہلے شاہ زیب فوت ہوا یہ اللہ کی طرف سے تھا اور تمہاری قسمت میں تھا۔ تمہارا بیٹا دریکتا سنبھال رہی ہے۔ کون سا کچھ کے بعد اُسے ساتھ رکھو گی جو کوئی اعتراض کرے گا۔ بیٹا اور حمزہ آئے تو میں یہ بات اُن کے کانوں میں ڈال دوں گی۔“

سے اچھا اثر پڑے گا۔“

لڑکی اُسے بچے پالنے یا سنبھالنے کا وہ خاص سلیقہ نہیں تھا جو قدرت کی طرف سے ایک ماں کو ذیعت کیا جاتا ہے۔  
اپنی طرف سے وہ جو ہوتا کرتی تھی پھر بھی کوئی نہ کوئی کی رہ جاتی تھی۔ طیب کبھی پیٹ کبھی کان کے درد سے  
تو دریکتا کو سمجھ ہی نہ آتی۔ یہ سب ایک ماں ہی جان سکتی تھی اپنے بچے کی ادائیں، عادتیں، سونے جاگنے کے اوقات  
طیب کی ماں بے حس ہو چکی تھی۔

ذہین نوکرانی تھی رات میں دریکتا سنبھال لیتی۔ دن میں اُسے ہی دیکھ بھال کرنی پڑتی۔ طیب اُس کے پاس  
آتے ہی گلا پھاڑ پھاڑ کے رونے لگتا۔ وہ اٹھا اٹھا کے زچ پڑ جاتی۔ اُس کی کوٹھڑی میں انیم پڑی رہتی تھی جو اُس  
میاں استعمال کرتا۔ ذہین چپکے سے تھوڑی سی انیم طیب کو بھی چننا دیتی۔ وہ بھی سکون سے سویا رہتا اور ذہین بھی  
ہو جاتی۔

شریں یا ماہرہ میں سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کہ طیب اتنی اتنی دیر کیوں سویا رہتا ہے۔ جس دن دریکتا گھر  
اُس دن ذہین طیب کو انیم نہیں چناتی تھی۔

☆☆☆

ماہرہ شادی کی شاپنگ شروع کر چکی تھی۔ کبھی فوزیہ یا فرح چچی میں سے کوئی ساتھ جاتی اور کبھی شریں جاتی  
زیادہ تر شریں ہی ساتھ جاتی۔ ماہرہ بہت خوش تھی۔ ایک ایک چیز اپنی پسند سے دیکھ بھال کے لے رہی تھی۔ تاہم بہت  
تھا کیونکہ باسٹ کو واپس بھی جانا تھا۔ وہ لے بکھیزوں کے حق میں نہیں تھا چاہتا تھا سیدھے سیدھے نکاح کر کے ماہرہ کو  
لے آئے۔

پر بیٹا کے دل میں باسٹ کی چھوٹی دو بہنوں کے دل میں بڑے ارمان تھے۔ انہوں نے بڑے پردہ گرام بنانے  
تھے بھائی کی شادی میں یہ کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ مہندی، مایوں، ولیمہ سب دھوم دھام سے کرنا ہے۔  
کارڈ چھپنے کے لیے دیئے جا چکے تھے۔

☆☆☆

کل باسٹ کی مہندی تھی۔ دوستوں رشتہ داروں کزنز نے خود ہی سب کچھ ارنج کیا تھا۔ اُس کے ذہن پہ لکھنا  
تھی کیونکہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اُس کا ایک کارندہ ایئر پورٹ پہ بیرون لے جاتے ہوئے شک کی بنا پہ پکڑا گیا تھا بعد میں  
تلاشی لینے پہ مشکوک اشیاء برآمد کر لی گئیں۔ اب وہ لاک اپ میں تھا۔ اور پوچھ گچھ کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔  
باسٹ کو خوف تھا کہ ایسا نہ ہو وہ اُس کا نام اگل دے۔ اُس کے پارٹنر نے یقین دلا یا تھا ایسا کچھ ہوا تو وہ سب سنبھال  
گا۔ پر باسٹ پھر بھی پوری طرح ہر سکون نہیں تھا۔

وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ آنکھ ہی نہیں لگ رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ اُس کا موبائل فون پڑا تھا۔ باسٹ کے  
ذہن میں ایک خیال آیا۔ وقت گزر رہی نہیں رہا تھا اور نہ ہی نیند آرہی تھی۔ اُس نے ماہرہ کو کال کر دی۔  
وہ بھی اُس کی طرح جاگ رہی تھی۔ باسٹ بہت دن سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا پر وہاں ماہرہ کے ہاں جانا  
کے باوجود اُس سے وہ بات کہنے کا موقع نہیں ملا۔ آج اور ابھی وہ ماہرہ سے اپنی وہی بات کرنا چاہتا تھا۔

”ماہرہ میں نے تمہیں تو اپنا لیا ہے مگر میں تمہارے بچے کو ہرگز نہیں اپناؤں گا تم نے میرے ساتھ رہنا  
اپنے بچے کو وہیں چھوڑ کے آنا ہوگا۔ میں اُسے قبول نہیں کر سکتا۔ اُسے دیکھ کے مجھے بہت کچھ یاد آئے گا۔ جو تمہارا

میں اچھا نہیں ہوگا۔“ باسٹ نے صاف اور دو ٹوک بات کی۔ اُس کا خیال تھا ماہرہ یہ بات سن کے روئے گی اُس کی منت  
کرنے گی کہ نہیں نہیں مجھے میرے بچے سے الگ مت کرو۔ اُسے بہت دکھ ہوگا پر ماہرہ بولی تو اُس کا لہجہ بہت نارمل سا تھا۔  
جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ ”ٹھیک ہے باسٹ ایسا ہی ہوگا۔ طیب حویلی میں ہی رہے گا۔“

باسٹ کے ذہن سے یہ بوجھ بھی اتر گیا۔ ماہرہ نے خلاف توقع آرام سے اُس کی بات مان لی تھی۔  
یہی بات باسٹ نے جب بیٹا کو بتائی تو کتنی دیر وہ خاموشی رہی۔ اُس سے بولا ہی نہیں گیا۔ جیسے اُسے رنج ہوا  
ہو۔ ”باسٹ ایک بچے کو اُس کی ماں سے مت الگ کرو۔ اُس کا دل بچے میں ہی انکار ہے گا۔ وہ تمہیں خوش نہیں رکھ پائے  
گی۔ اُسے وہ کشتیوں کا سوار مت بناؤ۔“

”امی پلیز، یہ میری زندگی ہے۔ میں اس پہ کسی اور کے بچے کا سایہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ نہ میرا طرف  
اتنا بڑا ہے کہ میں ماہرہ کے بچے کو باپ کا پیار دے سکوں۔ نہ میں اتنا عظیم ہوں اُس نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے  
روک دیا۔“

☆☆☆

نہ نہ کرتے ہوئے بھی اور نگزیب نے اچھے خاصے مہمانوں کو مدعو کر لیا تھا۔  
ماہرہ کی رخصتی میں صرف دو دن باقی تھے۔ اور ابھی بھی اُسے بہت سی وہ چیزیں یاد آرہی تھی جن کی شاپنگ  
ضروری تھی۔ شریں نے آج نہ جانے کس طرح دریکتا کو ماہرہ کے ساتھ جانے کا بول دیا۔ ”تم بھی جاؤ ساہرہ بھی جا رہی  
ہے۔ اپنے لیے کپڑے وغیرہ لے لینا۔ جب سے تم گاؤں آئی ہو ایک بار بھی شاپنگ کے لیے نہیں کہا ہے تم نے سو  
ضروریات ہوتی ہیں۔ لڑکی ذات ہو۔ کوئی اچھا سا سوٹ لینا۔ ماہرہ کی رخصتی پہ پہننے کے لیے۔“

وہ اُس کے دل کی حالت سے بے خبر بول رہی تھی۔ دریکتا نے نفی میں سر ہلایا پر شریں نے ہاتھ اٹھا کے روک  
دیا۔ اُسے یاد آیا کہ طیب کو پرانے کپڑے کچھ تنگ تنگ اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔ کیوں نہ طیب کے لیے کچھ خریداری کی  
جائے۔ اس خیال سے وہ اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی۔ ورنہ دل اندر سے بے پناہ اُداس تھا۔ وہ ماہرہ بھابھی کی  
خوشیوں سے حسد نہیں کر رہی تھی پرانی یادیں دل کو دکھی کر رہی تھیں۔ ایک دن ماہرہ اسی طرح رخصت ہو کے شاہ زیب کے  
گھر اُن کے گھر دو پہن بن کے آئی تھی تو اُن کے گھر بھی خوشیوں، رنگوں اور چاہتوں کی بارات اُترتی تھی۔ پپانے ہانہوں  
کے گھیرے میں لے کے ماہرہ بھابھی کے سنگ دلہیز سے اندر پاؤں رکھا تھا۔ انہیں کالج کی نازک گڑیا کی طرح تھام کے  
گھر میں لائے تھے۔ اُن کا صدقہ اُتارا تھا۔ اور شاہ زیب بھائی کتنے خوش تھے اُس دن۔

اُن کا خوب دچہرا خوشیوں کی جگمگاہٹ سے جھل مل کر رہا تھا۔  
دریکتا کے پاس یادیں ہی تو تھی۔ اُس نے خال سے فرار ڈھونڈ لیا تھا۔

☆☆☆

ماہرہ نے اپنے لیے سینڈل خریدے۔ ساہرہ کو دو سوٹ پسند آئے اُس نے منہ ماگی قیمت دکاندار کو دی۔ دریکتا  
نے اندازے ناپ بتا کے طیب کے لیے کپڑے خریدے۔ کافی گھنٹے سے وہ ساہرہ اور ماہرہ کے ہاتھ گھوم رہی تھی۔ اُسے  
اپنے لیے کچھ لینے کی آرزو نہیں تھی۔ ماہرہ نے خود اُس کے لیے کچھ سوٹ پسند کیے اور پیک کر دئے۔ آخر کو وہ طیب کی  
گھر چھوٹی۔ اُس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اتنا تو اُس کا حق بنتا ہی تھا۔ دریکتا ناں ہی کرتی رہی۔ ماہرہ نے خود ہی اُس

کے لیے کافی کچھ خرید لیا۔

سارہ کو ایک ایک چیز مشکل سے پسند آ رہی تھی۔ اب اُسے میچنگ سینڈل لینی تھی۔ کتنی دکانیں گھوم چکی تھی کوئی چیز اُس کی آنکھوں میں سما ہی نہیں رہی تھی۔ اس مہنگے اور اعلیٰ شاپنگ مال میں ریستورنٹ بھی تھا۔ سارہ کو تو گھوم گھوم کے بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے سارہ اور دریکٹا کو اشارہ کیا۔ دونوں اُس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

دریکٹا کو بیٹھنے کے قدرے سکون کا احساس ہوا۔

اُس نے اپنے لیے کولڈ ڈرنک اور برگر کا پڑا دیا۔

سارہ اور سارہ نے بھی اپنی اپنی پسند کا آرڈر ویٹرو کونوٹ کروایا۔

ویٹرو کے دوبارہ آنے تک سارہ نے ریستورنٹ میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اچانک اُس کی نگاہ اپنے سامنے والی ٹیبل پہ بیٹھے اُس شخص پہ پڑی۔ جس کی پشت اُن کی طرف تھی۔ پولیس یونیفارم میں ملبوس اُس شخص پہ سارہ کو اشعر کا گمان ہوا۔ اُس نے تھوڑا آگے ہو کے دیکھا تو یہ گمان یقین میں بدل گیا۔ وہ سو فیصد اشعر لغاری ہی تھا۔ چونکہ اشعر کی پشت اُن کی طرف تھی درندہ سامنے سے فوراً پہچان لیتی اور وہ بھی اُن کو دیکھ چکا ہوتا۔

سارہ کو جانے کیوں ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔ اُس نے کرسی پیچھے کی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ سارہ نے اُس کے اچانک کھڑے ہونے پہ پوچھا۔ سارہ کی نگاہوں سے خوشی جھانک رہی تھی۔ سارہ کے سوال کا جواب دیئے بغیر وہ سیدھی اشعر کی ٹیبل کے پاس جا پہنچی۔

سارہ نے اُس کے قدموں کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو پریشان ہوگی۔ وہ بھی اشعر کو پہچان چکی تھی۔ کیونکہ اب اُس کا رخ بالکل اُن کی طرف تھا۔

”السلام علیکم آپ کیسے ہیں؟“ سارہ نے پر جوش سلام جھاڑا تو اشعر کو اُسے پہچاننے کے لیے اپنی یادداشت پہ زیادہ زور نہیں دینا پڑا۔ وہ باتونی لڑکی جس کی نگاہوں میں مرموعیت تھی اُسے یاد تھی۔

”وعلیکم السلام آپ کیسی ہیں سنائیں۔ میں تو آپ کے سامنے ہوں۔“

وہ دھیرے سے مسکرایا۔

سارہ اُس کی شخصیت کے دل فریب بیچ دخم میں کھوس گئی۔ سارہ نے اُسے ملاستی نگاہوں سے گھورا اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں اشعر اُنہیں دیکھ چکا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔

دریکٹا اُسے اسی طرف آتا دیکھ رہی تھی۔ کاش وہ کہیں چھپ سکتی۔ پتہ نہیں کیوں وہ خوفزدہ ہو رہی تھی۔ اشعر اکثر یہاں لہج کرنے آتا تھا۔ اس کا آفس یہاں سے فریب ہی تھا۔ آج بالکل غیر متوقع طور پہ اورنگزیب

انگل کی بیٹیوں سے اس ریستورنٹ میں سامنا ہو رہا تھا۔ اُن کے ساتھ وہ بھی تھی جس کا تصور کرتے ہی اشعر کا جی چاہتا کہ شوٹ کر دے۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ اُس کے سر پہ کھڑا تھا۔ اُس کی مخاطب سارہ اور نگاہیں دریکٹا پہ تھی۔ جس نے اوجھ کھایا برگرواپس پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

”سارہ کی شادی ہو رہی ہے ہم شاپنگ کرنے آئے ہیں۔“ سارہ مسلسل بول رہی تھی۔ ادھر سارہ نے اخلاق کا تقاضا نبھایا اور بادل نخواستہ اُسے ہیلو ہائے کی۔ اشعر سارہ کی خالی کی گئی کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔ اُس کی دائیں طرف دریکٹا

تھی۔ جس کا دل اس وقت پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ”آپ نے پھر کسی کو ابھی تک بھیجا تک نہیں میرے پاس ترجمان بنا کے۔ خود ڈرتی ہیں مجھ سے بات کرتے ہوئے۔“

اب یقیناً اُس کا مخاطب دریکٹا ہی تھی۔ اُس نے امداد طلب نگاہوں سے سارہ کی طرف دیکھا۔ سارہ نے نگاہ چرائی۔ وہ خود اشعر سے خائف تھی۔ باقی لوگ بھی آہستہ آہستہ اُن کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔

”مجھ سے جو بات کرنی ہے ڈائریکٹ کریں محترمہ مجھے اپنے تایا کے ذریعے عدالتوں کی دھمکیاں مت دیں۔ میں ان سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ خیر یہاں ان باتوں کا موقعہ نہیں ہے۔ میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا۔“

اشعر کی آواز دھیمی پر لہجہ بہت سخت تھا۔ دریکٹا نے سہارے کے لیے سارہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس کے چہرے پہ پھیلتی گھبراہٹ اشعر کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھی مزید تماشہ بننے کے خیال سے اشعر وہاں سے اٹھ گیا اور جاتے جاتے سارہ کو شادی کی مبارکباد دی۔

سارہ ابھی تک اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے جاتے ہی سارہ کو ڈانٹنے لگی۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی اُس کے پاس جانے کی۔ پتا بتا چکے ہیں کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم پھر سلام کرنے پہنچ گی اُس کے پاس۔“

”اتنا ڈنٹنگ ہے مجھے تو افسوس ہو رہا ہے۔“ سارہ ذرا بھی اُس کی ڈانٹ کو خاطر میں نہیں لارہی تھی۔

دریکٹا خوفزدہ تھی اور مسلسل داپسی کا کہہ رہی تھی۔ سارہ کو غصہ آ گیا۔

”تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ وہ کوئی خون آشام بلا تو نہیں ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہی تو ہے۔ تمہارا نکاح ہوا ہے اس کے ساتھ۔ کچھ دنوں تک یہ نکاح ختم ہو جائے گا۔“ پھر بھی تم ڈرو گی؟

دریکٹا بے بسی سے اُسے دیکھ کے رہ گئی۔ سارہ کو خوشی ہو رہی تھی۔ دریکٹا کے خوف اور اشعر لغاری کے انداز پہ۔ ”کیا زور دار نونو جوان ہے۔ ایک مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ سارہ نے اُس کی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ ”تم

اُس کی اتنی تعریفیں کر رہی ہو جیسے بہت متاثر ہو۔“ ہاں میں پہلی بار ہی متاثر ہو گئی تھی۔ مجھے دریکٹا پہ حیرت ہے جو اُسے خلع لے رہی ہے۔“ سارہ آہستہ آواز میں بولی پر دریکٹا تو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ سارہ نے اُس کا ہاتھ دبا دیا کہ

بس کرو۔ دریکٹا اتنی تعریفوں پہ کیا سوچے گی شریں تو عاشر کے لیے اُس کے حوالے سے خواب دیکھ رہی تھی۔ دریکٹا کو خلع مل جاتی تو اشعر کے آسیب سے جان چھوٹ جاتی۔ عاشر سے شادی کے بعد طیب کی ذمہ داری کے بوجھ سے

شریں ہلکی ہو جاتی۔ سارہ نے شادی کے بعد تو باسط کے ساتھ چلے جانا تھا۔ ساری عمر کے لیے طیب کو کون سنبھالتا۔ ننھا سا بچہ تھا۔ اُس کی عمر کے ابتدائی چار پانچ سال بہت مشکل تھے۔ دریکٹا شادی کے بعد اس گھر میں رہتی تو شریں کے لیے آسانی ہی آسانی تھی۔

☆☆☆

اشعر بہت غصے میں تھا۔ طاہر لغاری اُس کا مطالبہ سن کے چپ ہو گئے تھے۔

دریکٹا کو ریستورنٹ میں دیکھ کے اشعر کو جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ فوراً سے بھی بیشتر کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔ ”پتا مجھے دریکٹا کو اس گھر میں لانا ہے۔ میری بیوی ہے وہ۔“

اورنگزیب عدالت کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ دریکٹا نے خود کہہ دیا تھا کہ میں اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہوں اور

اشعر اُسے گھر میں لانے کی بات کر رہا تھا۔

ظاہر لغاری نے گاؤں جانے والی بات اشعر کو نہیں بتائی تھی کہ اُسے غصہ آئے گا اور بات بڑھے گی۔ لیکن اُسے چھپانے میں فائدہ نہیں تھا۔ ”گڈ پپا! آپ مجھے اب یہ بتا رہے ہیں کہ آپ گاؤں گئے تھے۔ کیا ضرورت تھی بتانے کی۔ بہر حال میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ مجھے اپنی بیوی کو اس گھر میں لانا ہے۔ پپا اب یہ میری عزت، اُنا اور غیرت کا معاملہ ہے۔ میں کسی صورت پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔“

”اشعر وہ لوگ نہیں مان رہے ہیں میں پہلے یہ سمجھتا رہا کہ دریکٹا کو ذرا پایا گیا ہے خوفزدہ کیا گیا ہے یہ سب کچھ کچھ کے لیے۔ میں اپنا شک دور کرنے گاؤں گیا۔ مجھے خود دریکٹا نے کہا کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ بلکہ اُس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میری طرف سے اس رشتے کو ابھی اور اسی وقت ختم سمجھیں۔ اب تم بتاؤ جب وہ خود راضی نہیں ہے تو ختم کیوں اپنا خون جلا رہے ہو۔“

ظاہر لغاری نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اشعر نے ہٹا دیا۔ ”پپا یہ رشتہ ختم نہیں ہو سکتا ہاں دریکٹا ختم ہو سکتی ہے۔“ اشعر کا لہجہ بلا کاسفاک اور سرد تھا۔ ظاہر لغاری دہل گئے۔

”تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آ کے اتنے سفاک ہو گے ہو۔ مجھے نہیں پتہ تھا۔“

”پپا آپ جو بھی سوچیں یہ رشتہ میری اُنا کے لیے زندگی موت کا سوال بن گیا ہے۔ میں ایک عورت کو اپنی مردانگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کسی قیمت پہ بھی نہیں۔“ اُس کے لفظ لفظ میں آہنی سختی تھی۔

☆☆☆

طیب کو دو دن سے بخار تھا۔ آج دریکٹا شاپنگ سے واپس آئی تو طیب بخار میں تپ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سویا ہوا تھا۔ ”ذہین طیب کب سویا ہے دوائی دی تھی اسے۔“ دریکٹا نے فکر مندی سے طیب کے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا۔ اور ذہین سے دریافت کیا جو کچھ اُبھی ہوئی ی لگ رہی تھی۔ ”جی ہاں دوا دی تھی پینے کے بعد سو گیا تھا۔“ اور کب دی تھی دوا۔ ”وہ تو جی آپ کے جانے کے بعد ہی دی تھی۔“

”تو کیا طیب اُس وقت سے سو رہا ہے اُس نے حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ وہ شہر سا پنگ کرنے لگی وہاں سے واپس بھی آگئی اور طیب سو رہا تھا۔“ ”جی بی بی جی مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔“ ذہین کے چہرے پہ گھبراہٹ کے آثار تھے۔ ”کیا غلطی ہوئی ہے۔“ دریکٹا کھٹک گئی۔ ”میں نے طیب کو تھوڑی سی ایفم چٹا دی تھی بہت زیادہ رو رہا تھا ناں اس لیے۔“

”اُوہ گاؤں تم اسے وہی دیتی رہی ہو۔“ دریکٹا نے انتہائی غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”نکل جاؤ یہاں سے۔“ ”بی بی جی معاف کر دیں۔ مجھ سے طیب کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔“ ذہین اُس کے پاؤں میں گز پڑی۔ دریکٹا نے اُس سے اپنے پاؤں چھڑوائے۔ ”اچھا جاؤ پلیز۔“ ”شریں بی بی کو مت بتائیے گا۔ آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گی۔“

”میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گی بس جاؤ یہاں سے۔“ دریکٹا نرمی سے بولی ساتھ ہی وارننگ بھی دی۔ ”یہ پہلی اور آخری غلطی ہے جو میں طیب کے سلسلے میں معاف کر رہی ہوں۔ آئندہ ایسا نہ ہو۔ میرے بھائی کا خون لا وارث نہیں ہے۔“ دریکٹا جذباتی سی ہوگی تو ذہین حیرت سے دیکھنے لگی۔ ماں اور نانی کو طیب کی ذرا پر دانی نہیں تھی اس لیے اُس نے بھی

توجہ نہیں دی تھی۔ پرسا سے بیٹھی نرم دل سی لڑکی جو ذرا ذرا سی بات پہ افسردہ ہو جاتی ہے جس کی آنکھیں نیر بہانے لگتی ہیں۔ وہ طیب سے اتنا پیار کیوں کرتی ہے۔ جس اللہ نے طیب کو پیدا کیا ہے۔ یقیناً اُس نے اس لڑکی کے دل میں طیب کی محبت ڈالی ہے۔ ورنہ اُس نے تو رو رو کے ہی ادھ موا ہوا جانا تھا۔

شکر کا مقام تھا کہ طیب تھوڑی دیر بعد بیدار ہو گیا چٹکی بھرا نیم کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ ذہین طیب کے لیے دودھ کا تازہ فیڈر بنا کے لائی اور دریکٹا نے طیب کو کود میں لٹا کے دودھ پلایا۔ پندرہ منٹ بعد دوبارہ دوائی دی۔ دوائی پیتے ساتھ ہی اُس نے تے کر دی۔ دریکٹا کے سارے کپڑے بھر گئے۔ ذہین نے لپک کے طیب کو لے لیا اور پہلے اُس کے کپڑے تبدیل کیے۔

وہ حسب معمول ردنا شروع کر چکا تھا۔

مارہہ شاپنگ سے تھکی ہاری تھی۔ آتے ہی لیٹی اور آنکھ لگ گئی تھی۔

طیب چیخ چیخ کے رو رہا تھا۔

مارہہ کی آنکھ کھل گئی وہ بستر سے اُتر آئی۔

طیب دریکٹا کی گود میں تھا۔ مارہہ بھا بھی اُس کے سامنے کھڑی تھی بکھرے بالوں سمیت اُسے حیرت ہی ہوئی۔ ”یہ کیوں رو رہا ہے۔“ مارہہ پوچھ رہی تھی۔ ”بھابھی اسے بخار ہے بے چین ہے۔ شاید اس لیے رو رہا ہے۔“ دوائی دو اور چپ کراؤ اسے۔ اُس نے لائفلٹی سے مشورہ دیا اور واپس مڑ گئی۔

ذہین بھی دریکٹا کی طرح حیران تھی۔ آج مارہہ نے غالباً پہلی بار طیب کا پوچھا تھا۔

”پتہ نہیں آج سورج کہاں سے نکلا تھا۔“ دریکٹا نے ذہین کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ نہیں سنی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ اتفاق تھا یا جحج طیب کی بے چینی کم ہوئی تھی۔ وہ مارہہ کے یہاں آ کے پوچھنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اور نگزیب نے صرف قریبی رشتہ داروں کو ہی مارہہ کے نکاح میں مدعو کیا تھا۔ البتہ باسٹ اور حمزہ احمد کی طرف سے کافی مہمان بارات کے ساتھ آئے تھے۔ نکاح کے بعد باسٹ اور مارہہ کو اکٹھے بٹھایا گیا تو پینا کو مارہہ اور شاہ زیب کی شادی یاد آگئی۔ جب وہ دونوں اسٹیج پہ اکٹھے بیٹھے تھے تو اُس کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی کہ کاش شاہ زیب کی جگہ مارہہ کے پہلو میں میرا باسٹ ہوتا۔ کاتب تقدیر نے شاید اسی وقت پینا کی دعا کو اُس کی حسرت کو قبولیت کے خانے میں درج کر لیا تھا۔

مگر اُس نے ایسا کب چاہا تھا کہ شاہ زیب مر جائے۔

پینا کی آنکھیں بھیگ گئی۔ شاہ زیب کا ہنستا مسکراتا چہرہ تصور میں یکدم زندہ ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مارہہ کے پہلو میں ابھی بھی شاہ زیب ہی بیٹھا ہو۔ باسٹ کے چہرے پہ بھی تو خوشیوں کے وہی الوہی جذبے دمک رہے تھے۔ جن جذبوں سے کبھی شاہ زیب کا چہرہ جگمگایا تھا۔

”اے اللہ میرے باسٹ کے چہرے اور دل کی خوشی سلامت رکھنا۔ میں نے شاہ زیب کا کبھی بھی بُرا نہیں چاہا تھا۔ اے میرے رب! تو تو میرے دل کی حالت اور نیت کو خوب سمجھتا ہے۔ میں نے کبھی عمر زیب کا بھی بُرا نہیں چاہا تھا۔ میں اپنے نصیب کے لکھے کو جان گئی تھی۔ پھر بھی مجھ سے کوئی بھول چوک ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ میرے باسٹ کو

سلامت رکھنا۔

بینا دل ہی دل میں دعا گو تھی۔

دریکتا طیب کو گود میں اٹھائے مائرہ اور باسط کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ طیب کی حیران نگاہ مائرہ کی چہرے کی طرف ہی تھی۔ جیسے وہ سب جان اور سمجھ رہا ہو۔ عاشر تصویریں بنا رہا تھا۔ اُس نے دریکتا کو بھی مائرہ اور باسط کے ساتھ تصویر بنوانے کا اشارہ دیا اور کیمرا سیدھا کر کے کھڑا ہو گیا۔ دریکتا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی مائرہ کے برابر بیٹھ گئی۔ طیب اُس کی گود میں ہی تھا۔

باسط کی نگاہ اُس پہ پڑی تو دل ہی دل میں اُسے شدید غصہ آیا۔ طیب نے مائرہ کا زرتار آنجل پکڑ لیا تھا۔ دریکتا فوٹو بنوانے کے فوراً بعد وہاں سے ہٹ گئی۔ شریں تائی نے اشارہ کیا تھا کہ طیب کو لے کے سائڈ پہ بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے بھی باسط کے بگڑتے تیور ملاحظہ کیے تھے۔

☆☆☆

عاشر بھائی بھی کیمرا رکھ کے اُس کے ساتھ والی کرسی بہ بیٹھ گئے۔ طیب حیران حیران نگاہوں سے لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”آج تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔ ان کپڑوں میں۔“ عاشر بھائی نے آج پہلی بار دریکتا کی یوں کھل کے تعریف کی تھی۔ وہ کان کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی۔ عاشر کے ساتھ اُس کا زیادہ آنا سامنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ تاپا کے ساتھ پاپا کے آفس میں مصروف تھا کم ہی گاؤں آتا۔ ”تھینکس عاشر بھائی“۔ اُسے تشکر کا اظہار کرنا ہی پڑا۔ ”اس میں تھینکس والی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنوں میں یہ بات نہیں چلتی۔ ویسے بھی بڑے کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ تم بھی اب اپنی سوچ کا انداز تبدیل کر دو۔“ وہ اُسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ دریکتا جھینپ سی گئی۔ پہلے تو کبھی انہوں نے اس پہ اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ نہ اُن کی باتیں اُس کی سمجھ میں آرہی تھی۔

”میں کبھی نہیں عاشر بھائی“۔ اُس نے سوالیہ نگاہیں اُن کی سمت اٹھائی۔ ”ارے میں تمہارا بھائی نہیں ہوں۔ کزن ہوں۔ اور کزن بھائی نہیں ہوتا۔ تمہیں اُس ”پولیسی“ سے خلع مل جائے تو امی، ابو سب بتا دیں گے۔“ عاشر کا لہجہ اور انداز دونوں ہی معنی خیز تھا۔ دریکتا اُن سے دور ہٹ کے بیٹھ گئی۔

فرح چچی کی نگاہ عاشر پہ ہی تھی۔

انہیں کھد بھد سی لگی ہوئی تھی۔ دریکتا دور رہتی تو انہیں سکون ہوا۔ مائرہ کی رخصتی کے وقت طیب نے رورو کے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ پھولوں سے سجی گاڑی میں بیٹھ کے مائرہ نئی منزلوں کی تلاش میں نئے ہم سفر کے سنگ رخصت ہو گئی۔ اپنے پیچھے مسافرت کی گرد میں الٹی ایک نشانی چھوڑ کے۔

☆☆☆

یہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ مائرہ اُس کے کمرے میں دوپہن بنی بیٹھی تھی۔ سولہ سنگھار سے آراستہ کسی نوخیز کلی کی مانند۔ پر نہیں مائرہ نوخیز کلی کہاں تھی۔ اس کلی کو تو پہلے ہی کوئی پھول بنا چکا تھا۔ ”کیوں گھونگھٹ کا تکلف کرتی ہو بہت بار دیکھ چکا ہوں پہلے بھی اس چہرے کو.....“

باسط کو خود سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیوں اتنا تلخ ہو رہا ہے۔ مائرہ نے حیران شکوہ کناں نگاہیں اٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ہاں دیکھا ہوگا میرے اس چہرے کو پہلے بھی کئی بار۔ لیکن اس رنگ میں اس رشتے سے تو پہلی بار دیکھ رہے

ہوں“۔ ناز تھا، انداز تھا، ادا بھی سب کچھ ہی تو تھا مائرہ میں۔ ”اس رشتے میں اس رنگ میں مجھ سے پہلے بھی تو کوئی دیکھ چکا ہے۔“ باسط نے بے رحمی کی انتہا کر دی۔ اولین شب ملن کی اس گھڑی میں۔ مائرہ نے کب یہ سب سننے کی تمنا کی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

باسط نے خود ہی اُس کا ہاتھ مارا اور وہ خوبصورت سا برسلیٹ اُس کی کلائی میں پہنایا۔ اُسے خود بھی اپنے رویے کی بد صورتی کا احساس ہو چکا تھا۔ سب کچھ بھلا کے نئے رشتے کی طرف پلٹا اور مائرہ کو آغوش میں سمیٹ لیا۔ اُس کی آنکھیں گلابی ہو چلیں اُن میں نشہ سا اتر آیا۔ باسط جو قمر بتوں کے فسوں خیز سمندر میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔ یکدم کوئی اُس کے کان میں بڑے زور سے چیخا، برتی ہوئی عورت استعمال شدہ عورت.....

اُس نے مائرہ کو ایک دم پرے دھکیلا۔ جیسے وہ آگ کا انگارہ ہو۔ چھوت ہو۔ اُس کے حلق میں کانٹے اُگ آئے۔ جی چار ہاتھ سمندر پہ لپکی جائے۔ کسی صحراؤں کی سی پیاس اُس کے من میں پھیلتی جا رہی تھی۔

مائرہ بے چیناں سینے تھک ہار کے سو گئی تھی۔ باسط بھی سگریٹ پھونک پھونک کے تھک چکا تھا۔ رات کے آخری پہرہ سوئی ہوئی مائرہ کے اوپر جھکا تو سب کچھ بھولنے کی کوشش میں تھا۔ وہ کبھی نیند میں تھی۔ جاگ گئی۔ باسط کی نگاہوں میں طلب تھی۔ وہی پیاسی طلب بھری نگاہ جو کبھی مائرہ کے وجود سے لپٹی تھی تو وہ بھول ہی نہیں پائی تھی۔

باسط کے بازو تختی سے اُس کے گرد جمائل ہو گئے۔ مائرہ کی سانس ہی رکنے لگی۔ ”تم صرف میری ہو۔ میری تھی، تمہاری زندگی میں صرف میں ہی ہوں اور کوئی نہیں ہے۔“ وہ دیوانگی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

☆☆☆

برسوں عرصوں میں اب نیندوں میں جاگے ہیں۔ خواب، جو جاگے دوں کی آنکھوں میں چھپتے تھے خواب جو کل بیداری میں بھی اپنے نہیں تھے جواب نیندوں میں بھی اپنے نہیں ہیں

مائرہ رخصت ہو کے باسط کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کر چکی تھی۔ عمر زیب اُسی پرانی کیفیت میں تھے۔ نوید زیب اور نگ زیب بھائی کے علم میں لائے بغیر ایک ڈاکٹر سے ملے اور عمر کا کیس ڈیکس کیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ گھر پہ اُن کا علاج نہیں ہو سکتا انہیں ہاسپٹل لانا ضروری ہے۔ نوید اس کوشش میں تھے کہ عمر کو ہاسپٹل لے جائیں۔

☆☆☆

دریکتا نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ کیونکہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ عمر زیب کا رپٹ پہ نیچے بیٹھے تھے۔ دریکتا کو وہ پہلے سے بھی زیادہ کمزور لگنے۔ گالوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں۔ اُن کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت پریشانی کا اشارہ دے رہی تھی۔ دریکتا دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔ ”پاپا“ اُس کے لب پہلے۔ عمر نے آواز پر اٹھا کے خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ اُس کا جی چاہا وہ بھاگ کے اُن کے پاس جائے اور سینے میں سر چھپا لے اور پھر اونچی اونچی آواز میں رونے۔ انہیں اپنا ایک ایک ڈکھ ایک ایک غم بتائے۔ انہیں بتائے کہ مائرہ آپ کی بہو باسط کے سنگ نئے گھر میں چلی گئی ہے۔



اُسے۔" باسط کی آنکھوں سے شعلے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔ "باسط میں تم سے محبت کرتی تھی کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ وہاں میرے گھر والوں نے شادی کی تھی۔ ان کا فیصلہ تھا۔" "ہا ہا ہا ہا ہا ہا" باسط ہنستا چلا گیا۔ "گھر والوں کا فیصلہ ہا ہا ہا۔۔۔ شاہ زیب مجھ سے زیادہ امیر تھا۔ تم بھی اُس کی دولت گھر بار دیکھ کے قربان ہو گئی تھی۔ اور شریں خالہ نے اپنی بہن کے جذبات تک کا کوئی خیال نہیں کیا۔ صاف کہہ دیا کہ ہم نے زبان دے دی ہے۔ حالانکہ اُس وقت ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہم سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ شریں خالہ نے اپنی بہن سے جھوٹ بولا۔ اور تب تم بھی شاہ زیب کے نام کی مالا چب رہی تھی۔ بہت جلدی تمہارا اور خالہ کا غرور ٹوٹا ہے۔" باسط بہت بے رحمی سے بول رہا تھا۔ مائرہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ باسط اٹھا شوہر پہنے اور غصے سے دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اکیلا ہی جا رہا تھا۔ اُس نے مائرہ سے ایک بار بھی جانے کے لیے نہیں کہا۔ گاڑی کی سچابی، سوبائے فون اٹھایا۔ مائرہ ایک تو اتر سے رو رہی تھی۔ باسط نے ایک نظر تک نہ ڈالی۔ اُسے گویا مائرہ کے بستے آنسوؤں کی کوئی پردا ہی نہیں تھی۔

باسط نے دوستوں کے ساتھ باہر ہی ڈٹ کے کھانا کھایا، ہلا گلا کیا اور رات بہت دیر سے گھر واپس آیا۔ سب گھر والے سو چکے تھے۔ باسط نے آرام سے اپنے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ زیر و پاور کا بلب جل رہا تھا۔ مائرہ کروٹ بدلے دراز تھی اور جاگ رہی تھی۔ بال بکھرے اور آنکھیں شدت گریہ سے سرخ۔ باسط نے ایک نگاہ دیکھا اور کپڑے بدلنے چلا گیا۔ واپس آ کے تکیہ اٹھایا اور اُسے قدرے دور ہو کے لیٹ گیا۔ "میں ان ڈراموں سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو کے آؤ اور پنکٹ ناکٹی پہنو۔ اس کے بعد میرے پاس آنا۔ اور یہ میرا حکم ہے۔ پانچ منٹ سے اوپر نا تم نہ ہو۔" باسط کے لہجے میں سختی تھی۔ مائرہ اسی طرح لپٹی رہی جیسے بنا ہی نہ ہو۔ "میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ کرے کی دیواروں سے مخاطب نہیں ہوں۔ سو بے بہانا بند کرو اور جلدی کرو۔" اس بار اُس نے مائرہ کا بازو بڑی زور سے بلایا۔ مائرہ کو جرات نہیں ہوئی کسی قسم کے احتجاج کی۔

اُس نے خاموشی سے منہ ہاتھ دھو کے بال سنوارے۔ پر آنسو جانے کہاں سے اُٹے آرہے تھے جیسے اُس کے اندر سیلاب آ گیا ہو اور سب بند ٹوٹ گئے ہوں۔

ایک بار پھر اُس نے منہ پہ پانی بکے چھپا کے مارے۔ اتنے میں باسط غصے میں اُبلتا ہاتھ روم میں آ گیا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ پانچ منٹ سے اوپر نہ ہوں۔ تم یہاں کس کا ماتم کر رہی ہو۔ وہ اُس کے کان کے قریب چینا تو مائرہ کے آنسوڑک گئے۔ کتنا اجنبی اور سرد سا رویہ تھا اُس کا۔ وہ میکانکی انداز میں اُس کے ساتھ آئی۔

"سکون چاہیے اس وقت مجھے صرف سکون۔" باسط کے بازو اُس کی کمر کے گرد حائل ہو گئے۔ وہ اپنے حق کا استعمال کر رہا تھا اور مائرہ کے اندر کوئی بیخا زور سے رد رہا تھا۔ ہاں اُس کی آنکھوں میں اب آنسو نہیں تھے۔

باسط نے کوئی معذرت نہیں کی نہ کسی شرمندگی کا اظہار۔ اُس میں مردانگی جو تھی وہ ایک مکمل مرد تھا جیسا ایک مرد کو ہونا چاہیے۔ کبھی یہ الفاظ مائرہ نے شاہ زیب کو کہے تھے۔ باسط اُس کے قریب تھا اور اُسے شاہ زیب سے کہی باتیں یاد آ رہی تھی۔ کبھی شاہ زیب اُس کے پاس تھا اور اُسے باسط کی مردانگی یاد آتی تھی۔

جذبات کا طوفان ختم ہونے کے بعد باسط کروٹ بدل کے سکون سے سو گیا۔ مائرہ نے قطرہ قطرہ ازیت اپنے

آپ کے لاڈلے شاہ زیب کا بیٹا کی گود کے بغیر پل رہا ہے۔ آپ کی دریکتا کو اشعر لغاری زندہ درگور کرنے یہ تلا ہوا ہے۔ ننھے طیب کو باپ کی دانگی جدائی کے ساتھ ساتھ مائرہ بھابھی کی محبت بھی نہیں ملی ہے۔ پیامیں بہت اکیلی ہوں۔ آپ کے بغیر میں بہت کمزور ہوں۔ ہمارا گھر اکیلا اور خالی ہے۔ وہاں اشعر لغاری نے فائرنگ کروائی ہے۔ اُس کا رویہ میرے ساتھ بہت درشت اور خطرناک ہے۔ پناہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ آپ کو پتہ نہیں تھا کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تایا تائی ان سب کو پتہ ہے آپ کو کیوں نہ پتہ چلا پاپا۔ آپ کیوں آنکھیں بند کر کے جیتے رہے اور سنب کا اعتبار کرتے رہے۔ پیامیری زندگی مذاق بن کے رہ گئی ہے۔

کاش پاپا اُس کا دکھ جان پاتے۔ پردہ کیسے جانتے۔ خود تک سے بھی بے خبر تھے۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑی رہی اور پھر اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔ ذہلقتی شام اپنے پہلو میں ادا سیوں کے سبھی رنگوں کو چھپائے ہوئے تھی۔

طیب جاگ چکا تھا۔ زمین کپڑے تبدیل کر کے طیب کو اُس کے پاس لے آئی۔ دریکتا اُسے اٹھائے اٹھانے برآمدے سے آگے آگئی اور گلوں کی قطار کے پاس خالی جگہ پہ بیٹھ گئی۔ طیب اپنی موٹی موٹی آنکھیں کھولے اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ دریکتا نے بے اختیار اُس کی پلکوں کو چومنا تو وہ کسمانے لگا۔

وہ اُسے غور سے دیکھنے لگی۔ کتنا کمزور ہو گیا تھا وہ۔ پیدائش کے وقت سرخ و سفید اور موٹا تازہ تھا۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی طیب ہے۔

رورو کے تو اُس نے اپنی جان ہی کھالی تھی۔ اگر چہ اب وہ پہلے کی طرح نہیں روتا تھا پر پھر بھی رونے کا دورہ اُسے وقتاً فوقتاً پڑ ہی جاتا تھا۔ دریکتا اُسے گود میں لٹائے اُداس اُداس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وقت اور حالات کتنے ظالم ہیں۔ بہت سارے خونی رشتوں کے بغیر جینا سکھا دیتے ہیں۔ طیب کو دیکھتے ہوئے یہ بات اُس کے ذہن میں آتی تھی۔

☆☆☆

مائرہ باسط کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ باسط نے کھانا ہوٹل میں کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔ بلیک بارڈروالی میرون ساڑھی میں ملبوس بالوں کا جوڑا بنائے۔ زیورات سے آہستہ گئی بنی مائرہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ طیب کی ماں بننے کے بعد اُس کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔ باسط لیٹا اُس کی تیاریوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ سب سے آخر میں مائرہ نے خود پہ پرفیوم اسپرے کیا اور گھوم کے باسط کی طرف دیکھا۔ "اب چلیں میں تو تیار ہوں۔"

وہ خاموشی سے تکتا رہا۔ مائرہ اُس کے پاس آ گئی۔ "کیا بات ہے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟" تم پہلے سے زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔" باسط نے تعریف کی اُس کی گردن کچھ اور بھی اکر گئی۔ "تو سب تمہاری محبتوں کا کمال ہے۔ میں تمہاری محبت پا کر مغرور ہو گئی ہوں۔" وہ اُس کے پاس بیٹھ گئی اور سینے سے سر نکا دیا۔ "تو کیا شاہ زیب تم سے محبت نہیں کرتا تھا؟" پل بھر میں باسط کا موڈ بدل گیا اُس نے مائرہ کا سر اپنے سینے سے ہٹا دیا۔ جانے اُس کے اچھے خاصے موڈ کو کیا ہو جاتا تھا۔

بیٹا اُس کا کیا ذکر۔" اُس کا ذکر ہی تو ہوگا۔" وہ زہر میں مجھے لہجے میں بولا۔ "باسط وہ میرا ماضی تھا جو میں بھول چکی ہوں۔" "پر میں تو نہیں بھولا ہوں۔ اُس کی زندہ جیتی جاگتی نشانی تمہارے پاس موجود ہے۔ تم کیسے بھول سکتی ہو

☆☆☆

باسط اب واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔

ضرورت سے زیادہ وقت پاکستان میں لگ گیا تھا۔

جانے سے پہلے اُس نے مائرہ کو جی بھر کے شاپنگ کروائی۔

کپڑے اور زیورات اُس کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ باسط نے اپنی پسند سے اور لے کر دیئے۔ روز اُسے کہیں نہ کہیں لے کے نکل جاتا۔ باہر کھانا کھلاتا، لانگ ڈرائیو کرتا۔ جب وہ کہتی باسط اب دیر ہوگی ہے گھر چلو وہ تب گاڑی واپسی کے لیے موڑتا۔ اُسے کہتا کہ میرے پاس بیٹھی رہو۔ کوئی کام مت کرو۔ میں یہاں سے تمہاری پیاری پیاری یادیں سمیٹ کے لے کے جانا چاہتا ہوں۔ وہ اُسے دیوانوں کی طرح تکتا جاتا۔ تب مائرہ اُس کی بے تابیوں، اور بے قرار یوں پر حیران ہو جاتی۔ اُس کے دھوپ چھاؤں ایسے مزاج کو وہ سمجھ ہی نہیں پارہی تھی۔ وہ برسے پہ آتا تو پور پور سیراب کر دیتا۔ اور جب روٹھتا تو سانس تک سینے میں روک دیتا جیسے ایسا ہی شعلہ شبنم تھا باسط۔

☆☆☆

مائرہ کتنی بار اپنے آنسو نظر چھپا کے صاف کر چکی تھی۔ باسط کل جا رہا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا جا رہا تھا اُس کے دل میں عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا زنجیر بن کے باسط کے قدموں سے لپٹ جائے اُسے نہ جانے دے۔ ایسا نہ ہو وہ چلا جائے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی واپسی کا راستہ نکلتی رہے۔ انتظار اُس کا مقدر بن جائے۔ وہ اُس کے سینے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ باسط ہاتھ کی انگلیوں سے اُس کے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ اپنی بے پناہ چاہت کا اظہار کر رہا تھا۔

”باسط کب آؤ گے واپس“۔ مائرہ نے ذرا سانس اٹھا کے اُس کی طرف دیکھا۔

”اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ تمہارے بغیر میں کہاں رہ پاؤں گا۔ زنجیری ڈال دی ہے تمہاری محبت نے میرے پاؤں میں“۔ ”دیکھ لو شادی کے بعد میں ایک پل ایک دن بھی تم سے دور نہیں ہوا ہوں۔ نہ تمہیں امی کے گھر جانے دیا ہے۔ لیکن مجبوری ہے جو میں تم سے دور جا رہا ہوں“۔ باسط کے لفظ لفظ سے محبت ٹپک رہی تھی۔

”باسط میں کیسے رہوں گی“۔ وہ پھر سے روہانسی ہونے لگی تو باسط نے اُسے بازوؤں میں چھپالیا۔ ”میں جب واپس آؤں تو تمہاری طرف سے خوشخبری ملنی چاہیے مجھے“۔ وہ مائرہ کو اسی طرح بازوؤں میں جکڑے جکڑے بولا تو وہ سمجھ ہی نہیں پائی کہ خوشخبری کا مطلب کیا ہے۔ ”خوشخبری سے کیا مراد ہے باسط“۔ ”ہماری قربتوں کی کوئی نشانی وجود میں آجانی چاہیے۔ یہ خوشخبری سنانا مجھے جلدی“۔ وہ اُس کی ناک چھو کے بولا تو مائرہ شرمائی اور اُس کے سینے میں سر چھپالیا۔

باسط کو اُس کی شرمائی کی ادا بہت بھائی۔ وہ کنواری لڑکی کی طرح سرخ پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اشعر میٹنگ کے بعد آفس سے اٹھ آیا۔ شام دوستوں کے ساتھ ”جیم خانہ“ جانے کا موڈ تھا۔ اس لیے وہ جلدی

آگیا تھا۔

طاہر لغاری ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے اور بے انتہا سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ اشعر نے سلام کیا تو انہوں نے لفافہ اُس کی طرف بڑھایا جو اُن کی گود میں دھرا ہوا تھا۔ ”پہا کیا ہے یہ کس نے بھیجا ہے۔ وہ الٹ پلٹ کے دیکھتے

نے بولا۔

”خود پڑھ لو، دیکھ لو“۔ وہ اُسی سنجیدگی سے بولے تو اشعر کو محسوس ہوا جیسے اُن کی بے انتہا سنجیدگی کا تعلق اسی نے ہے۔

دریگتا کے وکیل کی طرف سے خلع کا نوٹس تھا۔ اشعر نے پرزے پرزے کر کے فضا میں اُچھال دیا اور باہر نکل گیا۔ اُس نے کوئی بات نہیں کی تھی نہ کچھ بولا تھا۔ نہ کسی قسم کے غصے کا اظہار کیا تھا۔ اُس کی خاموشی بہت خطرناک تھی اور

☆☆☆

”میں نے وکیل کے ذریعے خلع کا نوٹس بھجوا دیا ہے۔ بہت اُچھل رہا تھا کہ خلع نہیں دے گا“۔ اور نگزیب نے آئے تھے اور دریگتا کے ساتھ ساتھ شریں کو بھی اپنی حالیہ کارکردگی کا بتا رہے تھے۔ جو اب دریگتا نے کسی قسم کی رائے سنائی۔ وہ جانے کیا سمجھے اُس کے پاس آ کے بیٹھ گئے۔ ”تم پریشان مت ہو وہ خلع دے دے گا۔ میرا تو نہیں خیال کہ عدالت میں آ کے اپنے مقدمے کی پیروی کرے گا۔ وہ عدالت کی طلبی پہ حاضر ہی نہیں ہوگا اور عدالت تمہارے حق کی فیصلہ دے گی۔ میں طاہر لغاری کی نفسیات کو جان چکا ہوں۔ عزت دار لوگ ہیں۔ عدالتوں کے چکر میں پڑنے والے کس ہیں۔ پیشی پہ کوئی عدالت میں آئے گا ہی نہیں“۔

دریگتا کو اُن کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ مارے بندھے سن رہی تھی۔ اُسے عدالت کے نام سے ہی بے پناہ ہورہی تھی کہ وہاں جانا پڑے گا۔ اور یقیناً وہاں پہ اشعر لغاری اور طاہر انکل بھی تو ہوں گے۔ اشعر لغاری سے اُسے بے بسی ڈر لگتا تھا اور طاہر انکل کو وہ کیسے فیس کرے گی۔

تایا اور نگزیب اُسے چند پیشوں میں ہی فیصلہ اپنے حق میں ہونے کی خوشخبری سن رہے تھے۔ وہ کسی بات سے لگاؤ خوش نہیں ہو پارہی تھی۔ حالانکہ اُسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ اُسے خلع ملنے والی ہے یہ خوشخبری کوئی اور نہیں تایا اور نگزیب اُسے سن رہے تھے۔

”اپنے دل کو مضبوط رکھو کچھ نہیں ہوتا۔ اس میں تمہارا کوئی تصور نہیں ہے بس تمہارے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ اگر وہ اشعر لغاری اور اُس کے خاندان کی حقیقت پہلے ہی کھل گئی ہے۔ بعد میں پتہ چلتا تو کیا ہوتا“۔ شریں تائی بھی

”میری کب سے آرزو تھی کہ تمہیں بیٹی بنا کے اپنے گھر میں لاؤں۔ اللہ نے میری یہ خواہش سمجھ پوری کر دی ہے۔ بس اشعر والا قصہ ختم ہو تو میں بھی تیاری شروع کروں“۔ شریں تائی اُسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اُن

ابا بات کا مطلب بہت واضح تھا۔ دریگتا دودھ پیتی بچی نہیں تھی جو سمجھ ہی نہ پاتی۔ اُس کا دم اُلجھنے لگا۔ ایک دم سے جی چاہا اٹھ کے دور بھاگ جائے۔ مزید یہاں بیٹھی رہتی تو پریشان ہوتی۔

”شرمائی ہے“۔ اُس کے جانے کے بعد شریں نے تبصرہ کیا تو اور نگزیب نے فاتحانہ نگاہوں سے اُس کی

طرف دیکھا۔ جیسے کہ رہا ہو کہ اب منزل دور نہیں ہے ہم سے۔

میں اُس وقت اور نگزیب کا سیل فون گنگنانے لگا "ہیلو" وہ کال ریسو کرتے ہی اپنی مخصوص گونجدار آواز میں بولے۔ دوسری طرف اشعر لائن پر تھا۔ اُس نے رکی تکلفات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

"مجھے نوٹس مل گیا ہے میں نے اس لیے کال کی ہے۔" اشعر دلی جذبات کو چھپا کے بات کر رہا تھا "پھر یہ سوچا ہے کیا عدالت میں جانا ہے یا عدالت کے باہر معاملہ طے کرنا ہے۔" اور نگزیب اشعر کی فون کال کو اپنے لیے بہت بڑی کامیابی تصور کر رہے تھے۔ اس لیے اکڑ سے گئے تھے۔ "معاملہ جو بھی ہے آپ کو پتہ چل جائے گا۔ میں نے یہ پوچھنا ہے کہ کیا اس خلع میں آپ کی مرضی بھی شامل ہے۔" دریکتا نے خود اپنی زبان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اُسے خلع چاہیے۔ جب وہ راضی نہیں ہے تو اس میں کوئی بھی راضی نہیں ہے۔ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ دریکتا کو خلع مل جائے۔ اس کے بعد میں اپنے خاندان میں ہی اُس کی شادی کروں گا۔ پہلے بھی سب کی مرضی یہی تھی مگر عمر زیب نے اپنی مرضی کی۔ خیر وہ ماضی کی باتیں ہیں۔ میں اب دریکتا کی شادی اپنے بیٹے عاشر سے کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کی بھی یہی خواہش ہے۔ وہ اپنے دھن میں بڑے جوش سے بتا رہے تھے۔ دوسری طرف اشعر نے اپنے کھولتے جذبات کو بڑی مشکل سے قابو کیا تھا۔ "آپ بھول رہے ہیں کہ دریکتا ابھی میرے نکاح میں ہے اور آپ نے ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ چبا چبا کے بولا۔

"دریکتا کو تمہارے نکاح کی قید منظور نہیں ہے۔" اور نگزیب نے اُسے کچھ یاد کرایا۔

"میں اُسے اس قید سے کبھی رہائی نہیں دوں گا بے شک وہ زندگی کی قید سے رہائی پا جائے۔" اشعر کا لہجہ سنگدلی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔

اور رابطہ منقطع کر چکا تھا۔

کچھ دیر پہلے اور نگزیب اپنی فتح کے شعلے کے احساس سے ہی سرشار ہو رہے تھے اور اب پریشانی سے سر پکڑنے بیٹھے تھے۔

اشعر گلے کی ہڈی بن چکا تھا۔

☆☆☆

باسط سب سے مل کے آخر میں بیٹا سے ملا تو ہمیشہ کی طرح اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے بھیگی آنکھوں سمیت باسط کا ماتھا چوما اُسے دعائیں دیں بالکل اپنے سگے بیٹے ایاز کی طرح۔ اُسے کبھی احساس نہیں ہوا اتنے برسوں میں کہ باسط اُس کا بیٹا نہیں ہے اُس نے بیٹا کی کوکھ سے جنم نہیں لیا ہے۔

عمر زیب سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد حمزہ احمد کے گھر والوں نے رشتہ مانگا۔ حمزہ کی بیوی ایک حادثے میں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ باسط اُس وقت دو سال کا تھا۔ بیٹا کی شکل و صورت شریں کے مقابلے میں داغی ہی تھی۔ اوپر سے رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا ایسے میں حمزہ احمد کے رشتے کو گھر والوں نے غنیمت تصور کرتے ہوئے فوراً ہاں کر دی۔ بیٹا بہت روئی، پر اُس کی ایک نہ چلی۔ شروع شروع میں اُس کی حمزہ کے ساتھ لڑائیاں بھی ہوئیں پر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ وہ حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ گیا۔ حمزہ احمد نے شادی کے پہلے دن ہی اُسے کہا تھا کہ باسط کو کبھی معلوم نہ ہونے پائے کہ تم اُس کی سگی ماں نہیں ہو۔ اس کڑوے جھوٹ کو بیٹا نے بیٹھے سچ کی طرح بیا۔ ایاز گود میں آیا تو اُسے باسط کی محرومی بھی سمجھ بھی آگئی اور

نے کھلے دل اور ماں کی آغوش کی طرح باسط کو سمیٹ لیا۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بیٹا اپنے گھر کی خاطر بچوں کی خاطر سب کچھ بھول گئی۔ باسط سے اُس کی محبت کسی ریا اور دکھاوے پہ مبنی نہیں تھی۔ اور حمزہ احمد نے تمام ان کا اعتراف کیا۔

"امی آپ تو ایسے روتی ہیں جیسے میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔" باسط نے ہنستے ہوئے اُسے چھیڑا تو اُس نے کے باسط کے لبوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "آئندہ یہ بات مت کرنا۔ میں سہہ نہیں پاؤں گی۔" امی نہیں کہوں گا کہ میں نے اُسے چھیڑا تھا آپ اتنی ڈرپوک اور بزدل ہیں۔" مائیں ایسی ہی ڈرپوک اور بزدل ہوتی ہیں جس میں ہوں اس لیے اب زبان سے کوئی ایسا حرف نہ نکالنا۔" بیٹا نے وارننگ دی تو باسط نے بڑی سعادت مندی سے ہلایا۔

باسط اپنے پیچھے ماڑہ کے دل میں بہت ساری بے چیریاں چھوڑ گیا۔ وہ پل پل اُسے یاد کرتی۔

☆☆☆

باسط کے جانے کے بعد ماڑہ کا دل کہیں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ بیٹا نے اُسے پریشان کیا تو چند روز کے لیے میکے جانے کا مشورہ دیا۔ ماڑہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ چنانچہ اگلے دن حمزہ احمد اُسے گاؤں لے گئے۔

حویلی میں قدم رکھتے ہی پرانی اپنائیت جاگ پڑی۔ وہ سب رشتے یاد آگے جنہیں اتنے دنوں سے باسط کی طرف سے بھولی ہوئی تھی۔ شریں، ساڑہ، اُسے دیکھ کے بہت خوش ہوئیں۔ ہاں دریکتا سے ملتے ہوئے اُس نے ان کی گرجوٹی محسوس نہ کی اُسے دیکھ کر جیسے بادلِ نخواستہ مسکرا رہی ہو۔ "کیا بات ہے پریشان سی لگ رہی ہو۔" اس سے انکار اور دریکتا کی بجائے جواب شریں کی طرف سے آیا۔ "پریشان کیوں نہ ہوگی بیچاری۔ دو دن بعد عدالت میں پیشی ہوگی اور اُس اشعر لغاری نے کال کر کے تمہارے ابو کو بہت دھمکیاں دی ہیں اس کے بارے میں کبھی اُلٹا سیدھا کہا ہے۔ یہ ایلے رونی صورت بنائے بیٹھی ہے۔"

"اوہ اچھا دو دن بعد پیشی ہے۔" ماڑہ اُسے دیکھ کے رہ گئی پھر جیسے اچانک اُسے بھولے سرے طیب کا خیال آیا اُس کا پوچھ بیٹھی۔ "طیب کیسا ہے کہاں ہے۔"

"وہ ٹھیک ہے سو رہا ہے۔" دریکتا آہستہ سے بولی۔ "اُس کی فکر مت کرو۔ بالکل ٹھیک ہے۔ بہت اچھے لڑکے سے اُس کی پرورش ہو رہی ہے۔" شریں نے اُسے کوئی اور بات ہی نہیں کرنے دی۔ ماڑہ بھی ادھر ادھر کے قصوں سے مالک گی۔

☆☆☆

ابھی اتنی رات نہیں ہوئی تھی پر ماڑہ جلدی لیٹ گئی تھی۔ سیل فون کے ساتھ لگی ہوئی تھی کہ باسط کی کال آگئی۔ خوشگوار حیرت ہوئی۔ "جی جناب کیسی ہیں ہماری بیگم صلابہ۔" باسط کا تروتازہ لہجہ کانوں سے نکل آیا تو اُس کی ساری آنکھیں اور کھنکھڑ اڑ چھو ہوگی۔

"میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔"

"ہماری کیا پوچھتی ہو۔ تمہاری جدائی میں تڑپ رہے ہیں۔" تو پھر گئے کیوں تھے مجھے چھوڑ کے۔" "مجبوری

تھی مگر جلدی آؤں گا نہ فکر کر دو۔ ” آؤ جاؤ ناں ابھی۔ ” مائرہ بے چارگی سے بولی تو وہ ہنسنے لگا۔ ” اس طرح نہ بلاؤ نہیں سچ سچ آ جاؤں گا پھر پتہ ہے ناں میرا۔۔۔۔۔ ” وہ شرمائی۔ ” کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ باسط نے ہی خاموشی کو توڑا۔ ” خالہ کی طرف آئی ہو۔ امی نے بتایا تھا گھریات ہوئی تھی میری۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھنا تم اپنے بیٹے کی طرف مت جانا۔ ایسا نہ ہو یہاں آ کے تمہاری ممتا جاگ پڑے۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔ تم نے ساری محبت میرے بیٹے میری اولاد کے لیے محفوظ رکھنی ہے۔ اگر میری زوجیت میں رہنا ہے تو۔۔۔ ” باسط کے لہجے میں یکا یک خود غرضی در آئی۔ مائرہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

باسط نے کچھ دیر بعد ایسی مزید ہدایات کے ساتھ فون بند کر دیا۔

وہ میل فون رکھ کے اُس کے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔

جانے وہ اُس کے ماضی اور اُس سے وابستہ طیب سے اتنا بیزار کیوں تھا۔

☆☆☆

دریکتا کی آج عدالت میں پیشی تھی۔

تائی شریں، تایا اور نگزیب اُسے مسلسل سمجھانے، بھجانے میں لگے ہوئے تھے۔ پرنہ جانے کیوں اُس کا دل وسوسوں اور گھبراہٹ کا شکار تھا۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ طوفان سے پہلے والی مخصوص خاموشی طاری تھی۔ کسی انہونی کا اشارہ تھا۔ دریکتا نے طیب کو ڈھیر سا راپیا کیا۔ اس سے اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

” ذہین طیب کا خیال رکھنا میں آ جاؤں گی جلدی۔ ” آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے ذہین کو پھر یاد دہانی کروائی تو سائرہ مائرہ کی طرف دیکھ کے ہنس پڑی۔ ” بہت دکھ ہو رہا ہے اپنے ہنر بینڈ سے علیحدگی کا۔ وہ بہت عجیب سے لہجے میں بولی تو شریں نے ڈانٹا۔ ” کیا ہر وقت فضول باتیں کرتی رہتی ہو۔ ہم جا رہے ہیں کم از کم خیال کرو لو اس کا۔ وہ اُدھر ہی بڑا سا منہ بنا کے چپ ہو کے بیٹھ گئی۔

شریں نے دریکتا کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا۔ اور نگزیب اور عاشر دوسری گاڑی میں تھے دونوں گاڑیاں ڈرائیور چلا رہے تھے۔

دریکتا سر جھکائے مسلسل اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔ شریں باہر کے مناظر میں گم تھی۔

☆☆☆

طاہر کی طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے اشعر نے منع کر دیا تھا کورٹ جانے سے ” پیارے دین آپ مت جائیں ریست کریں۔ آپ کو ریست کی ضرورت ہے۔ میں جا رہا ہوں آپ کو کال کر کے وہاں کی چھو ایشن بتا دوں گا پھر آفس جاؤں گا۔ ” وہ شوز پہن رہا تھا۔

طاہر نے بادل نحو استہ سر ہلایا۔ ” ٹھیک ہے مجھے بتا دینا جو بات بھی ہوئی۔ ” او کے پاپا ڈونٹ وری۔ ” اُس نے مڑ کے طاہر کو دیکھا اور اپنے کمرے میں آیا۔

اپنا ہسپتال الماری سے نکالا اور کھول کے اُس کا چیمبر چیک کیا۔ ریولوار پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ اُس نے سیفٹی کیچ بنا دیا اور اُسے ہیلٹ کے نیچے اڑسا۔ اشعر کے لبوں پہ پر سر اسکر اہٹ کھیل رہی تھی۔

طاہر دیکھ لیتے تو آج ضرور اُس کے ساتھ جاتے۔

اُس نے پیپا کے سامنے بے مثال صبر و ضبط کا مظاہرہ کیا تھا اپنے لہجے اور کسی بھی انداز سے اپنے ارادوں کا اظہار ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ نارمل نظر آنے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ تب ہی تو طاہر پُرسکون تھے۔

☆☆☆

اشعر عدالت کے احاطے میں پہنچا تو وہاں ابھی اتنی زیادہ رش نہیں تھا۔ دریکتا کے وکیل نے پیش کار کے ساتھ ل کے اپنے کیس کا پہلا نمبر لگوا دیا تھا تب ہی اشعر جلدی آیا تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی وہ لوگ ابھی نہیں پہنچے تھے۔ اشعر دوبارہ کورٹ سے باہر آ گیا۔ گاڑی اُس نے سائیڈ پہ پارک کی ہوئی تھی۔

وہ بار بار ریست و ایج دیکھ رہا تھا۔ اُن لوگوں کو اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ دس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اور نگزیب کی گاڑی آتی نظر آئی۔ اشعر کو اُنہوں نے دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور نے اور نگزیب کے کہنے پہ گاڑی کا انجن بند کر دیا۔ اور نگزیب اور عاشر دونوں نیچے اتر آئے۔ اُن کے پیچھے ہی شریں کے گاڑی کے ڈرائیور نے بھی ایسا ہی کیا۔ ” کیا بات ہے لگتا ہے تمہیں عقل آ گئی ہے تب ہی یہاں کھڑے ہوؤ۔ ” اور نگزیب نے دوستانہ انداز میں اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اتنے میں شریں بھی گاڑی سے اتر کر اُن کے پاس آ کے کھڑی ہوگی۔ ” دریکتا تم بھی آ جاؤ۔ ” جانے کیا سوچ کے شریں نے گم صم پریشان بیٹھی دریکتا کو اشارہ کیا۔ وہ ڈرتے ڈرتے نیچے اتری۔ پہلے وہاں پاؤں باہر رکھا پھر بایاں۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ اُسے ایسا کرنا چاہیے بھی کہ نہیں۔

” اُس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔ ” اشعر نے نری سے اور نگزیب کا بازو کندھے سے بنایا۔ دریکتا شریں کی اوت میں کھڑی تھی۔ اشعر نے دائیں ہاتھ سے ریولوار ہیلٹ کے نیچے سے نکالا اور شریں کی اوت میں کھڑی دریکتا کو بائیں ہاتھ سے اپنی طرف کھینچا۔ یہ دونوں کام اُس نے انتہائی پھرتی سے کیے۔ ریولوار دیکھ کے اور نگزیب اور عاشر بھی پیچھے ہٹ گئے۔ اُن میں سے کسی کے پاس بھی اسلحہ نہیں تھا۔ یہ شوق صرف نوید کو تھا باقی کوئی بھی سرعام اپنے ساتھ نہیں رکھتا تھا۔

” میں اسے اپنے ساتھ لے کے جا رہا ہوں کسی کو اعتراض ہے تو بولے۔ ” اُس کا لہجہ بلا کا سفاک تھا۔ دریکتا اس اچانک وار کے لیے تیار نہیں تھی بڑی طرح ہراساں ہوگی۔

اشعر نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کے دریکتا کو فرنٹ سیٹ پہ دھکا دیا اور خود بجلی کی تیزی سے اُس نے گاڑی اشارت کی۔ اور نگزیب اور عاشر اور دونوں ڈرائیور ہکا بکا دیکھ رہے تھے۔ ” بہت بُرا کروں گا میں اشعر لغاری تمہارے ساتھ۔ ” اور نگزیب نے دانت پیستے ہوئے اشعر کو غائبانہ دھمکی دی۔ وہ اپنے پیچھے گرو چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

دریکتا بالکل خاموش تھی۔ کافی دیر اُسے اسی پوزیشن میں بیٹھے گزر گئی تھی۔ اُس کا سر گھٹنوں پہ دھرا تھا اور سر مو حرکت کا احساس تک نہ تھا۔

اشعر شہر کو کافی پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اب وہ مضافاتی علاقے سے گزر رہا تھا۔ ” ایک بار ہی منزل پہ پہنچ کے دیکھیں گے آپ کو دریکتا صلیب۔ ” وہ اُس کے بے سدھ وجود کو غور سے تکتے ہوئے خود سے بولا۔

اگلے پندرہ منٹ میں وہ فارم ہاؤس پہنچ چکا تھا۔ یہ فارم ہاؤس اشعر کے دوست کا تھا۔ کبھی کبھار پنک کا ارادہ ہوتا تو سب دوست یہاں آ جاتے۔ کوئی فنکشن یا پارٹی اریج کرنی ہوتی تو اُن دوستوں کا سب سے پہلا انتخاب فارم ہاؤس

ہی ہوتا تھا۔ اشعر نے اپنے اقدام کے بارے میں اپنے دوست کاشف کو اعتماد میں لے کے بتا دیا تھا۔ اُس نے غلبوں سے ہر طرح کی مدد کی یقین دہانی کروائی تھی۔

اشعر چاہتا تو دریکتا کو براہ راست گھر بھی لے کے جاسکتا تھا پر اُس نے جان کے ایسا کرنے سے گریز کیا تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور چوکیدار وہاں موجود تھا۔ کاشف کے حکم پہ چوکیدار اشعر کے یہاں آتے ہی چلا گیا۔ کاشف نے اندرونی داہنی جانب کے دونوں کمرے صاف کروا دیئے تھے۔ اشعر نے گاڑی اندر لاکر روکی۔ اپنے طرف دروازہ کھول کے اتر اور دریکتا کی جانب آیا۔ اُس کا سر سابقہ پوزیشن میں گھنٹوں پہ دھرا تھا اور وہ گھنٹوں ہی بنی ہوئی تھی۔ اشعر کو عجیب سا احساس ہوا۔ اُس نے جھک کے دریکتا کا سر سیدھا کیا تو وہ پھر ڈھلک گیا۔ بے اختیار وہ ٹھنڈی سانس لے کے رہ گیا۔ دریکتا جانے کب سے بے ہوش تھی۔

اشعر نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ وہ اُس کے اوپر آ رہی۔ اُس نے کندھے پہ اٹھایا۔ دریکتا کے بالوں کی چوٹی اشعر کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ اور چادر زمین پہ ساتھ ساتھ گھسیٹ رہی تھی۔

”ادہ مائی گاڑیہ کیا مصیبت ہے“۔ وہ جھنجھلا سا گیا۔ اُس نے دریکتا کو صوفے پہ لٹا دیا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اشعر نے زور زور سے ہلایا پر اُس میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ اُس نے پھر دریکتا کا ناک اور منہ اپنی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ یہ کوشش کارگر ثابت ہوئی۔ اُس کی آنکھیں دھیرے سے کھلیں۔ وہ ہوش میں آ رہی تھی۔ اشعر دور ہٹ کے کرسی پہ بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کے منہ میں دہائی۔

اُس کا رخ اور نگاہیں دریکتا کی جانب ہی تھیں۔ اُس نے پوری آنکھیں کھول کے پہلے چھت کو دیکھا۔ اشعر درود یوار تھے۔ اُس کی ساری بے ہوشی دم توڑ گئی۔ اور وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔ اشعر اُس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ صوفے سے ٹانگیں نیچے لٹکتے ہی وہ وہیں ساکت ہو گئی۔ اُس نے اشعر کو دیکھ لیا تھا۔ وہی پرانا خوف عود آیا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوئی تھی۔ اشعر کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ اپنی گہری نگاہوں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی ڈسٹرب ہو رہی تھی۔

اسی اثناء میں اُس کا سیل فون گنگنانے لگا۔ ”آپ کے تایا کی کال ہے“۔ اُس نے عام سے انداز میں اُسے انفارم کر کے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اورنگزیب بغیر دعا سلام کے شروع ہو گئے۔ ”میں تم پہ دریکتا کے اغوا کے بارے میں پرچہ کٹوا دوں گا“۔ اشعر ہنسنے لگا۔

آپ مجھے اپنی منکوہہ کو ساتھ لے جانے کے جرم میں اندر کر دائیں گے۔ ہا ہا ہا۔ یہ شوق بھی پورا کر لیں۔ ”دیے مجھے یہ نہیں پتہ کہ اگر کوئی اپنی منکوہہ کو ساتھ لے جائے تو اُس پہ کون سی دفعہ لگتی ہے۔ آپ نے پرچہ کٹوانا ہے تو شوق سے کٹوائیں۔ فی الحال میری بیوی میرے پاس ہے“۔ اشعر نے سرشار انداز میں بولتے ہوئے اپنا کھانے کا رابطہ منقطع کر دیا اور موبائل بیڈ پہ اچھال دیا۔ دوسری طرف اورنگزیب بے بسی سے ہاتھ میں پکڑے اپنے کونڈے کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆

”میں ابھی جا رہا ہوں پپا کے پاس رات تک آ جاؤں گا۔ اگر آپ کا دل روٹنے اور چیخنے چلانے کو تیار ہو تو شوق سے کریں۔ یہاں ایک چوکیدار ہے اور وہ بھی اس وقت رہائشی حصے سے دور ہے۔ گونگا بہرا ہے اُس پہ اثر نہیں

یہ فریج پڑا ہے اس میں پانی، پھل اور بریڈ پڑی ہے۔ بھوک لگنے تو اسی سے کام چلائیں۔ لھانا میں اپنے ساتھ رات نوے آؤں گا۔ تب تک ریست کریں یا اچھی طرح ردھولیں“۔ اشعر اُسے دیکھ تک نہیں رہا تھا۔ باہر نکل کے اشعر نے دروازہ لاک کر دیا اور چابی جیب میں ڈال لی۔ اُس کے باہر نکلتے ہی دریکتا نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ وہ ساتھ ہی بچاؤ بچاؤ کی آواز بھی بلند کر رہی تھی۔ اشعر کو اُس کی بیوقوفی پہ ہنسی آ گی کیوں کہ اس دیرانے میں دو درونک اُس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ سوائے چوکیدار کے۔ وہ بھی اس وقت یہاں سے دور اپنے کوارٹر میں تھا۔ کاشف نے پہلے ہی اُسے کہہ دیا تھا کہ اشعر کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرنی۔

سیٹی پہ شوخ سی بڑھن بجاتے ہوئے اُس نے گاڑی اشارٹ کی۔ اُس کا پورا وجود فتح کے نشے سے سرشار تھا۔ دریکتا اب اُس کے رحم د کرم پہ تھی۔ اورنگزیب کی کال پھر آ رہی تھی۔ اُس نے دھیان نہیں دیا۔

ظاہر لغاری کو نائٹ ڈیوٹی کا بول کر اشعر نے اپنی غیر موجودگی کا اچھا جواز ڈھونڈا تھا۔ خود اُس نے پپا کے ساتھ کھانا کھایا اور دریکتا کے لیے ایک ریستورنٹ سے پیک کر دیا۔ کافی ٹائم ہو گیا تھا۔ اُس نے گاڑی کی اسپڈ بتدریج بڑھادی۔

چوکیدار اپنے کوارٹر میں تھا کیونکہ اُس کا گیٹ پہ رہنے کا جواز نہیں تھا۔ صاحب نے کہا تھا اُسے وہ مزے سے آرام کر رہا تھا۔ کمرے والی بی بی خود ہی رد پیٹ کے چپ ہو گئی تھی۔ چوکیدار کو تجسس تو تھا پر اُس نے زیادہ کرید مناسب تصور نہیں کیا۔

☆☆☆

صبح سے رات ہو گئی تھی۔ طیب رورو کے بے حال ہو رہا تھا۔ ذہین اُسے پہلے افیم دے کے سلاتی رہی تھی پر آج دریکتا کی غیر موجودگی میں اُس نے پھر وہ غلطی نہیں دہرائی۔ سب گھر والے انتہائی پریشان تھے۔ ادھر طیب نے رورو کے جان عذاب میں ڈالی ہوئی تھی۔ چھوٹا بچہ تھا دریکتا کے لاڈ پیار سے مانوس تھا اور اُس کی غیر موجودگی سے بے چین۔ شریں جھنجھلا رہی تھی۔ ”ارے کریں فون اشعر کو اور پوچھیں کہاں لے گیا ہے دریکتا کو“۔ ”ہاں جیسے وہ بتا دے گا ناں۔ اسی انتظار میں بیٹھا ہے وہ ہم پوچھیں اور وہ بتا دے“۔ اورنگزیب بڑی طرح اُسی پہ بگڑ گئے تو شریں اپنا سامنہ لے کے رہ گئی۔ ذہین دو بار طیب کو ماڑہ کے پاس لائی تو شریں اُس پہ غصہ ہونے لگی وہ بے چاری چپ ہوگی۔ طیب اُس سے چپ ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

دریکتا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے قالین پہ بیٹھی تھی۔ وہ رورو کے نڈھاں تھی طیب کس طرح رہا ہوگا اُس کے بغیر۔ اور باقی سب خاندان والے کس قدر پریشان ہوں گے۔ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ پپا کا کیا حال ہوگا۔ پورے گھر پہ کس قدر پریشانی طاری ہوگی۔ واقعی اشعر لغاری اچھا آدمی نہیں ہے۔ اگر اچھا اور با کردار انسان ہوتا تو اُسے کبھی بھی اس طرح نہ لاتا یہاں۔ دریکتا اُسے ریولوار نکالتے دیکھ کر ہی خوفزدہ ہو گئی تھی اور گاڑی میں اُس کے حواس اُس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ یہاں آبادی سے دور لے آیا تھا۔ جہاں اُس کی فریاد پہ کوئی کان دھرنے والا تک نہ تھا۔ وہ اس جگہ اکیلی تھی۔ اور

دریختا نے کھانا کھایا تو تھا پر برائے نام۔ لگتا تھا کھانے کو جیسے چکھا گیا ہے بس۔

”یہ پن کھلے لیں آرام آجائے گا۔ اُس نے دو گولیاں دریختا کے سامنے رکھ دیں۔ اُس نے میکا کی انداز میں اٹھا کے پانی کے ساتھ نگل لیں۔“

”نی الحال آپ زخمی ہیں مزید کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ابھی صرف سونے کا ہی کہوں گا۔ سو جائیں۔ باقی حساب کتاب پھر ہوں گے۔ بڑے اُدھار آپ کی طرف نکلتے ہیں۔“ اشعر طنز یہ انداز میں بولا۔ اُس نے شوز اور موزے اُتار کے بیڈ کے نیچے رکھے۔ اس سے پہلے کہ وہ شرٹ اُتارتا۔ اور نگزیب کی کال آگئی۔ اشعر کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ اُس نے سیل آف کر کے رکھ دیا۔

اُسے سخت نیند آرہی تھی۔ آج کا پورا دن بھاگ دوڑ میں گزارا تھا۔ اب وہ تھکا ہوا تھا۔ جسم آرام مانگ رہا تھا۔ وہ تو سو گیا پر دریختا کچھ تو پاؤں کی تکلیف اور کچھ اپنی تکلیف دہ سوچوں کی وجہ سے بھی جاگتی رہی۔

☆☆☆

طیب رات بھر وقفے وقفے سے روتا رہا۔ وہ روتا بھی تو بہت بلند آواز میں تھا۔ سب کی نیند ڈسٹرب ہو رہی تھی۔ اس لیے شریں صبح کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی تھی۔ اُس نے اور نگزیب کو مشورہ دیا کہ طاہر لغاری کو فون کریں اور اُسے اشعر کے کارنامے کا بتائیں تاکہ وہ دریختا کے سلسلے میں اُس پہ دباؤ ڈال سکیں۔

پورا اور نگزیب اس تجویز سے متفق نہیں تھا۔ اشعر نے اپنی من مانی کرنی تھی۔ دریختا اُس کے پاس تھی۔ بھلا طاہر لغاری کیا کر سکتے تھے۔

اور نگزیب کی لاکھ کوشش کے باوجود اُسے ناکامی ہوئی تھی دریختا کی تلاش میں جانے اشعر نے اُسے کہاں رکھا ہوا تھا۔

یہ بات تو طے شدہ تھی کہ دریختا اس وقت اشعر کے گھر میں موجود نہیں تھی۔ اور نگزیب نے پتہ بھی کروا لیا تھا اُس کے گھر کے بارے میں۔

باقی اُن کے ذہن میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں وہ دریختا کو رکھ سکتا تھا۔ طیب کی وجہ سے اور دریختا کے اغوا کی وجہ سے عجیب سے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ سارا بنا بنایا کھیل بگڑ کے رہ گیا تھا۔ انہوں نے جو سوچا تھا ویسا ہوا ہی نہیں۔ دریختا کو اشعر طلاق دے دیتا تو اور نگزیب اُس کی شادی عاشر سے کر دیتے۔ دریختا کا شوہر ہونے کے رشتے سے سب کچھ عاشر کا ہو جاتا۔ پھر انہیں کوئی الزام نہیں دے سکتا تھا کہ انہوں نے ظلم و زبردستی سے دریختا کی جائیداد پہ قبضہ کیا ہے۔ سب کچھ قانونی ہوتا۔

یہ بات تو طے تھی کہ انہوں نے آسانی سے ہار نہیں مانتی تھی۔ مگر اس کے لیے دریختا کا جلد از جلد بازیاب ہونا ضروری تھا۔ اُسے گھر سے غائب ہوئے بلکہ اغوا ہوئے ایک دن اور ایک رات گزر چکی تھی اور نیا دن چڑھ آیا تھا۔

اس وجہ سے ماڑہ نے بھی اپنے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اب نہ دریختا کا کچھ پتہ چل رہا تھا اور نہ طیب کے چڑچڑے پن میں کمی ہو رہی تھی۔ اسی حساب سے شریں کا پارہ ہائی ہو رہا تھا وہ اشعر لغاری کو کون سے دے رہی تھی۔

وہ اتنی آسانی اور آرام سے اُن کے سامنے دریختا کو ساتھ لے گیا وہ کچھ کہی نہیں پائے۔ شریں طعنہ دیتی تھی اور نگزیب کو کہ آپ کو مسلح ہو کے جانا چاہیے تھا ورنہ اشعر کبھی بھی دریختا کو ساتھ لے جانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ وہ غصے میں

اشعر لغاری کو اُسے یہاں بند کر کے جاتے ہوئے ذرہ بھر رحم تک نہ آیا کہ وہ ایک کمزور اور نازک دل لڑکی ہے۔ کہیں خرد کے مارے مر ہی نہ جائے۔

دریختا نے دروازے اور کھڑکیوں پہ زور آزمائی کی تھی پر اُسے ناکامی ہوئی کیونکہ دروازہ اور کھڑکیاں منہ بند لکڑی سے بنی تھیں اور اُن میں ایک دراڑ تک نہ تھی۔ تھک ہار کے وہ بیٹھ گیا اور سب گھروالوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب آنسو نئے سرے سے اُمنڈے آرہے تھے۔

اچانک باہر کسی گاڑی کے ناز چرچر آئے۔ دریختا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہ رہی تھی اور اُس کے پاس ایک موقع تھا۔ گاڑی میں آنے والا یقیناً اشعر لغاری تھا۔ کیونکہ اُس نے کہا تھا میں رات کو آؤں گا۔ دریختا کے ذہن میں ایک منصوبہ آیا۔ اُس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ سامنے ٹیبل لیمپ پڑا تھا۔ اُس نے ہاتھوں میں لیا۔ اچھا خاصا بھاری تھا۔ وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی کہ جیسے ہی اشعر اندر آئے وہ بے خبری میں اُس کے سر پر دے مارے اور یہاں سے بھاگ نکلے۔ اشعر لغاری کے تیور اُسے چھوڑنے والے نہیں لگ رہے تھے۔ اگر وہ اپنے ارادے میں ناکام ہو بھی گئی تو اُسے یہ دکھ تو نہیں ہو گا نا کہ اُس نے کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

گاڑی کا دروازہ کھول کے پیک کیا ہوا کھانا اشعر نے ایک ہاتھ میں پکڑا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں کمرے کی چابی تھی۔ اُس نے اسی طرح ایک ہاتھ سے چابی کی ہول میں گھمائی۔ دریختا دروازے کے پیچھے دونوں ہاتھوں میں وزنی لیمپ پکڑے کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا دریختا کا ہاتھ کسی خوف کے احساس سے کانپا اور لیمپ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اشعر بال بال بیچ گیا پر دریختا کے لبوں سے نکلنے والی آوازیں بہت دردناک تھی۔ وزنی لیمپ اُس کے پاؤں پہ لگا تھا۔ دروازے کے پاس ہی لڑکھڑا کے گرمی۔

اشعر اندر کا منظر دیکھتے ہی بغیر کہے سنے سب کچھ جان گیا تھا۔ دریختا کے پاؤں سے خون نکل رہا تھا۔ اشعر نے کھانا دہیں رکھا اور بیٹھ کے اُس کا پاؤں بغور دیکھا۔ بظاہر کوئی گہری چوٹ نظر نہیں آرہی تھی۔ پر خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ یہاں بینڈیج کا سامان موجود نہیں تھا البتہ ہاتھ روم کی کینٹ میں نچر آئیوڈین اشعر کول گئی۔

اُس نے زخم صاف کیا اور پھر دریختا کی ہی چادر کے کونے کو پھاڑ کر پیٹی سی بنا کے اُس کے پاؤں پہ باندھی اٹھیے بیڈ تک چلیے۔ کافی سزا لگی ہے آپ کو اپنے کیے کی۔ اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں آپ خود ہی گر گئی ہیں۔ اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑا تھا۔ دریختا نے نظر انداز کر دیا تو اُس نے بُرا نہیں منایا۔ بلکہ کرسی پہ مزے سے بیٹھ گیا۔ خود ہی کسی نہ کسی طرح اٹھی اور صوفے تک جانے میں کامیاب ہو گئی۔

اشعر نے کھانا پلیٹوں میں نکالا اور اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ”کھالیں کھانا۔ آپ نے یقیناً صبح سے کچھ نہیں کھا ہے میں اتنے میں چوکیدار سے پن کھرا پوچھ لوں اگر مل جائے تو۔“

وہ اس بار دروازہ لاک کے بغیر باہر گیا۔ اُسے سو فیصد یقین تھا دریختا زخمی پاؤں کے ساتھ کہیں نہیں جا سکتی اُس کا یقین بے جا نہیں تھا۔

خوش قسمتی سے پن کھرا لگی چوکیدار کے کوارٹر میں فریج میں پڑی تھی۔ اشعر اُسے لے آیا وہ خود جان بوجھ کافی دیر لگا کے آیا تھا کہ اُس کی غیر موجودگی میں دریختا اچھی طرح کھانا کھا لے۔

good

شریں کو ناقص العقل عورت کا خطاب دیتے۔

اُن دونوں کی اپنی کھٹ پٹ شروع تھی۔ اور نگزیب یکسوئی سے کچھ بھی نہیں کر پار ہے تھے۔ شریں بے صبری ہو رہی تھی۔ اُس کا سارا زور اسی بات پہ تھا کہ جلد از جلد در یکتا کو لے کے آئیں۔ اور نگزیب اُسے غصے سے دیکھ کر رہ جاتے۔ وہ ایسے ہی تو شریں کو ناقص العقل نہیں کہتے تھے نا۔ کتنے آرام سے حکم دیتی تھی کہ در یکتا کو لے آئیں۔ جیسے وہ شادی کے بعد بیاہ کے اپنے سسرال گئی ہوئی ہے۔ اشعر لغاری انا پسند اور غیرت مند نو جوان تھا بھلا وہ اپنی بیوی کو اُن کے پاس دوبارہ واپس آنے دے گا کبھی بھی نہیں۔ وہ پولیس میں ابھی تک اس واقعے کی رپورٹ تک درج نہیں کروا پائے تھے۔ اشعر ٹھیک ہی کہتا تھا وہ کیا ایف آئی آر درج کروائیں کہ اشعر لغاری اپنی منکوہہ کو زبردستی گن پوائنٹ پہ ساتھ لے گیا ہے۔ اس واقعے کا اُن کے ڈرائیور، عاشر اور شریں کے علاوہ کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔ وہ زیب داستان کے اضافے کے ساتھ ایف آئی آر درج کر دیا بھی دیتے تو کیا ہوتا۔ وہ ایف آئی آر میں درج کر داتے کہ اُس کے پاس اسلحہ تھا اور اُس نے سرعام ہمیں ڈرایا دھمکایا تو اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھا۔ وہ پولیس آفیسر تھا اُس کے پاس اسلحہ ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی وہ در یکتا کو عین سڑک سے اٹھا کے اپنے ساتھ لے گیا اس بات کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ دانت پینے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بس ایک بار در یکتا کسی طرح اُس کے شکنجے سے آزاد ہو جاتی تو پھر اشعر قیامت تک اُس کی گرد بھی نہیں پاسکتا تھا۔ اُنہوں نے انتہائی حد تک سوچ رکھا تھا۔

☆☆☆

ملجکا ملجکا سا اُجالا تھا جب در یکتا کی آنکھ کھلی۔ اشعر کو نے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ در یکتا کا دل تنفر سے بھر گیا۔ ”ہونہہ دکھاوے کی نماز پڑھتا ہے یہ دو نمبر انسان“۔ اُس نے دل میں خود سے کہا۔ اشعر نے نماز پڑھ کے مصلے اُٹھایا۔ در یکتا نے رُخ پھیر لیا۔ وہ اُس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اشعر نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ چونک کر کوناشتے کے لیے کہنے چلا گیا۔ اس وقت فارم ہاؤس میں چونکدار کے علاوہ کوئی اور ملازم نہیں تھا چنانچہ اُلٹا سیدھا ناشتہ اُسی نے بنایا اور ساتھ یہ بھی خوشخبری سنائی ایک دو گھنٹے تک گل زرین اور اُس کی بیوی بھی آجائے گی پھر کھانے پینے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ وہ دونوں بھی ادھر ہی کام کرتے تھے۔ کچھ دن کی چھٹی پہ گاؤں گئے تھے۔ چونکدار نے چائے کے ساتھ ٹوسٹ سینکے تھے ساتھ انڈے تھے۔

اشعر خود ناشتے کی ٹرے لیکر واپس آیا۔ در یکتا کمرے میں کہیں نہیں تھی۔ صوفے کے پاس اُس کا صرف ایک جوتا پڑا تھا۔ اشعر نے کل جب اُسے اپنے ساتھ زبردستی گاڑی میں بٹھایا تھا تو اُس کا ایک جوتا وہیں کہیں اتر گیا تھا اور ایک پاؤں میں رہ گیا تھا۔ اس ایک اکلوتے جوتے کی مالک کمرے سے غائب تھی۔ زخمی پاؤں کے ساتھ وہ کہاں جا سکتی تھی اتنی صبح۔ اشعر نے یہی سوچتے ہوئے ہاتھ روم کے دروازے کو چیک کیا تو وہ اندر سے بند تھا۔

وہ واپس آ کے بیٹھ گیا۔ در یکتا منہ ہاتھ دھو کے باہر نکلی اور صوفے پہ لالتعلق سی ہو کے بیٹھ گئی۔ ”ناشتہ کر لیں میں آپ کے منہ میں نوالے ڈالنے والا نہیں ہوں“۔ اُس نے اپنے کپ میں چائے ڈالی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔ وہ اُسی طرح بیٹھی رہی۔ کل رات بھی اُس نے برائے نام کھایا تھا اور اب بھی اُس کا موڈ کچھ ایسا ہی نہ کھانے والا لگ رہا تھا۔

اشعر نے دوسرے کپ میں اُس کے لیے چائے ڈالی دو توس اور ایک انڈا پلٹ میں رکھا اور اُسی کے ساتھ بیٹھ

گیا۔ ”ناشتہ شروع کریں۔ میں اپنی بات تیسری مرتبہ دہرانے کا عادی نہیں ہوں“۔ در یکتا کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا پر سامنے ساتھ بیٹھے اشعر لغاری کا لہجہ نظر انداز کرنے والا نہیں تھا۔

اُس نے آنسوؤں کے ساتھ چائے حلق میں اتاری اور آدھا توس بمشکل کھا پائی۔ اشعر نے اور نگزیب انکل کا نمبر ملایا اور در یکتا سے بات کرنے کے لیے کہا۔ وہ خود فون اُسے دے کر اُس کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ در یکتا بات کرتے ہی رو پڑی۔

”تایا پلیز مجھے لے جائیں اپنے ساتھ“۔ دوسری طرف سے طیب کے رونے کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ ذہین کی گود میں تھا اور حسب عادت گلا پھاڑ پھاڑ کے رو رہا تھا۔ در یکتا کی حساس سماعتوں تک اُس کی آواز بخوبی پہنچ رہی تھی۔ اُس کا جی چارہا تھا وہ جھپٹ کے طیب کو سینے سے لگا لے۔ وہ اُس کا رونا اُس کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اس تھوڑے سے عرصے میں اُس کے معصوم اور بے ضرر وجود کی عادی ہو گئی تھی۔ اور اس دُکھ سے بھی اس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھتی تھی کہ مائرہ نے بھی شادی کر لی تھی۔ طیب کا وجود اُس کے شوہر اور خود شائد مائرہ کو بھی گوارا نہیں تھا۔

”تم کہاں ہو در یکتا آرام سے بات کر د میرے ساتھ“۔ اور نگزیب کی بیجانی آواز ابھری۔

”مجھے نہیں پتہ میں کہاں ہوں“۔ وہ پھر سے رو پڑی۔ اشعر نے اُس کے ہاتھ سے اپنا سیل فون لے لیا اور آف کر دیا۔

”آپ فی الحال ریسٹ کریں میں ایک کام سے جا رہا ہوں۔ دروازہ لاک کر جاؤں گا کیونکہ مجھے آپ پہ اعتبار نہیں ہے“۔ اُسے روتے دھوتے چھوڑ کے وہ خود چلا گیا۔

کچھ ضروری کام تھے جو اُس کی موجودگی میں ہی ممکن تھے۔

☆☆☆

طیب کی حالت بگڑ گئی تھی اُسے تیز بخار تھا۔ ذہین اُسے سنبھال سنبھال کے خاموش کروا کر داکے خود بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ مائرہ کو جانے کیسے رحم آ گیا تھا۔ ذہین نے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے کہا تو وہ راضی ہوگی۔ دل میں یہ احساس جاگزیں تھا کہ طیب میری اولاد ہے۔ در یکتا نہیں ہے جو اس کا خیال رکھے۔ بے چارہ رورو کے نڈھال ہو رہا ہے۔ ذہین نے ہی طیب کو اُٹھایا تھا وہ صرف اُس کے ساتھ گئی تھی۔

جلدی میں مائرہ سیل فون ساتھ لے جانا بھول گئی۔

باسط کی کال آئی تو سائرہ نے ریسیو کر کے پوچھنے پہ مائرہ کا بتا دیا کہ وہ طیب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہے۔

باسط نے کہا جب وہ آجائے تو مجھے کال کر لے اُسے کہہ دینا۔

گھر آنے پہ سائرہ نے باسط کا پیغام اُسے پہنچا دیا۔

مائرہ کے دل میں اٹھل پھل ہونے لگی جانے اُس کی کاری ایکشن کیا ہونا تھا۔ سائرہ بے وقوف نے کیوں بتایا تھا بھلا اُسے کہ وہ طیب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہے۔

مائرہ نے اسی خوف کے ساتھ باسط کو کال کی۔ وہ سلام دعا کے بغیر برسنا شروع ہو گیا۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا ناں ماضی بھول جاؤ۔ اور اپنی محبت اپنا ماتا میرے بچوں کے لیے محفوظ رکھو۔ تمہیں

خیر یہ جزہ بھائی کا اپنا مسئلہ ہے۔ شریں کے سامنے ابھی ماثرہ اور اُس کی خوشیاں تھیں۔

”تم کل تیاری رکھنا میں خود تمہیں گھر چھوڑ کے آؤں گی ساتھ حمزہ بھائی سے بات بھی کروں گی باسط کو جھاڑیں۔“

شریں نے ماثرہ کو ساتھ لگا کر تسلی دی تو کچھ سکون ملا اُسے۔ مگر یہ جاننے کے بعد کہ باسط بیٹا خالہ کا بیٹا نہیں ہے۔ اُس کے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ آج سے پہلے تک یہی سمجھتی آئی تھی کہ باسط بیٹا خالہ کا بیٹا اور اُس کا کنزن ہے۔

”بیٹا خالہ بڑی ہمت والی ہیں پر ائی اولاد کو اپنا لیا۔“ ماثرہ نے حیرانی سے سوچا۔ اور خود باسط کیا تھا کسی اور نورت کا بیٹا۔ اُن کی سوتن کا بیٹا جسے خالہ نے سگی اولاد سے بڑھ کے چاہا۔ جانے باسط کا دل اتنا تنگ کیوں تھا جو طیب کو قبول نہیں کر پارہا تھا۔

ماثرہ یہی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

سب کچھ ٹھیک تھا۔ طاہر لغاری کو کچھ پتہ نہیں تھا اور نہ ہی اورنگزیب یا عاشر میں سے کسی نے اُنہیں اطلاع دی تھی۔ اشعر نے دریکتا کے لیے کچھ کپڑے خریدے۔ دو دن سے وہ ایک ہی سوٹ میں ملبوس تھی اور چادر کا کونا بھی پھٹا ہوا تھا۔ ایک جوتا بھی نہیں تھا۔ اشعر نے اندازے سے اُس کے لیے سینڈل لیے۔ زنا نہ شاپنگ کا اُسے کوئی خاص تجربہ نہیں تھا بس جو سامنے آیا اُس نے لے لیا۔

اُس کی واپسی مختلف کاموں کو پیناتے ہوئے رات کو ہی ہوئی۔ دریکتا بیٹھی ہوئی تھی۔ دو دن سے اُس نے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔ نہ اُس کا جی چاہتا تھا۔ عجیب اُجڑے فرار جیسی حالت تھی اُس کی۔

کل کی طرح اشعر آج بھی کھانا پیک کر داکے ساتھ لایا تھا۔ ”آپ کا پاؤں ٹھیک ہے۔“ اُس نے آتے ساتھ ہی پوچھا۔ دریکتا نے کوئی جواب نہیں دیا جیسے سنا ہی نہ ہو۔ اشعر نے دوبارہ نہیں پوچھا۔ ”کھانا کھا کے کپڑے بدل لیں یہ میں ساتھ لایا ہوں اور اپنا حلیہ ٹھیک کریں۔ میں نفیس ذوق کا مالک ہوں۔“ اشعر کا اشارہ اُس کے بکھرے بالوں کی جانب تھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اُس نے پہلی بار خود سے بات کی تھی۔ ”اوکے نہ کھائیں بھوک نہیں ہے تو..... خیر آپ کے تایا جان کی کالز سارا دن آتی رہی ہیں۔ آپ سے کوئی بات کرنا چاہے ہیں یہ لیں بات کریں میں ذرا فریٹش ہو اؤں۔“ وہ اپنا سیل فون اُس کی جانب اُچھال کے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

دریکتا کو نمبر معلوم تھا تایا اور انگزیب کا۔ اُس نے نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پہ ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ تایا اور انگزیب خود ہی تھے۔ دریکتا بات کرتے ہوئے رو پڑی۔

”طیب کی حالت بہت خراب ہے آج بھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ تم اشعر سے کہو اُسے بتاؤ طیب کی حالت کا۔ کسی طرح اُسے راضی کر لو۔ طیب کسی سے بھی چپ نہیں ہو رہا ہے۔“ تایا اور انگزیب بتا رہے تھے۔ وہ اُسے کچھ ہدایات دے رہے تھے وہ چپ ہو کے سن رہی تھی۔

اتنے میں اشعر نہا کے آگیا اور سیل فون اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور کان سے لگا لیا۔ ”اُس کی منت کرو۔ بتاؤ

میری بات سمجھ نہیں آتی۔ مجھے نفرت ہے شاہ زیب کے بچے سے۔ میں جب اُن لمحات کا تصور کرتا ہوں جب تم اُس کے ساتھ ہوتی تھی تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ یوں لگتا ہے میں ریزہ ریزہ ہو کے فضا میں بکھر جاؤں گا۔ میرا روم روم جلتا ہے۔ اب تم ادھر ہی بیٹھو اپنی ماں کے گھر اور اپنے ماضی کی نشانی کو سینے سے لگا کے رکھو۔ میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔“

باسط نے اس کے بعد کھٹ سے فون بند کر دیا۔ ماثرہ نے بے تابی سے دوبارہ نمبر ملایا۔ باسط نے بڑی کر دیا اُس نے دس بارہ بار ایسے ہی کیا پر باسط کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا۔ ماثرہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے وہ سائرہ پہ چڑھ دوڑی۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی باسط کو یہ بتانے کی میں طیب کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہوں۔“ اگر بتا دیا تو اس میں اتنا غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔ اُنہوں نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ پتہ نہیں آپ سب سچ کا سامنا کرنے سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔ اپنی اولاد کو آپ باسط بھائی کے ڈر سے سینے سے نہیں لگاتیں ادھر امی ہیں وہ چاہتی ہیں کہ دریکتا طیب کو سنبھالے اور آپ آرام سے زندگی گزاریں۔ اور ادھر دریکتا اپنے شوہر سے ڈرتی ہے۔ مجھے تو آپ سب کی سمجھ نہیں آتی۔ سائرہ نے لا اُبالی پن سے بڑی گہری بات کر دی تھی۔

”بند کرو اپنی تقریر۔ میری خوشیوں سے تو تمہیں کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔“ ماثرہ اونچا اونچا رونا شروع ہو گئی تو شریں حواس باختہ بھاگتی آئی کہ جانے کیا ہو گیا ہے جو ماثرہ یوں رو رہی ہے۔ سائرہ ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اور ماثرہ رو رہی تھی۔

”ارے کیا ہوا ہے مجھے بھی تو بتاؤ۔“ اُنہوں نے سائرہ کے کندھے جھنجھوڑے۔

”ہونا کیا ہے باسط کی کال آئی تھی اور.....“ ماثرہ الف تاپے بتانے لگی۔

شریں سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔ ”یہ مصیبت میرے سر آ کے زنی تھی۔ ارے مر کے بھی شاہ زیب تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔ میں نے تمہیں کتنی بار کہا کہ طیب کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارے جن کا خون ہے سنبھالیں۔ ہم نے ٹھیک نہیں لے رکھا ہے پر ائی اولاد پالنے کا۔“ وہ یہ بات کہتے ہوئے بھول گئی تھی کہ شاہ زیب عمر کا بیٹا ہے اور عمر اور انگزیب کا بھائی ہے۔

”میں تمہیں خود چھوڑ کے آؤں گی باسط ہوتا کون ہے میری بیٹی کو یہ بات کہنے والا میں حمزہ بھائی سے کہوں گی اپنے لاڈلے کو سمجھائے۔“ شریں کبیدہ ہو رہی تھی۔

”آپ بیٹا خالہ سے کہیں باسط خالہ کے بہت قریب ہے۔“

ماثرہ بولی ”ارے قریب کیوں نہ ہو گا میری بہن نے جان لڑادی ہے پر ائی اولاد کے لیے۔ اپنا بیٹا بنا کے رکھا لاڈ کیا۔“ بے خیالی میں شریں کے منہ سے نکل تو گیا پر اب پیچھتا رہی تھی۔ شریں کے پاس ماثرہ قریب ہو کے بیٹھ گئی۔ امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں باسط اور پر ائی اولاد۔ وہ حیران تھی۔ ”ہاں ماثرہ باسط حمزہ بھائی کی پہلی بیوی سے ہے۔ یہ دو سال کا تھا جب وہ فوت ہوئی۔ حمزہ کراچی جا کے سیٹل ہو گیا۔ سب رشتہ داروں سے دور اور بیٹا سے بھی کہا کہ باسط پہ یہ راز کھلنا نہیں چاہیے کہ تم اس کی سگی ماں نہیں ہو۔ میری بہن یہ آفرین ہے اُس نے پردر ش کا حق ادا کر دیا۔“

شریں نے سب کچھ بتا دیا۔ بات اُن کے منہ سے نکل گئی تھی اب چھپانے کا فائدہ نہیں تھا۔ ویسے اُن کے خیال میں حمزہ بھائی کو یہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی باسط سے۔ زندگی کے کسی موڑ پہ کسی ذریعے سے اُسے یہ راز پتہ چلتا تو اُسے ٹھیس لگتی تھی لازمی۔



طیب کا۔ انہیں نہیں پتہ تھا کہ اب فون اشعر کے پاس ہے۔ وہ بولا تو انہیں پتہ چلا۔ ”دریکتا کو واپس چھوڑ جاؤ۔ سارے خاندان میں بدنامی ہو رہی ہے ہماری کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے ہم۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔ اُسے چھوڑ دو۔ ہمارے گھر میں مسائل بڑھ رہے ہیں۔ دریکتا عمر کی دیکھ بھال کرتی تھی وہ مانوس تھا اب کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ تمہیں ہم سب پر رحم نہیں آتا کیا۔“ وہ جذباتی بلیک ملینگ پہ اتر آئے تھے۔

”آپ کی بدنامی کیوں ہو رہی ہے کیوں آپ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ دریکتا میری بیوی ہے میں اُس کا جائز، شرعی شوہر ہوں میرے پاس ہے وہ۔ کسی غیر کے پاس نہیں جو آپ کی بدنامی ہو رہی ہے۔ باقی اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ کے مسائل ہیں جس طرح بھی اُن کو حل کریں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“ اشعر نے جھنجھلاتے ہوئے کال بند کر دی اور اپنے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ دریکتا نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جس کی توقع اشعر نہیں کر پاتا تھا۔

اُس نے گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اشعر کے پاؤں پکڑ لیے۔

”پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ طیب بہت سخت بیمار ہے۔ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بارہ بھابھی بھی شادی کر کے اپنی دنیا میں لگن ہو گئی ہیں۔ کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔ پیادہاں! کیلے پڑے ہیں۔ میری ذمہ داری ہیں۔ پلیز آپ کو خدا کا واسطہ مجھے جانے دیں۔ مجھے یہاں اس طرح بند کر کے آپ کو کیا ملے گا۔ طیب کو کچھ ہو گیا تو.....“ اُس کے بعد دریکتا کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اُسے کوئی اور بات کی ہی نہیں جا رہی تھی۔

اشعر نے اُس کے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑوائے۔ ”اوپر بیٹھ کے بات کریں۔ میں یہ سب پسند نہیں کرتا جس طرح ابھی آپ نے کیا ہے۔“ اشعر کا اشارہ پاؤں پکڑنے کی جانب تھا۔ ”میں خلع کا کیس واپس لے لوں گی۔ رخصت ہو کے آپ کے پاس آ جاؤں گی۔ بس ایک بار مجھے یہاں سے جانے دیں۔“

اُس کی آنکھوں سے اشک باری ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ امید بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے یقین ہو اس بار وہ انکار نہیں کرے گا۔

”آپ کو میں یہاں سے جانے دوں تاکہ آپ پھر میرے خلاف عدالت میں کھڑی ہو جائیں اپنے تاپا کے ساتھ۔ میری مردانگی کا مذاق اڑائیں سرعام۔ نہیں میں نہیں ہونے دوں گا۔“ آپ پلیز میرا یقین کریں میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔ میں خلع کا کیس واپس لوں گی اور رخصت ہو کے آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولی۔

”مجھے آپ کا آپ کے تاپا کا اعتبار نہیں ہے ہاں آپ اگر اسٹامپ پیپر پہ مجھے یہ لکھ دیں تو میں سوچ سکتا ہوں آپ کی واپسی کا۔ ورنہ نہیں۔ آپ میرے پاس ہی رہیں گی۔“ میں لکھ کے دینے کے لیے تیار ہوں جو آپ کہہ رہے ہیں بس مجھے چھوڑ آئیں۔“ لجاجت کوٹ کوٹ کے بھری تھی اس سے اُس کے لہجے میں۔ ”خیر کل اسٹامپ پیپر مل جائے گا۔ سائن کر دیجیے گا اپنے مزید اضافے کے ساتھ کہ اگر آپ کے تاپا یا خاندان کا کوئی فرد آپ کے نکاح اور رخصتی کی راہ میں حائل ہو تو آپ کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لائیں گی اور میرا یعنی اپنے شوہر کا ساتھ دیں گی۔“ مجھے منظور ہے ہر بات۔ وہ جلدی سے یوں بولی جیسے اشعر اپنا ارادہ بدل دے گا۔ ”آہم آہم خاص فرمانبردار قسم کی بیوی ہیں آپ۔ کل بتاؤں گا اتنی جلدی نہ کریں۔ سوچ لیں۔ میں کچھ بھی منظوری کے لیے وے سکتا ہوں۔“ اشعر کے لبوں پر یہ معنی خیز

مترج دہل

اسکراہٹ بھی ہوئی تھی۔

دریکتا اس مسکراہٹ کو کوئی نام نہ دے پائی۔

”اب آپ مطمئن ہیں تو کھانا کھالیں۔ کل واپس چھوڑ آؤں گا آپ کو۔“

”ج“ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کیا واقعی وہ اُسے کل چھوڑ آئے گا۔ یعنی وہ پھر سے اپنوں کے پاس ہوئی۔ یہ

تصویر ہی کتنا سرد آگئیں تھا۔ اُس کی بھوک مارے خوشی کے اڑ گئی پھر بھی اُس نے اشعر کی وجہ سے کھانا کھایا۔ عجیب سا

آدمی تھا کہیں اپنا ارادہ بدل ہی نہ دیتا اگر وہ اُس کے کہنے پہ کھانا نہ کھاتی تو.....“

اُس نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔

اشعر غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی خوشی میں اتنی لگن تھی کہ محسوس ہی نہ کر پائی۔ اشعر اسی بیڈ پہ سو گیا۔ دریکتا بہت

دیر بعد سوئی۔ کل کا دن اُس کے لیے خوشی لے کے آنے والا تھا۔

☆☆☆

دریکتا کے ہاتھ میں اسٹامپ پیپر تھا۔ اُس پہ لکھی تحریر اُسے حرف بہ حرف ازبر ہو گئی تھی۔ اُس نے کتنی بار پڑھا

تھا۔ ”اچھی طرح سوچ کے سائن کیجیے گا بعد میں سوچنے کی گنجائش نہیں ہوگی آپ کے پاس۔“ وہ پیچھے سے جھک کے بولا۔

دریکتا کرسی پہ بیٹھی تھی۔ اشعر عین اُس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ”میں نے سوچ لیا ہے۔ پین دیں میں سائن کر دوں۔“ وہ دانستہ

ظور پر اور بھی آگے کی طرف ہو گئی۔ اشعر نے اُسی پوزیشن میں پین جیب سے نکال کے اُس کے ہاتھ میں دیا۔ دریکتا نے

لرزتے ہاتھوں سے پین کو اچھی طرح دبا کے سائن کر دیئے۔ اشعر اُس کے کندھوں پہ جھکا ہوا اُس کے ہاتھوں کی حرکت کو

بخوردیکھ رہا تھا۔

دریکتا نے دونوں کاغذوں پہ سائن کر دیئے۔ اشعر پیچھے سے اُس کے سامنے آ گیا ایک اسٹامپ پیپر اُس نے

اپنے پاس جیب میں ڈال لیا اور نقل دریکتا کی طرف بڑھائی۔ ”یہ آپ رکھ لیں۔ اپنے تاپا جان کو دکھا دیجیے گا اصل میرے

پس رہے گی۔“ اُس نے لے کر رکھ لیا اور کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اشعر اُس کے سامنے کھڑا تھا اُسے بغور دیکھا۔ اُس نے

اچانک دریکتا کو بانہوں میں بھر لیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ اُس کے لبوں سے نکلی۔ ”نہیں“ اشعر نے

اُس کے ہونٹوں پہ اُننگی رکھ دی۔ ”میں نے سائن کرنے سے پہلے پوری طرح سوچنے کا موقعہ دیا تھا۔ آپ نے کہا تھا مجھے

سب منظور ہے تو اب یہ احتجاج کیسا۔“ اُس نے اپنے اور دریکتا کے درمیان موجودہ فاصلے کو کچھ اور بھی کم کر دیا۔ ”نہیں

نہیں“ دریکتا نے اُسے خود سے دور کرنا چاہا۔ ”یہ ضروری ہے تاکہ آپ کو اپنا وعدہ یاد رہے۔“ مجھے یاد رہے گا سب کچھ۔“

دریکتا کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔ ”او کے پھر ٹھیک ہے اگر یاد رہے تو.....“ اشعر کے بازوؤں کی گرفت

ڈھیلی ہوگی۔ وہ تڑپ کے دور ہوئی اور اپنی اٹھل پھٹل ہوتی سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اشعر نے پھر کوئی مزید بات نہیں کی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ دریکتا بہت تیزی سے سائیڈ پہ ہوئی۔ اس حد

درجہ احتیاط پہ اشعر مسکرا دیا۔ ”اتنا بڑا ہوں میں۔“ وہ مصنوعی تاسف سے خود کو دیکھتے ہوئے بولا۔

دریکتا نے جان بوجھ کے دروازے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”چلیں آئیں میں گاڑی اشارت کرتا ہوں۔“ اس بار اُس کے قدموں میں بجلی کی سی تیزی تھی۔ دریکتا ساتھ

ساتھ تھی اُس کے۔

واپسی کا سفر شروع تھا۔

اشعر اُس کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے گیٹ پہ متعین چوکیدار کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کسی اجنبی شخص کے لیے گیٹ کھولے اور اُسے گھر کے اندر آنے دے۔ پر گاڑی میں دریکتا کے ساتھ بیٹھے اُس نوجوان کی شخصیت ایسی تھی کہ چوکیدار کو بغیر کوئی سوال پوچھے گیٹ کھولنا پڑا۔

دریکتا جب تک رہائشی حصے تک پہنچی سب کو اُس کی آمد کا پتہ چل چکا تھا۔

نوزیہ، فرح، شریں، ہائرہ، سائرہ اور نگزیب نوید سب ہی تو موجود تھے۔ دریکتا گھبرا ہی گی۔

اشعر اُس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں آیا۔ پہلی بار دریکتا کو اُس کی موجودگی سے ڈھارس ملی۔ ورنہ سب کتنی عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ گھر سے بھاگ کے اشعر کے ساتھ گی ہو۔

”تمہیں تو میں دیکھ لوں گا“۔ اور نگزیب اشعر کو کھانے جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

شریں نے ہاتھ دبا کے اشارہ کیا کہ بات نہ بڑھائیں جب وہ دریکتا کو خود یہاں لے آیا ہے تو۔ اشعر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ کیونکہ کسی کے رویے میں گرجوشی نہیں تھی۔ وہ کسی گرجوشی کی توقع کر بھی نہیں رہا تھا۔

”اوکے انکل انشا اللہ بہت جلد ملاقات ہوگی۔ پاپا آپ کے پاس آئیں گے شادی کی تاریخ لینے۔ تب تک میری بیوی میری امانت کی صورت میں آپ کے پاس رہے گی“۔ اُس نے اور نگزیب سے زبردستی ہاتھ ملایا۔

وہ ہکا بکا اُس کے الفاظ پہ غور کر رہے تھے۔ وہ کیا کہہ گیا تھا۔ اور نگزیب تو سمجھ رہے تھے کہ اُس نے ہار مان لی ہے تب ہی دریکتا کو خود یہاں چھوڑ کے گیا ہے۔

☆☆☆

دریکتا کو سب گھیرے بیٹھے تھے۔ شریں کو عجیب سی کھد بھد لگی ہوئی تھی۔ دریکتا کے جسم پہ وہی کپڑے تھے جو اغوا والے دن اُس نے پہنے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے جنہیں ہاتھ مار کر اُس نے پیچھے کر کے سنوارنے کا فریضہ انجام دیا تھا۔ حالانکہ اشعر اُس کے لیے کپڑے لے کے آیا تھا اُس نے دریکتا سے کہا بھی تھا ان میں سے کوئی پہن لیں۔

پرخوشی میں اُسے اپنے ناگفتہ بہ حلیے کی فکر ہی نہیں رہی تھی۔ اشعر کے ساتھ آتے وقت اُس نے پورے جسم اور سر کے گرد اچھی طرح چادر لپیٹ لی تھی جس نے اُس کی ہیبت کڈانی کو چھپا لیا تھا۔

مگر گھر کی عورتوں کی نظروں سے کچھ بھی چھپ نہیں سکتا تھا۔

وہ دور تیں اور تین دن اُس کے پاس گزار کے آئی تھی۔ اشعر نوجوان صحت مند اور جوانی کی انگلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ دریکتا کے ساتھ اُس کا نکاح ہو چکا تھا۔ ان دوروں اور تین دنوں میں کیا کچھ ہوا ہوگا۔ اُن میں سے کسی کے لیے بھی یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا۔

شریں تائی سائرہ کو پرے کرتی اُس کے قریب آ بیٹھی۔ ”دریکتا اشعر نے تمہیں کچھ کہا تو نہیں“۔ شریں اپنی طرف سے خاصی آہستہ آواز میں کہا تھا۔ پر وہاں موجود نوزیہ اور فرح نے بھی سن لیا۔ ”جی تائی دھمکیاں دی تھی۔ وہ سادگی سے بولی۔“ ارے نہیں میرا مطلب ہے اُس نے کچھ ایسا دیا تو نہیں کیا ناں۔“

شریں نے ”اُس نے کچھ ایسا دیا تو نہیں کیا ناں۔“

شریں نے ”کچھ ایسا دیا“ اس انداز میں کہا کہ شرم سے وہ کٹ کے رہ گی۔ پچی تو نہیں تھی جو پس پردہ مفہوم کو نہ سمجھ پاتی۔

یہ اڑے اڑے سے گیسویہ جھکی جھکی سی پلکیں

تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا نساہ۔

سائرہ کو اس حال میں مذاق سوجھ رہا تھا۔ شریں نے اُسے گھور کے دیکھا پر وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگی۔

اب شریں سر پکڑ کے بیٹھی تھی۔ ”اُف اب کیا ہوگا“۔ اُسے سارا کھیل ہاتھ سے نکلتا نظر آ رہا تھا۔ تائی اشعر نے

اس کا غذ پہ مجھ سے سائن کروائے تھے۔ رہی سہی کسر دریکتا نے وہ اسٹامپ پیپر انہیں دکھا کے پوری کر دی۔

”اُف دریکتا تم نے کیا کر دیا۔ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی“۔ شریں نے اُسے تاسف سے دیکھا۔ ”تائی

اُس کے بغیر میرا وہاں سے آنا ناممکن تھا۔ تب میں نے سائن کیے۔“

”میں تمہارے تایا کو دکھاتی ہوں۔ اب تو کیس بھی واپس لینا پڑے گا۔ تمہاری بے وقوفی نے یہ دن دکھائے

ہیں۔ ہم جیتی بازی ہار گئے ہیں“۔ شریں کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔

”ویسے یہ اشعر لغاری اور اُس کی فیملی اس طرح کی لگتی تو نہیں ہے جس طرح اور نگزیب بھائی بتاتے ہیں۔“

نوزیہ پر خیال انداز میں شریں کے وہاں سے جانے کے بعد بولی تو فرح نے بھی تائیدی کی۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس میں کوئی سچائی نہیں ہے۔ عمر بھائی نے کچھ سوچ کر ہی وہاں بیٹی دی ہے۔ اب کس قدر بدنامی ہوئی ہے پورے خاندان کی

ایک غلط فیصلے کی وجہ سے۔ اشعر بے شک شوہر ہے دریکتا کا اگر اُسے ساتھ لے گیا ہے تو۔ پر اس طریقے سے یہ قابل تعریف نہیں ہے۔ اب دریکتا کے بارے میں جو باتیں ہو رہی ہیں۔ میری بیٹی کے بارے میں کوئی کرتا تو میں مارے شرم

کے کسی کا سامنا تک نہ کر سکتی۔ ہارون بتا رہے تھے اور نگزیب بھائی نے عدالت میں کیس دائر کرنے سے پہلے اشعر کو بڑی دھمکیاں دیں کہ تم دریکتا کو طلاق دے دو۔ ایسی دھمکیاں بھلا کوئی مرد سن سکتا ہے۔ تب ہی اشعر نے یہ سب کیا۔ اُسے

شک تھا کہ ہم لوگ پھر بھی کر سکتے ہیں تب اُس نے اسٹامپ پیپر پہ یہ سب لکھوایا۔ سوچو تو کتنے شرم کی بات ہے یہ ہمارے خاندان کے لیے۔“

فرح اور نوزیہ آہستہ آہستہ آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے دریکتا سے شریں کی طرح پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ ہر نوجوان نسل کے لیے یہ اپنی نوعیت کا اچھوتا واقعہ تھا وہ اب دریکتا سے طرح طرح کے سوال کر رہی تھی ان میں سائرہ پیش پیش تھی۔

”ویسے ایک بات ہے تمہارا ہزبینڈ ہے بہت بولڈ ورنہ روڈ سے تمہیں اس طرح اٹھا کے اپنے ساتھ نہ لے جاتا۔“ وہ بہت مزے سے بولی تھی۔ دریکتا الجھن محسوس کر رہی تھی۔

”وہاں جا کے اُس نے تمہیں کیا کہا“۔ دریکتا کی ایک دوسری کزن بولی تو توہین کی شدت سے اُس کی آنکھوں میں نمی آ گی۔

اشعر تو اُسے چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ سوالوں کے نئے باب اُس کے لیے کھل گئے تھے۔

”ویسے اغوا ہونے کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔ اگر اغوا کرنے والا اشعر لغاری کی طرح ہو تو میں سو بار اغوا ہونا پسند کروں۔ تمہاری طرح منہ لٹکا کے نہ بیٹھوں۔“

”شکر ہے اشعر لغاری در یکتا کا شوہر ہے ورنہ تم ساری زندگی اغوا ہی ہوتی رہتی“۔ سائرہ کی بات پہ اُن کی ایک اور کزن بولی تو زور کا قہقہہ پڑا۔

”کاش یا ایسا ہوتا.....“ سائرہ کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔ ”یعنی تم اغوا ہوتی رہتی“۔ وہی کزن حیرت سے بولی۔ ”ہاں کیونکہ اشعر لغاری بالکل میرے آئیڈیل کی طرح ہے“۔ وہ یہ بات کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرمائی کہ در یکتا پاس ہے۔

”ہاں یہ تو ہے در یکتا کا ہزبینڈ بہت زبردست ہے“۔ دوسری کزن نے بھی تائید کی۔ اُن کی باتوں سے در یکتا کے سر میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

وہ پچھلے دو گھنٹے سے اشعر لغاری کو ہی موضوع گفتگو بنائے ہوئے تھیں۔

مزید راز اور چٹ پٹا قصہ ہاتھ آیا تھا خاص طور پہ سائرہ اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

شریں نے وہ اسٹامپ پیپر کی نقل اور نگزیب کو دکھا دی تھی اُن کے خوابوں کا تاج محل پوری قوت سے زمین بوس ہوا تھا۔ سب کچھ چکنیا چور ہو گیا تھا۔

اشعر لغاری نے اُنہیں شرم ناک شکست دی تھی۔

اب وہ ناں بھی نہیں کر سکتے تھے۔

☆☆☆

در یکتا یعنی ہوئی تھی۔ وہ وہی طور پہ بڑی طرح تھک گئی تھی۔ سب کے سوالوں کا سامنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ اشعر نے جو کرنا تھا کر لیا تھا انا اور مردانگی کی جنگ میں فتح یاب ہوا تھا۔ پر اُسے جو شرمندگی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا آنے والی جس بدنامی کا سامنا کرنا تھا وہ اُس کے لیے بہت مشکل تھی۔

گھر میں جب اتنی باتیں ہو رہی تھیں تو کیا گھر سے باہر کے لوگوں نے نہیں کی ہوگی۔ اور نگزیب تایا اپنی غلطی مان ہی نہیں رہے تھے۔ سارا قصور اشعر لغاری کے سر تھوپ رہے تھے۔

شریں کو زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اشعر لغاری در یکتا سے اپنا حق وصول کر چکا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نہ مارے شرم کے در یکتا اس کی وضاحت کر پائی تھی۔

اب رخصتی کرنا ضروری تھی۔

اُن کے پاس انکار کا کوئی جواب ہی نہیں رہا تھا۔

اُدھر سے عاشر نے بھی کہا تھا۔ در یکتا اغوا کے بعد واپس آئے یا اشعر اُسے طلاق دے دے وہ اب اُس سے شادی نہیں کرے گا۔ اُس کے ذہن میں بھی مخصوص مشرقی سوچ تھی کہ بیوی اُن چھوٹی اور کنواری ہو۔

ابو نے جب اپنا منصوبہ اُس کے سامنے رکھا تو وہ خوشی خوشی راضی ہو گیا کیونکہ در یکتا خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ جائیداد کی بھی مالک تھی۔

پر اب اُسے در یکتا سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس کی خوبصورتی سے بالکل بھی نہیں کیونکہ اشعر اپنے سارے حق استعمال کر چکا تھا۔ شریں کی طرح اُس کی سوچ بھی یہی تھی۔

☆☆☆

ذہین طیب کو اُس کے پاس چھوڑی گئی تھی۔ اُس نے سوئے ہوئے طیب کی طرف کروٹ لی۔ کتنا معصوم اور دنیا سے غموں سے نا آشنا تھا وہ۔ کاش وہ بھی طیب جتنی ہی رہتی کبھی بڑی نہ ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ اُس کی سوچ ناممکن سی تھی۔

سوچ سوچ کے در یکتا کا سر درد کر رہا تھا۔

شریں تائی کی بات اُسے پھر یاد آئی تو اکیلے میں بھی وہ شرمائی۔

اشعر کے پاس وہ دورات رہی تھی۔ وہ مزے سے سو گیا تھا۔ اُس کے پاؤں میں چوٹ لگی تھی اس لیے وہ درد کی وجہ سے جاگ رہی تھی۔ کچھ اُس کی طرف سے خوف بھی تھا مگر اس کا خوف بے بنیاد تھا۔

پر آج جب در یکتا نے اسٹامپ پیپر پہ سائن کیے۔ اُس کے بعد جو ہوا وہ اُس کے لیے ناقابل فراموش تھا۔ اشعر کی جرات اور بیباکی بھولنے والی تو نہیں تھی۔ اُس کے حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔ پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور ایک سانس میں پی گئی اس وقت تنہائی تھی وہ آرام سے ہر چیز پہ غور کر سکتی تھی۔

صبح کے واقعے کی جزئیات تک اُسے یاد تھیں۔ یاد کرتے ہی اُس کے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔ ساتھ مائزہ کا تبصرہ بھی کہ در یکتا کا ہزبینڈ بہت بولڈ ہے۔

اُس کی نیند ہی آج پلکوں سے روٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری تاسف سے اُسے دیکھ رہے تھے وہ سب کچھ بتا چکا تھا۔ ”اشعر تم نے یہ سب کیوں کیا کم سے کم مجھے بتاتے تو..... میں تمہیں ایسا کبھی نہ کرنے دیتا“۔ ”پاپا اب جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ وہ لوگ اب رخصتی سے انکار نہیں کریں گے“۔ ”اشعر میں پہلے ہی خاندان والوں رشتہ داروں کی باتوں سے ڈر رہا تھا کہ اشعر کی منکوحہ نے اُسے عدالت میں قسٹ لیا ہے۔ میں بدنامی کو فیس نہیں کر سکتا“۔ ”پاپا کیسی بدنامی میں کسی اور کو نہیں اپنی بیوی کو لے گیا تھا۔ اس میں کوئی بات کرتا ہے تو کرے میں پروا نہیں کرتا۔ پاپا در یکتا کے تایا چچا اور خود در یکتا تک نامناسب رویے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے ہسکیاں دی جا رہی تھی۔ خلع کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ جیسے میں کوئی زر خرید ملازم ہوں اُن لوگوں کا۔ تو بس دماغ کھوم گیا میرا۔“

”پاپا میں اپنی عزت نفس اور انا پہ چوٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ کسی صورت بھی نہیں۔ در یکتا کے تایا کی اکثر فون کالنگی ہے اور در یکتا کی بھی“۔ ”آخری تین لفظ اُس نے دل میں کہے“۔ اب میں نے پکا کام کر دیا ہے۔ رخصتی سے انکار نہیں ہوگا۔ ”دل ہی دل میں وہ مسکرا رہا تھا“۔ ”چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ میں در یکتا کو جلدی رخصت کر داکے لے آؤں“۔ وہ طاہر لغاری پر سوچ انداز میں بولے۔

”ہاں پاپا ٹھیک ہے“۔ اشعر نے بھی تائید کی۔

در یکتا کو وہ چھوڑنے گیا تو اُس کے تایا کے رویے میں پہلے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر وہ غرور کچھ بھی تو نہیں تھا۔

اشعر جیت چکا تھا۔ جو چیز اُس کی انا اور غیرت کے لیے چیلنج بنی ہوئی تھی۔ وہی اُس کی فتح بن گئی تھی۔

در یکتا کا ڈراڈرا خوفزدہ انداز گریز یا رویہ یاد آتے ہی اشعر کے لبوں پہ مسکراہٹ آ گی۔ کہاں تو شیر بنی ہوئی تھی اور کہاں اُس کے سامنے آ کے بھیگی بلی بن گئی تھی۔ فارم ہاؤس میں اُس نے خود سے اشعر سے کم ہی بات کی تھی۔ اُس کا

نہیں تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

سارا زور رونے کی طرف تھا یا پھر ڈرنے کی طرف۔ اُس کی آنکھوں اور رویے میں ڈر تھا۔ جیسے اشعر کوئی ڈر نیکولا پھر خوفناک انگریزی فلموں کا کوئی کردار ہو۔ جو موقعہ ملتے ہی اُسے چیر پھاڑ کے کھا جائے گا۔

پتہ نہیں وہ اتنا خوفزدہ کیوں تھی اُس سے۔ اشعر کو اُس سے یہ بات پوچھنی یا دہی نہیں رہی تھی۔ جب وہ یہاں آجاتی رخصت ہو کے تو تب اُس نے لازمی پوچھنا تھا۔ کہ محترمہ آپ مجھ سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں۔ جب وہ اُسے پہلی بار زبردستی ساتھ لے کے جا رہا تھا تب وہ گاڑی میں خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں اُسے کیا کیا کہا گیا تھا جو وہ اتنا کبیدہ خاطرہ تھی اُس سے۔

☆☆☆

شریں ماڑہ کو چھوڑنے جا رہی تھی۔ دریکتا کی وجہ سے وہ اس مسئلے پہ دھیان نہیں دے پائی تھی۔ اب فریضت تھی۔ اُس نے حمزہ احمد سے خود بات کرنی تھی۔ باسط ایک ذرا سی بات پہ ماڑہ سے اس طرح ناراض ہو گیا تھا۔ اس انتظار تک جانا اچھا نہیں تھا۔ شریں کے دل میں تلخی آگئی تھی۔

بیٹا اُن دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ماڑہ کافی دن بعد واپس آئی تھی۔ بیٹا بڑی محبت سے ملی تھی۔ شریں اکھڑی اکھڑی تھی بیٹا فوراً بھانپ گئی کہ کوئی بات ہے۔ اُنہیں کھانا کھلا کے وہ اپنے بیڈ روم میں ہی لے آئی اور پھر بات کا آغاز کیا۔ ”آپا کیا بات ہے آپ کچھ ناراض ناراض سی لگ رہی ہیں۔“ ”ہاں میں ناراض ہوں۔ بات ہی ایسی ہے میں حمزہ بھائی کے سامنے بات کروں گی تم سے۔“ شریں اُسی سوڈ میں تھی۔ بیٹا پریشان ہو گئی کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے جو آپا حمزہ کے سامنے بات کرنا چاہ رہی ہیں اُس نے پھر نہیں پوچھا۔

حمزہ گھر آئے تو شریں نے پھر اُنہیں ساری بات بڑھا چڑھا کے بتائی۔

☆☆☆

جہاز کے لینڈ کرنے میں تھوڑا ہی ٹائم تھا۔ باسط فضا کی بلندی سے نیچے آنے والی عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ چیزوں کا حجم بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ اور سب کچھ واضح ہو رہا تھا۔ درخت، عمارتیں، روڈ، سڑک پہ بھاگتی دوڑتی گاڑیاں قریب اور قریب سے نظر آرہی تھیں۔ جہاز کا زمین سے فاصل کم ہوتا جا رہا تھا۔

باسط کو پاکستان میں ایک آدی سے ملنا تھا۔ اُس کا اچانک پروگرام بنا تھا۔ اُس نے سر پر اتر دینے کے چکر میں گھر میں کسی کو بھی اپنے آنے کا نہیں بتایا تھا۔

☆☆☆

ایئر پورٹ سے باہر آ کر اُس نے نیکی والے کو اشارے سے روکا اور بیٹھ گیا۔ گھر کے سامنے اتر تو چھوٹا بیٹھ کھلا ہوا تھا۔

وہ لان سے گزر کر اندر آیا۔ کوئی ذی نفس بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا اُس نے سوچا سب آرام کر رہے ہوں گے۔ وہ بے پاؤں اپنے بیڈ روم کی طرف آیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم سے ہلکی ہلکی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ”اچھا تو سب وہاں ہیں۔“ اُس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی یہ سوچتے ہوئے کہ سب اُسے دیکھ کے کتنا خوش ہوں گے۔

وہ آرام آرام سے آہستگی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف آنے لگا۔ دروازہ ہلکا سا نیم داتا تھا۔ اب آنے والی

آوازیں واضح تھیں اور قابل شناخت بھی۔

”حمزہ بھائی کبھی بیٹا نے آپ کو شکایت کا موقعہ دیا۔ اس نے ساری زندگی کبھی آپ کو باسط کو احساس دلایا کہ باسط کی سگی ماں نہیں ہے۔ میری بہن کا دل اور ظرف بہت بڑا ہے۔ اور باسط نے صرف اس بات پہ کہ ماڑہ طیب کو کمر کے پاس کیوں لے گئی ناراض ہو گیا۔ اس حد تک کہ کوئی لحاظ بھی نہیں کیا صاف کہہ دیا کہ اب اپنی ماں کے گھر ہی رہو۔ اتنی بڑی بات تو نہیں تھی۔ کاش بیٹا کا ظرف اور حوصلہ باسط میں بھی آجاتا۔ آخر کو اس کی گود میں پلا پڑا ہے۔ کچھ تو اثر دیتا تاں کہ بیٹا نے اس کی پرورش کی ہے۔“

شریں خالہ کی آواز ایک ایک لفظ سماعتوں میں زہر بن کے اتر رہا تھا۔

پر خود کو سنبھالنا ضروری تھا۔ جو کچھ وہ سن چکا تھا۔ اسے زیادہ سننا اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُس نے فوری طور پہ کچھ سوچا اور قدم موڑ لیے۔ وہ کسی کی نظر میں آئے بغیر یہاں سے لوٹنا چاہتا تھا۔

جونہی وہ گیٹ سے باہر نکلا۔ اُس کی نظر دائیں طرف سے آتی میردن کلر کی کردلا پہ پڑی۔ یہ ایاز تھا۔ اُس کی نظر ابھی تک باسط پہ نہیں پڑی تھی۔ پر گاڑی قریب آگئی تھی۔ باسط گیٹ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا جیسے ابھی بھی پہنچا ہو۔

وہ یہ تاثر دینے میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔ ایاز چھلانگ مار کے نیچے اتر اور اُس کے گلے لگ گیا۔ ”بھائی آپ کب آئے اور اس طرح۔ بتایا بھی نہیں۔“ ”بس سوچا تم سب کو سر پر اتر دوں اس وجہ نہیں بتایا۔ اُس نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ پر نہ جانے کیوں آج ایاز سے ملتے ہوئے اُس کے رویے میں سرد مہری سی تھی۔ ایاز نے اپنی خوشی میں اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا۔

وہ گیٹ سے اندر بھاگ گیا۔ باسط دو بار جب گھر میں داخل ہوا تو سب اُس کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ شریں خالہ، ماڑہ، حمزہ، احمد، بیٹا اُس کے چھوٹے بہن بھائی۔ سب ہی توتھے۔ اُسے چمکتی محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ بیٹا حسب معمول اُس کا ماتھا چوم کے سینے سے لگا کے ملی۔ پر آج باسط بھجا بھجا تھا۔ شریں جو کچھ دیر پہلے حمزہ اور بیٹا کے سامنے گرج برس رہی تھی اس وقت صدقے داری ہوئی جا رہی تھی۔ کتنا تضاد تھا اُن کے رویے اور سوچ میں۔

ماڑہ البتہ کچھ ڈری ڈری ہی لگ رہی تھی کہ جانے باسط اُسے کیا کہے۔ تنہائی ملتے ہی وہ اُس کے قریب آگئی۔ باسط کے بازو اُس کی سمت نہیں بڑھے وہ خود اُس کی بانہوں میں سما گئی۔

”باسط آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بس آخری غلطی تھی معاف کر دو۔ اب میں طیب کی طرف پلٹ کے دیکھوں گی بھی نہیں۔“ وہ اُس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جواب میں باسط نے اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا۔ شریں خالہ کی کئی باتیں کانوں میں گونجنے لگی۔ ایک دم اندر کوئی آگ سی بھڑکنے لگی تھی۔ اُس نے ماڑہ کو بازوؤں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور خود سگریٹ سلگا لیا۔ خوب گہرے گہرے کش لیے کہ شاید سکون مل جائے۔ پر کہاں اُس کے من میں دور دور تک بے چینی اور بے سکونی پھیلی ہوئی تھی۔

کتنے کڑے سچ کا سامنا کرنا پڑا تھا آج۔ سچ کڑوا اور جان لیوا تھا۔

بیٹا اُس کی سگی ماں نہیں تھی پر آج تک کبھی بھی اُن کے رویے سے یہ بات ظاہر یا محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایاز سے بھی زیادہ اُس کا خیال رکھتی تھی۔

’نہیں نہیں‘ وہ زور زور سے چیخنے لگا اور اپنا سر پوری قوت سے بیڈ کی پٹی سے نکلایا۔ شاید اس جنون کو سکون مل جائے۔ سکون ہوتا تو ملتا اُسے۔ باسط کا سر پھٹ گیا تھا۔ وہ پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔  
وہ ایک پر تعیش اور مہجے اپارٹمنٹ میں تھا کسی نے اُس کی چیخوں پہ دھیان نہیں دیا۔ وہ خود ہی بے حال ہو کے خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

نوید نے اورنگزیب کو کسی نہ کسی طرح آمادہ کر لیا تھا کہ عمر کو چیک۔ اُپ کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے۔

خلاف توقع وہ مان گیا تھا۔ نوید کو اپنے دماغ سے ایک بوجھ اترتا محسوس ہوا۔ وہ عمر کو دیکھ کے احساس جرم کا شکار ہو جاتے۔ اُن تینوں بھائیوں میں سے کسی نے سنجیدگی سے اُس کے علاج پہ توجہ نہیں دی تھی۔ ہاں شاہ زیب کی موت کے بعد شروع میں طاہر لغاری اُسے یعنی عمر زیب کو خود ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے رہے۔ اُن کے بھائیوں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔

اورنگزیب کو اپنی لالچ پڑ گئی تھی۔ ماثرہ کو عمر زیب کی بہو بنانے کے بعد اُسے عمر زیب کی اصل جائیداد کا علم ہوا۔ شاہ زیب کی حادثاتی موت نے عمر زیب کا دماغ ماؤف کر دیا تھا۔ اورنگزیب کا کہنا تھا کہ عمر اسی طرح رہے تو ٹھیک ہے۔ جب وہ تندرست ہوگا تو شاہ زیب کا صدمہ اُسے مار ڈالے گا۔

اُس نے نوید اور ہارون کو بھی قائل کر لیا تھا۔ اس کے بعد عمر کی ذہنی حالت خراب سے خراب ہوتی چلی گئی۔ ہر کسی کی اپنی دنیا تھی کسی کو احساس نہیں تھا۔ اورنگزیب ماحول کی تبدیلی کے بہانے عمر کو گاؤں لے آئے تھے تب سے وہ اوروریکٹا ادھر ہی تھے۔ دریکٹا بیٹی ہونے کے ناطے۔ باپ کے لیے کڑھتی، پریشان ہوتی۔ عمر اب جارحیت پہ اتر آیا تھا جس کو دیکھتا مارنے کے لیے ددڑتا۔ نوید کے دل میں قدرت کی طرف سے ہی یہ خیال آیا تھا کہ اُسے عمر کا بھائی ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اسجد بھی گاؤں آیا ہوا تھا۔ نوید اُسی کے ساتھ عمر کو لے کر شہر آئے۔ ڈاکٹر سے انہوں نے پہلے ہی نام لے لیا تھا۔ اس لیے انتظار کی زحمت سے بچ گئے۔

یہ تو ذہنی اور نفسیاتی امراض کا مشہور ہاسپٹل تھا۔ نوید کو پوری امید تھی کہ عمر یہاں سے ٹھیک ہو جائے گا۔ عمر کے مختلف قسم کے ٹیسٹ ہوئے۔ ڈاکٹر کی ٹیم نے آپس میں مشورے کے بعد عمر کو ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ انہیں عمر کا کیس کافی دلچسپ اور قابل توجہ نظر آیا تھا۔

نوید نے ہاسپٹل میں ہی دریکٹا کو کال کر کے بتایا۔ وہ بھی پپا کے مکمل علاج کروانے کے حق میں تھی۔ جب نوید آج عمر کو ساتھ لے کے آرہے تھے تو دریکٹا نے انہیں بھگی بھگی تشکرانہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان نگاہوں میں چمکتی نمی نے نوید کے ملال کو کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔

انہوں نے عمر زیب کو ہاسپٹل ایڈمٹ کروا دیا تھا۔ اُس کا علاج، طویل محنت طلب اور صبر آزما تھا۔ انہیں لمبا عرصہ اسی ہاسپٹل میں گزارنا تھا۔

بہر حال ایک امید کی کرن نظر آئی تھی جسے نوید نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ عمر ایڈمٹ ہو چکا تھا اور ڈاکٹر نے

آج تک اُس سے یہ بات چھپائی گئی تھی جانے کیا مصلحت تھی اس میں۔ کاش یہ بات چھپی ہی رہتی یا پھر اُسے بہت پہلے بتادی جاتی۔ وہ ریزہ ریزہ ہو کے ایسے کھرتا تو ناں۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا کھرتا تھا۔ کوئی سمیٹنے والا تک نہ تھا۔ اُسے خود کو خود ہی جوڑنا تھا۔

کاش وہ گھر نہ آتا۔ یا اپنے آنے کی اطلاع کروا دیتا۔ کاش وہ شریں خالہ کے منہ سے اتنے کڑوے اور زہریلے انداز میں اس سچ کو نہ سنتا۔ کاش ابوا سے خود بتاتے یا پھر امی اُسے پاس بٹھا کے آرام سے بتا دیتی کہ میں تمہاری اصلی ماں نہیں ہوں۔ پھر شاید اُسے اتنا دکھ نہ ہوتا اُسے کرب سے نہ گزرنا پڑتا۔ کاش کاش یہ سب نہ ہوتا۔ کاش اُسے پتہ نہ چلتا۔

☆☆☆

سورج کی کرنیں کمرے میں جھانک رہی تھیں۔ ماثرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اور سب سے پہلے اُس نے اپنی دائیں سائیڈ پہ دیکھا۔ باسط کا تکیہ خالی تھا۔ اُس کے جوتے، ریسٹ واچ اور موبائل فون بھی سامنے ٹیبل پہ موجود نہیں تھا۔ وہ واش روم میں بھی نہیں تھا۔

ماثرہ باہر آئی کہ شاید وہ بیٹا خالہ کے پاس ہو۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ اُلٹا اُسے پوچھنے لگی کہ باسط ابھی تک سو رہا ہے۔ ماثرہ اُسے ڈھونڈنے باہر آئی تھی اور وہ اُسی سے پوچھ رہی تھی۔  
وہ پورے گھر میں نہیں تھا۔

چوکیدار سے معلوم ہوا کہ چھوٹے صاحب رات تین بجے گھر سے نکلے تھے۔ بغیر گاڑی کے۔  
”وہ کہہ رہے تھے کہ میں ایئر پورٹ تک ٹیکسی لے لوں گا۔“ چوکیدار بتا رہا تھا۔

بیٹا کو ڈر لگ رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں خود ہی یہ بات آئی تھی کہ باسط کو پتہ چل گیا ہے وہ اُس کی ماں نہیں ہے۔ اُس نے سن لیا ہے۔ تب ہی یہاں سے بغیر بتائے اس طرح گیا ہے۔ باسط نے وہاں جا کے کال کی تو اُس کی جان میں جان آئی۔ ”امی ایک ضروری کام تھا اس لیے جلدی میں آنا پڑا مجھے۔ سب سو رہے تھے میں نے سوچا کیا جگاؤں اس لیے اکیلا ہی آیا ایئر پورٹ تک۔“ وہ نارٹل طریقے سے بول رہا تھا۔ بیٹا نے رُکی رُکی سی سانس خارج کی۔ اب دل کو کہیں سکون ملا تھا اور ایک بوجھ اتر تھا۔  
پر ماثرہ باسط سے ناراض تھی۔

☆☆☆

باسط کبھی زندگی بھر نہیں رویا تھا۔ پر ایئر پورٹ سے اپنے اپارٹمنٹ تک پہنچتے ہی وہ اپنے بستر پہ ایسے گرا جیسے میلوں دور سے پیدل چل کے آیا ہو۔ جن آنکھوں میں ماثرہ کے نام سے ویسے جلتے تھے وہ آنکھیں اب بھیگ رہی تھیں۔ وہ بی آ کے کالے دھندے سے وابستہ ہونے کے بعد اُس کا دل سخت ہو گیا تھا۔ پر آج احساس ہوا کہ دل سینے میں ہے اور قطرہ قطرہ پکھل رہا ہے۔ موم کی طرح۔

اُسے بے پناہ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا کوئی چیز بس بس تک کو کاٹ رہی تھی۔ چھید رہی تھی۔ باسط نے شرٹ اور اُس کے نیچے پہنی ہوئی بنیان بھی اتار کے پھینک دی۔ پھر شاور کھول کے کھڑا ہو گیا۔ پر اندر آگ ہی آگ بھڑک رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھوں کو دھیرے سے چھوا۔ وہ بھیگ رہی تھیں۔ اُس نے سر کے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑ لیے

دریکتا کو امید تھی کہ پٹھانک ہو جائیں گے۔ نوید نے اورنگزیب بھائی کو عمر کے علاج کی بابت بتایا۔ وہ غائب  
دماغی سے سر ہلاتا رہا۔ اُس نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی ہی پریشانیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اشعر والے  
مسئلے نے زچ کر کے رکھا ہوا تھا۔ انہیں کسی وقت بھی دریکتا کی رخصتی کے لیے تیاری مکمل رکھنی تھی۔ یعنی انہوں نے  
سارے فوائد سے ہاتھ دھو لیا تھا۔ دریکتا کی جائیداد پہ قبضے اور اختیار کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔

جو کچھ شاہ زیب نے ماثرہ اور اپنے بعد میں پیدا ہونے والے بچے کے لیے چھوڑا تھا۔ اُس میں سے کچھ نہیں  
بچا تھا۔

ماثرہ اس گمان میں تھی کہ وہ شاہ زیب کے کاروبار کی مالک ہے۔ بے شک سب کچھ خسارے میں تھا پر مالک  
ہونے کا بھی اپنا نشہ تھا۔ اگر وہ اُن سے کاروبار کے بارے میں پوچھ لیتی تو وہ کیا جواب دیتے۔ عاشر نے اور انہوں نے  
جو فائدہ اٹھانا تھا اٹھالیا تھا باقی کچھ بھی نہیں تھا۔ دریکتا کے اکاؤنٹ میں سے بھی انہوں نے تقریباً سب پیسے نکلوا لیے  
تھے۔ اُس نے تو شاہ زیب کے نام اور اُن کے بزنس کی خاطر اُن پہ اندھا اعتبار کیا تھا۔ وہ سب پیسہ اُن کی جیب میں گیا  
تھا۔ تھوڑا تھوڑا ہارون اور نوید کو دیا تھا لیکن زیادہ اُن کے پاس تھا۔ عمر زیب کے کاروبار کا انہوں نے بیزار غرق کر کے رکھ  
دیا تھا۔ حالات تباہی کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اب ہارون بھی اُن سے الگ ہو گیا تھا۔ اُسے آنے والی مشکلات کا  
اندازہ ہو گیا تھا۔

نوید بھائی عمر کو ہاسپٹل ایڈمٹ کر دئے تھے۔ دوسری بار ہارون اُن کے ساتھ ہاسپٹل گئے اور عمر کے جگری  
دوست طاہر لغاری کو بھی بتا دیا۔

عمر کا علاج سست رفتاری سے ہو رہا تھا۔

وہ سب خاندان والوں کو دیکھ کر کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ خاموش رہتا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔  
ڈاکٹر زمر زیب کی حالت اور رویے کو تسلی بخش قرار دے رہے تھے۔

نوید نے دریکتا سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار جب میں عمر کا پتہ کرنے جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کے جاؤں گا۔  
یہاں سے وہ خود بھی تین چار دن بعد ہاسپٹل کا چکر لگا لیتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عمر کی دیکھ بھال  
کے لیے اپنے ایک ملازم کو ہاسپٹل میں چھوڑا ہوا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ عمر کی بہترین دیکھ بھال  
ہو رہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری عمر کے پاس بیٹھے تھے۔ عمر آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اشعر بھی طاہر کے ساتھ تھا۔ طاہر نے سب  
سے پہلے ڈاکٹر زمر سے مل کے عمر کے علاج کے بارے میں پوچھا تو انہیں کچھ تسلی ہوئی۔ انہیں ایک بات کا دکھ پھر بھی تھا کہ  
عمر کے بھائی انہیں بہت دیر کے بعد ہاسپٹل لائے۔ پھر بھی عمر کے علاج کی کامیابی کی پوری امید تھی۔

”میرے دوست میں گاؤں جا رہا ہوں تمہارے بھائی اورنگزیب سے دریکتا کی رخصتی کی تاریخ لینے۔ کاش تم  
خود ٹھیک ہوتے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کرتے۔“

طاہر عمر کے پاس بیٹھے اُسے یوں بتا رہے تھے جیسے وہ سن رہا ہو اور سمجھ رہا ہو۔ وہ تو سابقہ پوزیشن میں لیٹا ہوا

☆☆☆

طاہر اورنگزیب سے شادی کی تاریخ لینے آئے ہوئے تھے۔

انہوں نے کوئی چوں چرا کیے بغیر دس دن بعد کی تاریخ دے دی۔

دل میں پریشان بھی تھے کہ دریکتا کی شادی اپنے رتبے، خاندان اور عزت کے شایان شان کیسے ہوگی۔ طاہر  
لغاری نے تو کہا تھا کہ مجھے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اشعر نے بھی سختی سے منع کیا تھا۔ پردہ دریکتا کو ایسے ہی تو  
رخصت نہیں کر سکتے تھے۔ خاندان کی عزت اور اُن بان کا خیال تھا۔

دریکتا تو یہی چاہتی تھی کہ شادی انتہائی سادگی سے ہو۔ بے شک کسی کو بھی مت بلایا جائے۔ اُسے سب  
کے سوالوں سے حیرت ہوتی تھی اور وہ ڈرتی بھی تھی۔ پاپا ہاسپٹل میں تھے۔ وہ کسی قسم کی دھوم دھام کے حق میں بھی  
نہیں تھی۔

شریں نے بھی اورنگزیب کو یہی صلاح دی تھی کہ شادی سادگی سے ہو۔ چار دن وہ اشعر کے ساتھ گزار آئی تھی  
اب کسی رخصتی اور کہاں کی دھوم دھام۔ وہ دریکتا کے بارے میں بڑے متفر سے سوچ رہی تھی۔

وہ تو رخصت ہو کے چلی جاتی طیب کو کون سنبھالتا۔ ماثرہ اپنے گھر تھی۔ باقی کوئی بھی طیب کی ذمہ داری لینے  
کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

طاہر اورنگزیب کے پاس سے اُنھ کے دریکتا کے پاس آئے۔ وہ اُداس اور متفکری بیٹھی تھی۔ طاہر نے سلام کیا  
پر پہ ہاتھ پھیرا دعائیں دیں۔ وہ اپنے گزشتہ رویے پر شرمندہ تھی۔ اُن سے نگاہ ہی نہیں ملا پارہی تھی۔ نہ اتنی ہمت ہو رہی  
تھی۔ طاہر انکل سے وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی پر بچکا رہی تھی۔

وہ بھانپ گئے کہ دریکتا اُن سے کچھ کہنا چاہتی ہے پر ڈر رہی ہے۔

انہوں نے اُسے حوصلہ دیا۔ ”بیٹی تم مجھے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں محسوس کر رہا ہوں۔ پر تم بول نہیں پارہی ہو۔  
ایسی کون سی الجھن ہے مجھے نہیں بتاؤ گی۔ میں عمر کی جگہ ہوں۔“ وہ بے بسی سے انہیں تنگنے لگی۔ ”بولو بیٹا جو بات ہے جو  
نہارے دل میں ہے۔“ وہ اُسے بولنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ دریکتا کو اُن کی نرمی نے کچھ حوصلہ دیا۔

”انکل طیب کسی کے پاس بھی نہیں رہتا۔ ماثرہ بھابھی کا تو آپ کو پتہ ہی ہے وہ اپنے سر ریل میں ہیں۔ طیب کو ساتھ  
لے کر نہیں گئیں۔ باقی وہ کسی کے پاس نہیں رہتا۔ میرے ساتھ وہ بہت مانوس ہے۔ کیسے رہ پائے گا۔ کون دیکھ بھال  
کرے گا اُس کی۔ ہر ایک کی اپنی زندگی ہے کوئی بھی طیب کی ذمہ داری نہیں لے گا۔“ آخر میں وہ تھوڑا تلخ سی ہو گئی تو

طاہر اس سادہ اور بے غرض سی لڑکی کو دیکھنے لگے۔ جسے اپنی زیادہ فکر نہیں تھی بلکہ اُس چھوٹے سے بچے کی فکر تھی جو ابھی  
ایک سال کا بھی نہیں تھا۔ وہ اُس کی باتوں سے مطلب کی بات تک پہنچ گئے تھے۔ ”تم طیب کو یہاں چھوڑنا نہیں چاہتی۔  
میرا مطلب ہے کوئی یہاں اُسے رکھنے والا نہیں ہے۔“ نہیں طاہر انکل ذہین ہے تو۔ پردہ تنخواہ وار نوکرانی ہے میں اعتبار  
نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر تم شادی کے بعد طیب کو ساتھ لے جاؤ۔“ انہوں نے اُس کے دل کی بات کہہ دی۔ دریکتا کا چہرہ

دیکھنے والا تھا۔ اُس پہ خوشیوں کے ہزاروں رنگ بکھر گئے تھے۔ اور ہر رنگ اپنی جگہ مکمل اور خوبصورت تھا۔

”انکل کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“ بے یقینی سے اُس کی آواز لرز رہی تھی۔

بالکل سچ۔ کیونکہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ میرے گھر میں بہت جگہ ہے۔ طیب عمر کا پوتا ہے۔ اُمید ہے۔ نشانی ہے شاہ زیب کی۔ عمر سے وابستہ ہر چیز اور ہر رشتہ مجھے عزیز ہے۔ وہ مضبوط لہجے میں بولتے دریکتا کے چہرے پہ چھائے بے یقینی کے بادلوں کو ہٹا دیکھنے لگے۔

”کسی اور کو تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا جب میں طیب کو ساتھ لاؤں گی۔“ وہ دانستہ طور پہ اشعر کا نام نہیں لینا چاہ رہی تھی۔ ”ارے میرے گھر میں نوکروں کے علاوہ میں اور اشعر ہوتے ہیں جب مجھے اعتراض نہیں ہے تو پھر اشعر کو بھی نہیں ہوگا۔ وہ غصے کا تیر ہے۔ انا پسند ہے پر انسانیت اور انسانیت سے وابستہ رشتوں کو جانتا ہے باشعور ہے۔ اُس کی فکر مت کرو۔ میں اُسے سمجھا دوں گا۔“ طاہر بھی اُس کی ہچکچاہٹ بھانپ گئے تھے۔ اس لیے آرام اور تسلی سے بات کی۔

”انکل میری ایک بہت بڑی فکر ختم ہوگئی ہے۔ میں طیب کی وجہ سے پریشان تھی کہ اُس کا کیا ہوگا۔ وہ انہیں یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کیا کیا سوچتی رہتی ہے۔ وہ پچھتاتی تھی کہ اُس اشامپ پیپر پہ اپنے دستخط کیوں کیے۔ اُسی وجہ سے تو پورا گھر پریشان اور مایوسی کا شکار تھا۔ اُس نے یقیناً بہت بڑی غلطی کر دی تھی تب ہی تو اورنگزیب تاپا خاموش رہنے لگے تھے۔ ورنہ اس سے پہلے اُس نے انہیں اس طرح اُداس، خاموش اور پریشان نہیں دیکھا تھا۔“

دریکتا نے اشامپ پیپر پہ سائن کر کے اور وہ تحریر اشعر کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی اپنے پاؤں پہ کلباڑی ماری تھی۔ ورنہ وہ کبھی بھی اس طرح رخصتی پہ مجبور نہ ہوتی۔

دریکتا کی سوچ طاہر انکل سے بات کرنے کے باوجود بھی ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری نے شادی کے کارڈ چھپنے کے لیے دے دیئے تھے۔

اُن کی دونوں بیٹیاں، داماد اور بچے پاکستان آگئے تھے۔ اشعر کی بہنیں نکاح پہ نہیں آئی تھیں۔ یہاں آ کے رو برد پہلی بار اپنی بھابھی کو دیکھا تھا۔ بہت خوش تھیں دونوں بہنیں۔ اُن کا اکلوتا بھائی تھا۔ بہت ارمان تھے اُن کے دل میں۔ اپنے اپنے انداز سے خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ مہمانوں کی لسٹ بن رہی تھی۔ وقت کم تھا۔ لائبہ اور شمرہ شادی کی شاپنگ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اشعر سے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

طاہر لغاری نے لائبہ، شمرہ اور اشعر تینوں کو طیب کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا کہ وہ شادی کے بعد دریکتا کے ساتھ اسی گھر میں رہے گا۔ اشعر کچھ نہیں بولا تھا۔ پر لائبہ اُس کی سب سے بڑی بہن نے چھیڑ چھیڑ کے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ”اشعر تمہیں تو جہیز میں ایک چھوٹا سا رقیب بھی مل رہا ہے۔“ وہ اُسے شرارتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ”تو پھر کیا ہے میں چھوٹے بڑے رقیبوں سے نمٹ لوں گا۔“ اشعر نے بات مذاق میں اُڑادی۔

شمرہ اُس سے یعنی اشعر سے بڑی اور لائبہ سے چھوٹی تھی۔ وہ سنجیدہ مزاج تھی۔ پر اشعر کو تنگ کرنے سے بازوہ بھی نہیں آ رہی تھی۔

طاہر بہت خوش تھے۔ بہن بھائی کی ہلسی مذاق نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ برسوں بعد اس گھر میں خوشیوں کی بارش اُتری تھی۔ اُن میں جوانوں کی سی پھرتی اور تیزی آگئی تھی۔ بڑھ چڑھ کے سب کاموں میں حصہ

لے رہے تھے۔ مشورہ دے رہے تھے۔ آخر اُن کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی۔

☆☆☆

دریکتا پہلی بار ہسپتال آئی تھی پاپا کو دیکھنے پرسوں اُس کی رخصتی تھی۔ فوزیہ چچی نے خود کہا تھا کہ شادی سے پہلے جا کے پاپا کو دیکھ لو۔ دریکتا خود بھی یہی چاہ رہی تھی۔ اُس کے ساتھ فرح اور فوزیہ چچی دونوں آئی تھی۔

عمر زیب الگ روم میں تھے۔ نرس نے انہیں ابھی اُن کے سامنے دوائی کھلائی اور انکیشن لگایا تھا۔ ”پاپا آپ ٹھیک ہیں۔“ دریکتا سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے ایک ٹاپے کے لیے نگاہیں اٹھا کے اُسے دیکھا اور پھر خود میں گم ہو گئے۔ جیسے اُن کے سامنے کوئی بھی نہ ہو۔ آج اُن کے رویے میں کوئی جارحیت نہیں تھی۔ یہ ایک اچھا اشارہ تھا۔ جانے کیوں دریکتا کا دل چاہا اُن کے سینے سے لپٹ جائے پہلے کی طرح۔ پردل مسوس کے رہ گئی۔ ڈاکٹر نے کسی بھی قسم کے جذباتی رویے کے مظاہرے سے روکا تھا۔

جاتے جاتے وہ اُن کے سامنے رُکی انہیں جی بھر کے دیکھا۔ تو ٹوٹ کے رونا آیا۔ پر آنسوؤں کو آنکھوں میں قید کرنا پڑا۔ کیسا عجیب رشتہ تھا باپ بیٹی کا۔ وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ کوئی اپنا نہیں تھا راز دار نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو اُس کی جدائی پہ روتا۔ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی۔ عمر خود ہسپتال میں تھی۔ کون اُس کے لیے دعا کرتا کہ تمہارے نصیب اچھے ہوں۔ کون سینے سے لگاتا۔ دریکتا کو اپنا اکیلا پن بہت زیادہ کھل رہا تھا۔

یہاں اُس کی شادی کی کوئی خاص خوشی نہیں تھی۔ ہاں فوزیہ اور فرح چچی اور اُس کی کزنز کچھ سرگرمی دکھا رہی تھیں ورنہ شریں یا سائرہ خاموش ہی تھیں۔ ماثرہ رخصتی سے ایک دن پہلے آئی اُس کے ساتھ صرف بیٹا تھی۔ ماثرہ مارے بندھے آئی تھی۔ اُس کا دل نہیں چاہتا تھا جب سے باسط اس طرح گیا تھا۔ اُس کو کسی کام میں بھی خوشی یا سکون نہیں مل رہا تھا۔ بیٹا بردستی لے کے آئی تھی کہ چلو دل بہل جائے گا۔ مگر یہاں آ کے بھی اُس کی اداسی ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

دریکتا پہ کل کی فکر سوار تھی۔ کہ آیا طیب کل اُس کے ساتھ جائے گا کہ نہیں۔ یاد چار دن بعد اُسے یہاں سے لے جانا پڑے گا۔ یہ بات اُسے طاہر انکل سے پوچھتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔ اشعر کی دونوں بہنیں یہاں گاؤں آ کے اُس سے ملتی تھی مگر اُن سے بھی وہ یہ بات نہیں کر سکتی تھی۔

لے دے کے صرف ایک اشعر ہی بچتا تھا کیونکہ شادی اُسی کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اشامپ پیپر پہ سائن دریکتا نے اُسی کے کہنے پہ کیے تھے۔ اُس کو یہ بات اشعر سے ہی کرنی چاہیے۔ آخر اُس نے بھی تو (اپنے تین سائن کر کے) اُس کا ساتھ دیا تھا۔ دریکتا کے سر سے بوجھ اُترا۔ اشعر سے وہ کیسے بات کرتی۔ اُس کے پاس نمبر نہیں تھا اشعر کا۔ اور نہ کبھی اُسے عام حالات میں بات کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اشعر کا نمبر پتہ چل سکتا تھا یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اورنگزیب کے پاس اشعر کا نمبر تھا لیکن تاپا سے نمبر معلوم کرتے ہوئے اُسے شرم آ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں طاہر انکل کا نام آیا۔ جب وہ شادی کی ڈیٹ لینے آئے تھے تو انہوں نے تب دریکتا سے اُس کا سیل نمبر لیا تھا اور اپنا بھی اُسے دیا تھا کہ کبھی کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے تو انسان بات تو کر سکتا ہے۔

وہ طاہر انکل سے اشعر کا نمبر پوچھ سکتی تھی۔ اُسے شرم تو آ رہی تھی پر ساری شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے خود کو اس دلیل سے مطمئن کرتے ہوئے آخر میرا نکاح ہوا ہے۔ اشعر لغاری کے ساتھ میں بات کر سکتی ہوں۔ اس میں حرج نہیں

ہے اُس نے طاہر نکل کو کال کر دی۔

دریکٹا نے اُنہیں خود کبھی کال نہیں کی تھی۔ اب کل اشعر کی بارات جانی تھی۔ اس تناظر میں دریکٹا کی کال اُنہیں پریشانی سے دوچار کر گئی۔ کہ جانے کیا بات ہے۔ کہیں اُس نے رخصتی سے انکار کرنے کے لیے تو فون نہیں کیا۔ اُن کے ذہن میں پہلی بات ہی یہی آئی۔ تب ہی دریکٹا سے بات کرتے ہوئے اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”بیٹا خیریت تو ہے ناں سب ٹھیک ہے ناں۔“ اُنہوں نے لہجے کی لرزش چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ دریکٹا اپنی پریشانی میں تھی اُس نے محسوس ہی نہیں کیا۔

”جی نکل سب ٹھیک ہے۔“ وہ اتنا کہہ کے خاموش ہو گئی۔ طاہر بے تابی سے اُس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔

مجھے اشعر کا نمبر چاہیے یا میری اُن سے بات کروادیں۔ اُس نے خود میں جرأت پیدا کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔ ایک ٹائپ کے لیے وہ خاموش سے ہو گئے اور پھر فوراً اُس کا نمبر نوٹ کر دیا۔ ”بیٹا کوئی پریشانی دالی بات تو نہیں ہے۔“ وہ ابھی تک اُلجھن کا شکار تھے۔

”نہیں نکل بس مجھے ایک کام ہے۔“ دریکٹا نے کام کی نوعیت اُنہیں نہیں بتائی۔

☆☆☆

اشعر لغاری کی طرف بڑی رونق لگی ہوئی تھی۔ ایک دن پہلے مہندی ہوئی تھی اور شمرہ لائبہ نے دل کھول کے اپنے ارمان پورے کیے تھے۔ آج کے دن کوئی رسم وغیرہ نہیں تھی۔ آرام ہی آرام تھا۔ اس کے باوجود بڑا ہنگامہ تھا۔ اشعر کی کزنز، پاس پڑوس کی لڑکیاں، عورتیں سب جمع تھیں۔ کل کے دن کی تیاری ہو رہی تھی۔ اشعر کی بارات جانی تھی۔ اُس کے دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ رات کا نی ہو چلی تھی۔ ایک ایک کر کے سب جا رہے تھے۔

اشعر رضوان کو اللہ حافظ کہہ کر واپس آیا تو ایک بج رہا تھا۔ اُسے سخت نیند آ رہی تھی۔ فریش ہو کے چیخ کر کے بیڈ پہ آیا تو اُس کا سیل بجنے لگا۔ ”جانے کون ہے۔“ اُس نے نمبر دیکھا اور کال ریسیو کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔

”اسلام علیکم“ اشعر بولا تو دریکٹا پہ خاموشی طاری ہو گئی۔ وعلیکم اسلام بمشکل اُس کے منہ سے نکلا۔ ”معاف کیجیے گا میں نے پہچانا نہیں۔“ رات کے اس پہر اس اجنبی لڑکی کو وہ واقعی نہیں پہچان پایا تھا۔

”میں دریکٹا بات کر رہی ہوں۔“ اوہو اشعر ایک ٹھنڈی سانس لے کے رہ گیا۔

”آج ہی کا دن ہے۔ کیا آپ کل تک انتظار نہیں کر سکتی۔“ اشعر کو بے اختیار شرارت سوجھی تو دوسری طرف موجود دریکٹا اس لطیف سی جرأت پہ تھوڑا نزو سی ہو گئی۔ ”میں نہیں طیب کو کل اپنے ساتھ لانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کیسے ہوگا۔ ہو سکتا ہے آپ کی فیملی کو اعتراض ہو طیب کو بارات والے دن ساتھ لانے پہ۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کل خود کہہ دیں کہ طیب ہمارے ساتھ جائے گا تو.....“

وہ اُمید و بیم کی کیفیت میں اُس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ شروع میں بات کرتے ہوئے وہ نزو سی تھی اب اضطراب کا شکار تھی۔

اشعر اُس کی بات سمجھ گیا تھا۔ ”ٹھیک ہے کل طیب ساتھ ہی ہوگا آپ کے۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“ دریکٹا بے طرح خوش ہو گئی۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ میں اس بات کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ آپ نے میری مشکل آسان

کر دی ہے۔“

اشعر تو مختلف ثابت ہو رہا تھا جیسا اُس نے اور نگزیب تایا اور شریں تالی سے سنا تھا اُس کے گھر پہ فائرنگ کروانے والا شخص اس قدر ہمدرد بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کل ملاقات ہوگی آپ سے فیس ٹوفیس۔ پھر شکریہ ادا بھی کر دیجیے گا۔“

اشعر کے یہ کہنے کی دیر تھی اُس نے فون بند کر دیا۔

دریکٹا بہت خوش اور مطمئن تھی۔ کل طیب اُس کے ساتھ ہوگا۔ اُسے حویلی میں کسی کے بھی رحم و کرم پہ نہیں چھوڑنا پڑے گا۔

اُسے مارے خوشی کے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

چپا کے بغیر شاہ زیب کے بغیر اُسے اپنی رخصتی کا تصور بھی کل تک بہت کر بناک لگتا تھا۔ مگر وہ اُن کے بغیر ہی رخصت ہو کر اشعر لغاری کے گھر آئی۔ طیب اور زبین اُس کے ساتھ تھے۔ اشعر نے نہ جانے اور نگزیب اور شریں سے کیا کہا تھا کس طرح بات کی تھی جو زبین طیب کے کپڑے اور دیگر ضروری سامان پیک کر کے واپسی پہ بارات کے ساتھ ہی آئی تھی۔

اشعر نے شمرہ، لائبہ اور چپا کو خود ہی قائل کیا تھا۔ کسی کو اگر تھوڑا بہت اعتراض تھا بھی تو اُس نے ختم کر دیا تھا۔ اس کے باوجود دریکٹا یہاں آ کر بھی رورو کے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ شمرہ، لائبہ دونوں نے مشکل سے اُسے خاموش کر دیا۔ اتنا تو اُنہیں بھی پتہ تھا کہ دریکٹا کے جوان بھائی کی ڈتھ ہو گئی ہے اور عمر انکل ذہنی امراض کے ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ اُنہیں دریکٹا کے نازک احساسات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ لڑکی جو ابھی اپنے گھر سے باپ اور بھائی کے بغیر وداع ہو کے آئی ہے اُس کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی۔ رورو کے دریکٹا کا سر درد کر رہا تھا۔

اشعر دوستوں کی طرف تھا۔ جب سے بارات لوٹی تھی وہ تب سے دوبارہ خواتین کے گھیرے میں نہیں آیا تھا جو عجیب عجیب سی رسمیں کر رہی تھی۔

☆☆☆

شمرہ نے زبین کے لیے کمر اخالی کروا کے سیٹ کروا دیا تھا۔ طیب اُسی کے پاس تھا۔ طیب کو سلمان سے پہلے وہ اُسے دریکٹا کے پاس لے گی۔ نیند سے طیب کی آنکھیں بوجھل تھی پر وہ سو نہیں رہا تھا۔ بے چین سا تھا اتنے بہت سارے لوگوں کو دیکھ کر اور آج اُس نے تنگ بھی بہت زیادہ کیا تھا۔

دریکٹا نے طیب کو اُس سے لے لیا۔ زبین کے ہاتھ سے اُسے لینے کی دیر تھی اُس نے رونا شروع کر دیا دریکٹا کا بھاری لہنگا اور اُس پہ کیا گیا کام طیب کے نازک جسم کو گراں گزرا تھا۔ اُس نے رو کے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ زبین نے اُسے اپنی گود میں اٹھالیا۔ اب وہ پرسکون تھا۔ اتنے میں شمرہ بھی ادھر آ گئی۔ ”ہاں جی سونے سے پہلے طیب سے مل لو اشعر آ رہا ہے۔“ اُس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ وہ سمٹ سی گی۔ شمرہ کے بعد لائبہ اور اُن کی کچھ اور کزنز بھی دریکٹا کے پاس بیٹھ گئیں۔

زبین بھی وہیں تھی۔ طیب کے منہ میں فیڈر دبی تھی اور وہ نیند کی وادیوں میں آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ زبین



دلچسپی سے اُن سب کی باتیں سن رہی تھی۔ لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اشعر دوستوں سے فارغ ہو کے آیا تو لائبہ کو دریکتا پہنچا۔ بھاری جوڑے اور زیورات کی وجہ سے وہ بہت بے آرام سی تھی۔

لائبہ نے سب کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”دریکتا میں نے تمہارے کپڑے نکال کے رکھ دیے ہیں بدل لینا۔ اور پریشان مت ہونا طیب سو گیا ہے یہ دیکھو زمین کی گود میں ہے۔“ وہ جاتے جاتے پھر شرارت سے بولی تھی۔ کرا خالی ہو چکا تھا۔ اب صرف اشعر ہی تھا۔ جو صوفے پہ بیٹھا اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ ”میرا خیال ہے آپ کافی تھک گئی ہیں۔ ذہنی اور جسمانی طور پر۔ آپ ان کپڑوں سے جان چھڑائیے اور ریسٹ کریں۔“ اشعر شوز اتارنے لگا۔ دریکتا نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ روم میں جا چکا تھا۔ پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ چند منٹ بعد وہ نائمیٹ ڈریس میں ملبوس باہر نکلا۔ ”جائیں آپ بھی چینیج کر لیں۔“ وہ نرمی سے بولا تو دریکتا بھاری لہنگا سمیٹی آرام سے اٹھی۔ بیڈ کے پاس ہی اُس کے ہائی ہیل سینڈل پڑے تھے۔ اُس نے بمشکل تمام پاؤں میں ڈالے اور قدم اٹھایا۔ دو قدم ہی چلی ہوگی کہ لڑکھڑا گئی۔ اشعر اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ دریکتا نے وہ سینڈل ہاتھ روم کے دروازے کے باہر ہی اتار دیئے اور ننگے پاؤں اندر گئی۔

دو پتہ اُتار کے چنگ کیا۔ پھر ایک ایک کر کے جوڑے کی پنیں اُتاریں اُس کے بعد زیورات کی باری آئی۔ نہانے کے بعد کچھ سکون کا احساس ملا۔ پر باہر آنے کو جی نہیں جا رہا تھا۔ دل آنے والے لمحات کے تصور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ دل اور دماغ میں کشمکش ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ اشعر سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو سمجھا کے باہر آئی۔

بیڈ روم کی تمام لائٹس بند تھیں۔ صرف زیرو پاؤں کی ایک لائمیٹ جل رہی تھی۔ اُس کے قدم ہی من من بھر کے ہو گئے۔ چلا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اشعر کی نگاہ اُسی کی طرف تھی وہ شاید اُس کی اندرونی کشمکش سے واقف تھا اس لیے لائٹس دوبارہ آن کر دیں۔ وہ پُراسرار اور معنی خیز ماحول یکسر بدل گیا۔

”آئیے سو جائیں مجھے خود بہت شدید نیند آرہی ہے۔“ اُس نے سگریٹ، لائٹرز دونوں چیزیں تپائی سے اٹھا لیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی آگے آگے۔ اشعر اٹھ گیا تھا۔ دریکتا کا دل دھک دھک کرنے لگا وہ اُس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ سائیڈ پہ ہوگی جیسے بچنا چاہی ہو۔ اشعر نے اُس کی طرف نہیں دیکھا وہ ٹیرس کا دروازہ کھول کے باہر آ گیا۔ دریکتا کو بہت دیر بعد نیند آئی۔

اشعر جانے کس وقت دوبارا آیا اور سو یا اُسے خبر نہیں تھی۔ صبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ جہازی سائز بیڈ کے دوسرے کونے میں سر کے نیچے دو دو ٹیکے رکھے ہوئے خواب تھا۔

اُسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کب آ کے سویا یہ نوٹے تھا کہ وہ اُس کے سونے کے بعد ہی آیا ہوگا۔ کچھ عجیب سا رویہ تھا اُس کا۔ جیسے دریکتا کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہ سوچنا چاہ رہی تھی پر نام نہیں تھا۔ اُسے ناشتے کے بعد پالر جانا تھا۔ جانے کتنی دیر تختہ مشق بنا تھا اور پھر ایک ہی پوز میں مسلسل بیٹھنا تھا ایک ہی جگہ بہت مشکل تھا۔ اشعر دو پہر تک سویا۔

دریکتا سب کے ساتھ ناشتہ کر چکی تھی اور اب گاؤں سے آئے ہوئے رشتہ داروں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اشعر

بھی بیدار ہونے کے بعد اُدھر ہی آ گیا۔ سائرہ نے بڑے عجز سے اُسے دیکھا۔ اشعر نے سب کو سلام کیا۔ دریکتا کی دونوں چچیاں، تائی، کزنز وغیرہ سب ہی تھے۔ صرف اورنگزیب اور ہارون نہیں تھے۔ انہوں نے شام کو آنا تھا۔ اورنگزیب یہاں آنے میں بے عزتی محسوس کر رہے تھے پر شریں کے سمجھانے بچھانے پہ آمادہ ہو گئے تھے۔ نوید چچا تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلے گئے کہ شام کو پھر آؤں گا کیونکہ ولیمہ شام بلکہ رات کو تھا۔ دریکتا سے مل کے وہ ہاسپٹل چلے گئے عمرزیب کی طرف۔

☆☆☆

اشعر کا ناشتہ لائبہ ڈرائنگ روم میں ہی لے آئی جہاں دریکتا کے رشتہ دار بیٹھے تھے۔ اشعر ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا اس وقت وہ کہیں سے بھی وہ سخت گیر پولیس آفیسر نہیں لگ رہا تھا جس طرح سائرہ نے اُس کے بارے میں سنا تھا۔

اشعر نے ڈٹ کے ناشتہ کیا اور آخر میں چائے پی۔ ہلکے رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراڈز میں ملبوس سائرہ کو وہ بہت زوردار لگا۔ ٹی شرٹ میں جھانکتے بازوؤں کے مضبوط مسلز اور کلائی پہ بندھی قیمتی ریسٹ واچ سے لے کر اُس کے ہیرا سائل تک سب کچھ ہی قابل توجہ تھا۔

سائرہ کو اچانک دریکتا سے وہی پرانا حسد محسوس ہونے لگا۔ یہ شاندار مرد اُس کا شوہر تھا اُس کے تمام تر اختیارات اور جملہ حقوق کا مالک۔ اشعر لغاری اُسے تروتازہ زندگی سے بھرپور لگ رہا تھا جبکہ اُس کے مقابلے میں دریکتا نجی نجی اور تھکی تھکی سی نظر آرہی تھی۔

اُس کی تھکن کی وجہ نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ سائرہ سلگ اٹھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی اشعر نے آخر کار دریکتا کو جیت ہی لیا تھا۔ ابونے کتنا زور لگایا تھا وہ دریکتا کو چھوڑ دے۔ پروہ ضدی تھا غیرت کا پکا تھا تب ہی تو کل اُسے رخصت کروا کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اور آج وہ حقیقت بنی اُس کے گھر میں بیٹھی تھی۔ کتنا کھل منظر تھا۔ اُس نے رشک سے دیکھا۔

نوکرانی ناشتے کے برتن اٹھا کے لے گی تو زمین طیب کو لیے چلی آئی۔ دریکتا نے بے تاب سے اُسے گود میں لیا۔ اور اُس کے گال چومے۔ شریں نے معنی خیز نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ طیب کی ذمہ داری کا بوجھ مکمل طور پر اُن کے سر سے اتر گیا تھا۔ دریکتا اُسے ساتھ لے آئی تھی اُسے اپنے دلہناپے کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس طرح شادی کے اولین دنوں میں طیب پہ اتنی توجہ دینے سے کہیں اشعر ناراض نہ ہو جائے۔ پردہ تو مسکرا رہا تھا اُسے طیب کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھ کر۔ جیسے اُس کی اپنی اولاد ہو۔ سوچتے ہی شریں شرمندہ سی ہو گئی ایک ماہرہ تھی اُس کی ماں اور دوسری شریں تھی طیب کی نانی، سائرہ بھی تھی وہ بھی تو دریکتا کی ہم عمر ہی تھی۔ کسی کو بھی طیب کی پروا نہیں تھی۔

ان اجنبی لوگوں نے جو طیب کے سگے نہیں تھے اُسے قبول کر لیا تھا۔ شریں نے اشعر کی فیملی کے ہر چہرے کو غور سے دیکھا کہ کہیں اُسے کوئی خفگی نظر آئے۔ پر نہیں۔ دریکتا پہلے دن ہی طیب کو ساتھ لے آئی تھی۔ شریں نے ذہن سے کرید کرید کے سب کے رویے کے بارے میں پوچھا۔ پر اُسے جواب سن کے مایوسی ہوئی۔ ثمرہ، لائبہ نے تو طیب کو گود میں لٹا کے لاڈ بھی کیا تھا۔ ثمرہ کی دو بیٹیاں ہی تھیں انہیں ایک کھلونا لگ گیا تھا۔ طیب کو اٹھا کے گھوم رہی تھیں وہ بھی ہنس رہا تھا کھل کھلا رہا تھا جیسے اپنی خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔



وہ یہاں آ کے خوش تھا۔ اس گھر کے مینوں میں اپنائیت کی خوشبو تھی۔ بچے شام اس چیز کو پہچانتے ہیں اس لیے طیب ثمرہ کی گود میں آ کے رہ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

ویسے کی تقریب رات گئے اختتام پذیر ہوئی تو سب تھکن سے چور تھے۔ دریکتا کو تو سخت قسم کی نیند آرہی تھی۔ کل رات بھی وہ ٹھیک طرح سو نہیں پائی تھی۔ اجنبی جگہ تھی اجنبی بستر تھا اجنبی کمر تھا۔ کچھ پریشانیاں بھی اپنی جگہ موجود تھیں جنہوں نے اسے سکون کی نیند سونے نہیں دیا تھا۔ صبح آکے بھی جلدی کھل گئی تھی۔

ذہین کل کی طرح آج بھی طیب کو سلانے لے گی۔

دریکتا نے ویسے کے بھاری کامدار جوڑے سے جان چھڑائی تو سکون ملا۔

کپڑے بدل کے باہر آئی تو اشعر موجود تھا۔ حالانکہ جب وہ کمرے میں آئی تھی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی بیڈ کے قریب آئی اشعر نے سب لائٹس آف کر دیں سوائے زیر پاؤں لائٹ کے۔ وہ خود صوفے پر بیٹھا تھا۔ شاید اسی کے انتظار میں تھا۔ دریکتا کا دل دھڑکنے لگا۔ کل تو وہ سو گیا تھا اُسے بھی ریٹ کا کہا تھا۔ پر آج جانے کیا ہوگا۔ وہ گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اشعر کو ہنسی تو بہت آئی پر ہونٹوں میں دہائی۔ اشعر نے دو تھکے اٹھائے سر کے نیچے رکھے۔ ”پلیز زیر پاؤں کی لائٹ بھی آف کر دیں یہ تیسرا بٹن ہے“۔ کر ڈٹ بدل کے اُس نے یہ جملہ سو فیصد دریکتا سے کہا تھا۔ اُس نے لائٹ آف کر دی۔

کافی دیر بعد اُسے بھی نیند آئی گئی تو وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے بے خبر سو گئی۔ یہ اشعر لغاری پہ اعتماد کی دلیل تھی۔

☆☆☆

پندرہ بیس دن پر لگاتے ہی اڑ گئے۔ ثمرہ، لائٹس واپس جا رہی تھیں۔ انہوں نے دریکتا کو بہت محبت اور اپنائیت دی تھی۔ بہت جلدی وہ اس گھر کے ماحول اور فضا سے مانوس ہو گئی تھی۔ اس میں سارا کمال ثمرہ اور لائٹس کے محبت بھرنے روئے کا تھا۔ یہی وجہ تھی دریکتا اُن کے واپس جانے پر بہت روئی۔

دو دن بولائی بولائی پھرتی رہی۔ ذہین، طاہر اٹکل اور طیب نہ ہوتے تو وہ تنہائی کے احساس سے پاگل ہی ہو جاتی۔ اشعر کی شکل گھر میں کم ہی نظر آتی۔ وہ بہت مصروف ہو گیا تھا یا جان کے خود کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔ یہ کسی کو بھی نہیں پتہ تھا۔

اشعر کا چہرہ اور لہجہ دونوں ہی بہت سنجیدہ تھے۔ آج وہ روز کی طرح کمرے میں آتے ہی سویا نہیں تھا بلکہ دریکتا کو پاس بلا کے بیٹھ گیا۔ ”میری دونوں بہنیں چلی گئی ہیں آپ نے طیب کی دیکھ بھال کے لیے جس خاتون کو رکھا تھا اُسے واپس بھجوا دیں اور خود یہ کام کریں کیونکہ اب آپ فری ہیں اور کوئی آپ کو پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی آپ طیب کو اپنی ذمہ داری گردانتی ہیں۔“

آپ طیب کو یہاں لے آئیں میں ساتھ والے بیڈ روم میں شفٹ ہو رہا ہوں۔ آپ اور طیب آرام سے یہاں رہیں۔ یہ کمر آپ کا ہے۔ میں ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ ”وہ اُسے خوشخبری سنا کر وار ڈروب سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ دریکتا اُس کی حرکات کو دیکھ رہی تھی۔ اتنی انسلٹ، اتنی توہین۔ اشعر نے اُس کے ساتھ اجنبی سے بھی گیا گزرا برتاؤ کیا تھا جیسے وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کہیں بھی نہیں ہے۔ کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ بس اتنی اہمیت ہے۔ اُس کی اشعر

اُسے جیت کے یہاں لے آیا ہے۔ اب وہ کوئے میں پڑے کاٹھ کباڑ جیسی ہے۔ کیونکہ اشعر کی دلچسپی اُسے اپنے گھر میں لانے تک تھی۔

وہ سوچ رہی تھی اور آنکھوں میں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

اشعر اپنے کپڑے لے کے چلا گیا۔ وہ دوبارہ ہاتھ روم سے اپنی کچھ چیزیں لینے آیا تو دریکتا اسی طرح بت بنی بیٹھی تھی۔

”آپ طیب کو ابھی لے آئیں اپنے پاس سلائیں۔“ دریکتا نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا۔ پر اشعر کی پیٹھ اُس کی طرف تھی ورنہ وہ اُس کا غصیلا چہرہ ضرور دیکھ لیتا۔ جس پر شکایات ہی شکایات رقم تھیں۔

☆☆☆

ذہین اگلے دن واپس چلی گی۔ طاہر اٹکل نے ایک اور کل وقتی نوکرانی کا بندوبست کر دیا تا کہ دریکتا کو بھی تھوڑی آسانی ہو۔

گھر میں طاہر اٹکل، طیب اور دریکتا کے علاوہ باقی نوکر ہی تھے۔ اشعر الگ بیڈ روم میں شفٹ ہو گیا تھا۔ طاہر اٹکل کے سامنے وہ اُس سے بات کر لیتا اور اکیلے میں سامنا ہوتا تو اجنبی بن جاتا۔

دریکتا کو خوش ہونا چاہیے تھا پر وہ خوش نہیں تھی۔ جانے کیوں؟

☆☆☆

باسط دو ماہ بعد بغیر بتائے آیا۔ اس بار وہ ماہرہ کو ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ ایک ہفتہ پاکستان میں قیام کرنے کے بعد وہ ماہرہ کو ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ وہ یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ باسط پورا ہفتہ دن رات اُس کے پاس رہا۔ اُس نے ماہرہ کی پور پور اپنی محبت کی بارش سے بھگو دی تھی۔ ایک دم سے اُس کے رویے میں جو سرد مہری در آتی تھی اُس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ شادی کے ابتدائی دنوں والا باسط تھا پر داندہ دار نچھا اور ہونے والا۔

نواز نے پہلے ہی کہا تھا تو اُس کی جھوٹی بھری تھی۔  
ماہرہ کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔  
وہ پہلے سے بڑھ کر دل فریب لگ رہی تھی۔  
اور باسط تو گویا اُس کا عاشق بنا ہوا تھا۔

ماہرہ کی طبیعت دو بجی آنے کے کچھ دن بعد خراب ہو گی اُس کا جی متلا رہا تھا۔ وہ بار بار سنک کی طرف جا رہی تھی۔ باسط اُسے پڑ سوچ نگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ماہرہ اٹلیاں کر کر کے بے حال تھی۔ واپس اُس کے پاس آ کے لیٹ گی۔ ”اٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔“ باسط نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ وہ پیار بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھ سے نہیں جایا جاتا۔ باسط پلیز۔“ وہ تھکے میں منہ چھپانے لگی۔ ”میں کہہ رہا ہوں ناں اٹھو۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ مجھے کوئی اور ہی شک ہو رہا ہے۔ باسط کی بات کا مطلب سمجھ کر ماہرہ سرخ پڑ گی اور اُس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گی۔

ڈاکٹر نے ماہرہ کا چیک اپ کیا اور دوائیں دے کر گھر بھیج دیا۔ ماہرہ کی طبیعت کسی خوشخبری کی وجہ سے خراب

میں ی۔ باسٹ بہت بجا بٹھا سا تھا۔ اس کی ادائیگی مائری سے کی سوس لری ی۔ باسٹ لیا ہوا ہے یوں اداس ہوا۔ اس نے باسٹ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

”تمہیں پتہ تو ہے مجھے کتنا شوق ہے میں ڈھیر سارے بچوں کا باپ بنوں۔ اور تم ہو کہ میری یہ خواہش پوری ہی نہیں کر رہی ہو۔“ وہ نروٹھے پن سے گویا ہوا اور اس کا بازو کندھے سے ہٹا دیا۔ ”باسٹ ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے ہماری شادی کو ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔ اور آپ مایوسی کی باتیں کرنے لگے ہو۔“ مجھے جلدی سے باپ بناؤ بس۔“ وہ ضدی لہجے میں بولا۔

مائرہ کو گھر چھوڑ کے وہ خود دوستوں کی طرف چلا گیا۔

باسٹ کا دل چاہتا تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ کے واپس چلا جائے۔ اس کے پارٹنر نے کام شروع کرنے سے پہلے اسے کسی بھی وقت کاروبار سے الگ ہونے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ مائرہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے پہلے انہی پہلوؤں پر غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

دریکٹا طیب کو سلارہی تھی جب دھیرے سے دروازہ کھولنے کے اشعر اس کے پاس آیا۔ وہ آج گھر پہ ہی تھا اور کمرے میں بند تھا آفس کے ضروری کام نمٹا رہا تھا۔ دریکٹا کے کمرے میں وہ بغیر ضرورت یا ضروری کام کے آتا نہیں تھا۔ اس لیے وہ حیران سی تھی۔ ”میں عمر انکل کے پاس ہاسٹل جا رہا ہوں۔ آپ نے جانا ہے تو تیار ہو جائیں۔“ وہ منتظر لگا ہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہے میں آتی ہوں دس منٹ تک۔“ اوکے میں اپنے روم میں ہوں مجھے بتا دیجیے گا۔“ وہ پلٹ گیا۔ دریکٹا تیزی سے اٹھی۔ اس کے قدموں میں پھرتی تھی۔ شادی کے بعد وہ پہلی بار پہا کو دیکھنے جا رہی تھی۔ اپنا فیورٹ کلمر کا سوٹ پہنا۔ ہونٹوں پہ لپ اسٹک لگائی۔ خود کو آئینے میں دیکھ کے وہ مطمئن تھی۔ کھلے بالوں کو کچر میں جکڑے اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔ چہرے اور آنکھوں میں خوشیوں کی چمک تھی۔

تیار ہو کے اس نے اشعر کے کمرے کا دروازہ ناک کیا۔ وہ اسی کے انتظار میں تھا۔

ظاہر لغاری دونوں کو اکٹھے جاتے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

دریکٹا کے لیے اشعر نے فرنٹ ڈور کھولا تو وہ جھجک سی گی۔

”بینصیں جلدی۔“ وہ اسے تذبذب میں دیکھ کر بیزار سا ہوا۔

دریکٹا خاموشی سے قدرے سائیز پہ ہو کے بیٹھ گی۔ اس حد درجہ احتیاط کے مظاہرے پہ وہ کھول سا گیا۔ ”میں کوئی موم کا بنا ہوا نہیں ہوں جو پتھل جاؤں گا۔ آرام سے بینصیں۔“ دریکٹا بالکل دروازے کے ساتھ لگ کے بیٹھی تھی آدھی سیٹ تقریباً خالی تھی۔ دیکھتے ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔ لہجہ اس کا سخت ہی تھا۔ دریکٹا کو بڑی طرح محسوس ہوا۔ اسے رونا ویسے بھی بہت جلدی آتا تھا۔ لیکن اس وقت آنسو کنٹرول کرنے ضروری تھے۔ وہ پہا کے پاس جا رہی تھی۔ ان کے سامنے وہ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

اشعر سب سے پہلے ڈاکٹر سے ملا اور عمر زیب انکل کے بارے میں پوچھا۔ ”آپ کا مریض امپروو کر رہا ہے۔ آپ کے لیے خوشی کی بات ہے یہ ڈاکٹر عمران کی خاص توجہ عمر زیب پہ تھی۔ ان کی کیس سے وہ بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے

نے ہی اشعر کو یہ حوصلہ افزاء خوش سن بھرسنا۔ میرے پپا ٹھیک ہو جائیں گے ناں۔ دریکٹا نے بے تابگی سے پوچھا تو ڈاکٹر عمران مسکرا دیئے۔ ”جی ہاں میں بہت پُر امید ہوں۔ ان کی حالت میں بہتری کے آثار ہیں۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد وہ مکمل طور پر صحت مند ہو جائیں گے۔ آپ جائیں ان کے پاس۔ دیکھ لیں خود۔“ ڈاکٹر عمران ہلکی سی مسکراہٹ سمیت بولے تو دریکٹا تیزی سے کرسی سے اٹھ گی۔

عمر زیب آج بیڈ سے ٹیک لگا کے بیٹھے تھے۔

دریکٹا ان کے پاس جا کر بیٹھ گی۔ انہوں نے اس کی سمت دیکھا۔ آج ان کی آنکھوں میں ہوش مندی کے آثار تھے۔ وہ بولے تو نہیں پروا دیکھ کر ہی ڈاکٹر عمران کا کہا ج لگ رہا تھا۔ اشعر عمر زیب کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ دریکٹا خود ہی ان سے باتیں کرنے لگی۔ ”پپا آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں میں پھر آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔ طیب بھی بڑا ہو رہا ہے۔ آپ اسے دیکھ کے بہت خوش ہوں گے۔ وہ بالکل آپ کے لاڈلے شاہ زیب کی طرح ہے۔“ شاہ زیب ”عمر زیب آہستہ سے بڑبڑائے۔“ ہاں شاہ زیب۔“ دریکٹا کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ عمر زیب نے مدہم لہجے میں کچھ اور بھی کہا جو دریکٹا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بالکل ان کے قریب ہو کر بیٹھ گی۔ اتنے میں نرس آ گی۔ ان کی میڈیسن کا ٹائم ہو رہا تھا۔ دوائی کھلانے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ ایک ٹیبلٹ کے لیے لے گئی تو دریکٹا اور اشعر بھی واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

طیب نے ڈرتے ڈرتے پہلا قدم اٹھایا۔

اس سے پہلے اس نے دریکٹا کے سہارے کچھ قدم اٹھائے۔ لیکن یہ پہلا قدم اس نے خود سے اس کے سہارے کے بغیر اٹھایا تھا۔ دریکٹا نے چوم چوم کے اس کا منہ سرخ کر دیا۔ وہ بہت خوبصورت اور صحت مند ہو گیا تھا۔ تو قلی زبان میں کچھ لفظ بھی بولنے لگ گیا تھا۔ ہر نیا آنے والا دن طیب کے حوالے سے اس پہ خوشیوں اور حیرتوں کے دروا کر رہا تھا۔ آج طیب ہنسا آج طیب نے اس کی انگلی پہ کاٹا وہ ظاہر انکل کو دیکھ کے خوش ہوا۔ آج طیب کا ایک اور دانت نکلا۔ آج اس نے اتنے قدم اٹھائے۔ ایسی کتنی باتیں اور حرکتیں تھی طیب کی جو دریکٹا کو سارا دن مسرور رکھتی۔ وہ ایک سال کا ہو رہا تھا۔ دریکٹا اس کی ساگرہ منانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ظاہر انکل جوش و خروش سے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ دریکٹا نے گاؤں سے تینوں بچپا اور ان کی بیویوں سمیت سب کزنز کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ کچھ آس پاس کے ملنے جلنے والے تھے۔ یہ تو اچھی خاصی تقریب بن گی تھی۔

☆☆☆

ظاہر نے طیب کے لیے بہت سے کھلونے خریدے۔ اشعر نے بھی اس کے لیے کافی مہنگی شاپنگ کی۔ ظاہر انکل ایک خود جا کے لائے۔

سب مہمانوں کی موجودگی میں دریکٹا نے طیب کا ہاتھ پکڑ کے ایک کاٹا۔ سی گرین اور کارپلر کے کپڑوں میں ملبوس وہ خاصی توجہ سے تیار ہوئی تھی۔ ورنہ شادی کے بعد اس کے حلیے میں خاص تبدیلی نہیں آئی تھی جو بیابھتا عورتوں کا حصہ ہوتی ہے۔ آج تو سونے کی چوڑیاں، کڑے، بندے اور لاکٹ بھی اس کی گردن کی زینت بنا ہوا تھا۔ لمبے بالوں کو سینے پہ ڈالے وہ بڑی جاذب نظر لگ رہی تھی۔

سارہ بھی یہیں کے نزدیک کھڑی تھی۔ اُس نے ایک کاٹ کے سرو کیا۔ اشعر طیب کے قریب تھا سارہ نے کمال بے تکلفی سے ایک کا بڑا سا ٹکڑا اشعر کی طرف بڑھایا تو ناچار اُس نے منہ کھول دیا۔

تھوڑا سا حصہ سارہ کے ہاتھ میں رہ گیا تو اُس نے خود کھا لیا۔ اچانک دریکتا کی نظر پڑی۔ اُسے سارہ کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ وہ اشعر کے خاصے قریب کھڑی تھی۔ وہ اُسے خوشدلی سے باتیں کر رہا تھا۔ مہمان چلے گئے۔ سارہ اشعر کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی جانے کون سے موضوعات زیر بحث تھے جو ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

”مجھے اپنا گھر تو دکھائیں“۔ اُس نے اشعر سے فرمائش کی جو اُس نے جھٹ پوری کر دی۔ اُس نے سارہ کو پورا گھر دکھایا۔ آخر میں بیڈروم کی باری آئی تو وہ دریکتا اور طیب کے کمرے میں اُسے لایا۔ وہ تنقیدی نگاہ سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ دریکتا طیب کو سلانے اُن کے پیچھے پیچھے آگئی۔

اُس کی نگاہوں اور چہرے پر غصے کی سرخی بڑی واضح تھی۔ سارہ کو تو سمجھ ہی نہیں آئی۔ وہ مزے سے تبصرہ کر رہی تھی ایک ایک چیز پر۔ دریکتا نے طیب کو بیڈ پر لٹا دیا۔ اشعر سارہ کی طرف مڑا۔ ”آؤ سارہ دوسرے کمرے میں۔ یہاں طیب سو رہا ہے۔ ڈسٹرب ہوگا“۔ یہ الفاظ اُس نے بڑی بے تکلفی سے ادا کیے تھے۔ جیسے سارہ سے بڑی ذہنی ہم آہنگی ہو۔ دریکتا نے مشکل سے غصہ قابو کیا وہ اُسے کہنا چاہتی تھی طیب ڈسٹرب نہیں ہوگا آپ ہو رہے ہیں میری موجودگی سے۔ پر وہ اُسے بلند آواز میں یہ سب نہ کہہ پائی۔ وہ سارہ کے ساتھ اپنے دوسرے بیڈروم میں تھا جہاں اُس کا قیام تھا۔

”دھوکے باز، ڈرامے باز، انسان“۔ وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

شام میں سارہ جانے لگی تو اشعر نے کچھ اور دیر کرنے پر اصرار کیا۔ دریکتا کے تو تلوؤں تک میں آگ لگ گئی۔ جانے یہ سب کیا ہو رہا تھا کیوں ہو رہا تھا۔ اُسے غصہ کیوں آ رہا تھا۔ وہ سارہ کے ساتھ بات کرتا ہے تو کرے۔ اُسے کیوں اتنی جھلن ہو رہی ہے۔ وہ اُسے توجہ کے قابل ہی نہیں تصور کرتی تو کیوں اُسے ذہن پر سوار کر رہی ہے۔

یہ وہی شخص ہے جس سے میں لاکھ کوشش کے باوجود خلع نہیں لے پائی تھی۔ مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں مجبوری کی حالت میں اس شخص کے گھر ہوں مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

دریکتا نے خود کو باور کرایا۔ پرکاش یہ آسان ہوتا۔ اُسے سکون نہیں مل رہا تھا۔

طیب تو سو گیا تھا پر اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ اُس کا جی چا رہا تھا۔ ساتھ والے بیڈروم میں سکون کی نیند سونے اشعر کو زبردستی اٹھا دے۔ اُس کا حشر نثر کر دے۔ اُس کا حلیہ تک بگاڑ کے رکھ دے۔ وہ خود کو پہچان ہی نہ پائے۔

پر یہ آسان نہیں تھا۔ وہ کڑیل قد آور نوجوان تھا اور دریکتا میں سچ سچ اتنا دم نہیں تھا جو اُس کا حلیہ بگاڑ سکتی۔

☆☆☆

باسط بہت سنجیدہ لگ رہا تھا۔ اُس کی بات سن کے مارہ خاموش ہو گئی تھی۔ بالآخر اُسے باسط کی بات ماننا پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا ہم دونوں کو اپنا چیک آپ کروانا چاہیے میں ابھی تک باپ کیوں نہیں بنا ہوں۔ اُس کے ذہن پر باپ بننے کا بھوت سوار تھا۔

دونوں نے ایک مہنگے اور اچھے ڈاکٹر سے چیک آپ کروایا۔ اُس کے بعد باسط اُسے ایک اور گانا کالوجسٹ کے پاس لے گیا۔ وہاں بھی اُن دونوں نے چیک آپ کرایا۔ پھر لیڈی ڈاکٹر نے اُن دونوں کے مختلف ٹیسٹ کیے۔ اسی ایک دن میں باسط ایک تیسرے ڈاکٹر کے پاس بھی گیا۔ تینوں ڈاکٹر مہنگے ترین اور اپنی فیلڈ میں کامیاب تھے۔

مارہ کو اُس کی دیوانگی سے خوف آ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیسا جنون سوار ہو گیا تھا اس پر۔ اُس نے چند دن کے لیے باسط سے پاکستان چلنے کو کہا۔ خلاف توقع وہ راضی ہو گیا۔ ”چلو وہاں سے بھی دونوں اپنا چیک آپ کرائیں گے“۔ اُس نے تجویز دی تو مارہ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

تینوں ڈاکٹر نے رپورٹس دینے کے لیے بعد میں بلایا تھا۔ باسط اُسے پاکستان لے آیا۔ ٹیسٹ کی رپورٹس کی بابت جاننے کے لیے وہ فون بھی کر سکتا تھا۔ اس لیے مطمئن تھا۔

☆☆☆

اشعر کا انتظار اُسے بے تابی سے تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے گیٹ کے پاس ٹہل رہی تھی۔ اُس نے شکر ادا کیا جب اشعر کی گاڑی کا مخصوص ہارون بجا۔ چوکیدار گیٹ کھول چکا تھا۔ اشعر نے گاڑی پورچ میں روکی۔ وہ اُس کے قریب پہنچ گئی۔ ”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے“۔ اُس نے سلام دعا کا تکلف نہیں کیا۔ چھوٹے ہی بولنے اُس کے انطربانی تاثرات اور اندرونی بیجان سے سرخ ہوتا چہرہ اتار رہا تھا کہ بات اہم ہی ہے۔ ورنہ وہ اس کے انتظار میں یوں گیٹ کے آس پاس چکر نہ لگا رہی ہوتی۔ ”اگر آپ مجھے چیخ کرنے کی اجازت دے دیں اور ساتھ میں کچھ کھالوں پہلے۔ پھر اُس کے بعد بات کر لیجیے گا۔ کیا خیال ہے“۔ اشعر نے اپنے یونیفارم کی طرف اشارہ کیا تو دریکتا شرمندہ سی ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے آپ پھر فارغ ہو جائیں میں بعد میں بات کر لوں گی“۔ وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اشعر اُس کی ضروری بات کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اُس نے کرنی تھی۔

پہلے اُس نے یونیفارم تبدیل کیا پھر پیپا کے ساتھ کھانا کھایا کچھ دیر اُن کے ساتھ گپ شپ کی۔ اتنے میں اُن کے دوست کی کال آگئی۔ ضروری کام تھا اُسے گھر سے باہر جانا پڑ گیا۔

دریکتا کو بہت غصہ آیا۔ اُسے اب پھر نئے سرے سے انتظار کرنا تھا۔

اشعر کا انتظار کرتے کرتے اُس کی آنکھ ہی لگ گئی۔ پھر خود ہی آوازوں سے اُس کی نیند ٹوٹ گئی ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔

وہ پوری طرح بیدار ہو گئی اُسے یاد آ گیا کہ اشعر سے بات کرنی تھی۔ اُس نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر پاؤں میں جوتے پہنے۔ طیب بے خبر سویا ہوا تھا۔ وہ دبے قدموں اشعر کے کمرے کے دروازے تک آئی۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے کھل گیا چوپٹ۔

اشعر یقیناً ہاتھ روم میں تھا۔ شاور چلنے کی پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد شاور بند ہو گیا۔ اور دروازہ کھلا۔

اشعر ٹراؤزر میں ملبوس شرٹ کے بغیر باہر آیا۔ اُس کے گیلے جسم پر ابھی ابھی پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور سر کے بالوں میں نمی اسی طرح موجود تھی۔ سینے اور بازوؤں پر موجود گھنے بال بھی ہنوز گیلے تھے۔

دریکتا کو شرم آگئی اس حلیے میں اُسے دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہوا تھا۔ اشعر کو یاد آ گیا کہ دریکتا نے کسی ضروری بات کا کہا تھا۔ تو گویا اسی بات کے لیے وہ اس وقت اُس کے پاس آئی تھی۔ ”خیریت“ وہ گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتا اُس کے پاس ہی صوفے پر ٹپک گیا۔ دریکتا بچھتے لگی۔ صبح بات کر لیتی تو اچھا تھا۔

”آپ نے شام میں کسی ضروری بات کا کہا تھا۔ مجھے کام سے جانا پڑ گیا۔ خیر آپ بات کریں۔“ وہ اُسے تو لٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ”میں صبح بات کر لوں گی آپ آرام کریں۔“

اُس کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا وہ اُنھ کھڑی ہوئی۔ اشعر نے اُس کا ہاتھ پیچھے سے پکڑ لیا۔ وہ گرتے گرتے پچی۔ اشعر کی مضبوط مردانہ گرفت اُس کے حواس معطل کر گئی۔ ”بات کریں جو ہے۔“ وہ شاندار اُس کی نروس نہیں کی وجہ جان گیا تھا۔ وارڈ روم سے شرٹ نکال کے پہنی اور پھر اُس کی طرف آیا۔ گھڑی کی ٹنگ ٹنگ در یکتا کو اپنی دھڑکنوں کی طرح کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ اتنی خاموشی سی طاری تھی۔ کچھ کہتی بولتی، راز ان سے بھید کھولتی۔ کچھ تو تھا اس خاموشی میں۔ جو در یکتا دھڑکنوں کے شور سے گھبرا گئی تھی۔

اُس کی سوچوں میں انقلاب آ رہا تھا۔  
خوشگوار انقلاب۔

☆☆☆

باسط نے یہاں بھی مختلف ڈاکٹرز سے اپنا اور ماہرہ کا چیک اپ کرایا۔ جس تو اتر سے وہ ڈاکٹرز کے پاس خود بھی جا رہا تھا اور ماہرہ کو بھی لے کے جا رہا تھا۔ اُس سے نہ جانے کیوں بینا پریشانی محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے دو جگہ سے رپورٹس اور مختلف ٹیسٹ کی بابت معلوم کرایا تھا۔ دونوں جگہ سے ایک ہی بات علم میں آئی تھی کہ بظاہر ماہرہ، جوان اور تندرست ہونے کے باوجود بھی ماں نہیں بن سکتی۔ آج اُس نے ایک اور ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ یہ مشہور گانا کالوجسٹ فرخندہ امین تھی۔ اُس نے ماہرہ کے ساتھ باسط کو بھی بلوایا تھا۔

اب وہ دونوں اُن کے سامنے بیٹھے تھے۔ ماہرہ اور باسط کی رپورٹس ٹیبل پہ موجود تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر فرخندہ نے بتایا تھا کہ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد ماہرہ میں ایک اندرونی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اب وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ پھر بھی اُس نے باسط اور ماہرہ کا دل رکھنے کے لیے کہا کہ آپ نا امید نہ ہوں۔ دعا کرتے رہیں شاید کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔

باسط خالی خالی نگاہوں سے ڈاکٹر فرخندہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔

ڈاکٹر فرخندہ نے اگلے مریض کو بلوایا تو باسط کے ساتھ ماہرہ بھی اُنھ کھڑی ہوئی۔

گاڑی کا دروازہ کھول کے باسط ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا تو اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے اُس نے گاڑی اشارت کی۔ ماہرہ ڈر گئی تھی کہ کہیں وہ کوئی حادثہ ہی نہ کر بیٹھے۔ لیکن وہ خیریت سے گھر پہنچ گئے۔

بینا اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ ”کیا کہا ڈاکٹر نے؟“ اُس نے بے تابی سے پوچھا تو جواباً باسط نے ماہرہ کی رپورٹس اُن کی طرف بڑھا دی اور خود اندر بڑھ گیا۔ ماہرہ اتنی دیر سے برداشت کر رہی تھی۔ اب سب برداشت اور صبر کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اُن کے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ ”خالہ میں اب ماں نہیں بن سکتی کبھی بھی۔ باسط کو وہ خوشی نہیں دے سکتی جسے وہ میرے وجود میں تلاش کر رہا ہے۔ میں بجز دھرتی ہوں۔“

بینا کے آنسو بھی بہنے لگے۔ کچھ بھی سمی۔ باسط کے حوالے سے وہ بھی کسی خوشخبری کے انتظار میں تھی۔ ماہرہ اس کے بعد کمرے میں جا کے لیٹ گی۔ بیڈ کے دوسرے سرے پہ باسط لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ سانسوں کی

سربراہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ماہرہ کا جی چاہ رہا تھا باسط کے گلے لگ کے اتار دے کہ اُس کا سارا وجود تک بیچک جائے۔ پر وہ اجنبی بنا ہوا سو رہا تھا۔

یہ ماہرہ کا خیال تھا کہ باسط سو رہا ہے۔

وہ سو نہیں رہا تھا۔ اُس کے بے آواز آنسو بھی اُس کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو نہیں روک سکتے تھے۔ اُس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل بھی جل رہا تھا اور اس آگ میں سب کچھ راگہ ہو رہا تھا۔ ماہرہ کے ساتھ عشق محبت، زندگی بھر کے وعدے قسموں کے بھرم سب کچھ ختم ہو رہا تھا۔

اپنی اپنی جگہ پہ وہ دونوں ہی ختم ہو رہے تھے۔

☆☆☆

اندرونی کشمکش اور اس جذباتی صدمے نے ماہرہ کو ہاسپٹل پہنچا دیا۔ اُسے شدید قسم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ باسط چند گھنٹے مارے بندھے وہاں اُس کے پاس رکا اور پھر دعویٰ جانے کی خوشخبری سنا کر گھر آ گیا۔ اُسے پیکنگ کرنی تھی۔ ماہرہ اُس کے ساتھ نہیں جا رہی تھی وہ اکیلا ہی تھا۔ وہ ماہرہ کو عام سے انداز میں بتا کر اور مل کر رخصت ہوا۔ اُس میں گزشتہ ہز جوش و آرائی نثار تھی جس کا تجربہ ماہرہ کو دعویٰ میں اُس کے ساتھ ہوا تھا۔ ماہرہ کا احساس زیاں کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

دُکھ کے اٹھا سمندر میں اکیلا چھوڑ کر باسط چلا گیا۔ وہ اکیلی تھی۔ اپنی بے بسی اور تنہائی پہ اُس نے کتنے ہی آنسو چپکے چپکے خاموشی سے دل میں اتار لیے۔

بینا خالہ اُس کے ساتھ تھی پر پھر بھی اُس کی تنہائی حد سے سوا تھی۔

☆☆☆

طلاق کے پیچڑ باسط کے سامنے پڑے تھے۔

دعویٰ واپس آتے ہی اُس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔ سائن کر کے اُس نے پیچڑ دو بار لفافے میں ڈال دیئے۔

ماہرہ سے صلہ کی کا فیصلہ کرتے ہوئے اُسے دکھ تو ہوا تھا مگر اب اُس کے فیصلے میں کسی بھی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ اُس نے خوب سوچ سمجھ کے اور خود کو مزید کرب و آذیت سے بچانے کے لیے یہ انتہائی اقدام کیا تھا۔

ماہرہ کے ماں نہ بننے کا جان کر اُس کا کرب حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔

اُس نے محبت کو پانے کے لیے ماہرہ سے شادی تو کر لی پر اس احساس سے پیچھا نہ چھڑا سکا کہ ماہرہ شاہ زیب کی تنہائیوں اور قمر بتوں کی ساتھی رہی ہے۔ یہ احساس اُس کا دل چیرتا تھا کچھ کے لگا تا تھا اندر ہی اندر مارتا تھا۔ ماہرہ کو پانے کے بعد بھی اُس کی پیاس اُدھوری تھی اُس کا وجود اُدھورا تھا۔ ماہرہ اُس کی بھر پور جذباتی قربت کے بعد بھی اُسے باپ نہ بنا سکی۔ وہ خود اُدھوری عورت تھی۔ جسے شاہ زیب نے مکمل کیا تھا۔ اور مرنے کے بعد اپنی نشانی اُس کی گود میں اُس کی کوکھ میں چھوڑ گیا۔ اور ماہرہ اُسے کچھ بھی نہ دے سکی۔ سب کچھ تو اُس نے پہلے ہی شاہ زیب کو دے ڈالا تھا۔ باسط کے مقدر میں صرف آبلہ پائی اور تشنہ لبی تھی۔

ماہرہ اور شرین خاک کا جرم ناقابل معافی تھا۔

وہ بھی پڑھ لیا۔

باسط کو آخر کار پتہ چل گیا تھا کہ بیٹا اُس کی سگی ماں نہیں ہے۔ شریں کا انجانے میں کھولا گیا راز اُن کے ساتھ ساتھ اُن کی لاڈلی بیٹی کی زندگی کو بھی تباہ کر گیا تھا۔ حمزہ نے خط پڑھنے کے بعد پرزے پرزے کر دیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اور بھی یہ خط پڑھے اور باسط کے دکھ سے آگاہ ہو۔ جن کو پتہ نہیں تھا اُن کا لاعلم رہنا ہی بہتر تھا۔

باسط نے اگر شور نہیں مچایا تھا تو اُنہیں بھی خاموش رہنا چاہیے تھا۔ جو ہوتا تھا۔ ہو گیا تھا۔ وقت سے نکلا تیر کمان میں واپس نہیں آ سکتا تھا۔

☆☆☆

عمر زیب آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہے تھے۔ طاہر لغاری اُنہیں دیکھنے گئے تو اُس بار انہوں نے کچھ باتیں بھی کیں جن میں ہوش مندی کا تاثر واضح تھا۔

دوسری بار دیکھا بھی اُن کے ساتھ گئی۔ اُس کا جی چارہا تھا۔ وہ طیب کو بھی ساتھ لے کے جائے۔ پر طاہر انگل نے اُسے آرام سے منع کر دیا۔ دریکٹا نے دوبارہ نہیں کی۔ طیب کی حرکتیں دن بہ دن بہت پیاری ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ اُس کی چال میں ڈر اور خوف نہیں تھا۔ وہ تو تلی زبان میں ماما کی گردان بھی کرتا تب دریکٹا کو اُس پہ نوٹ کے پیار آتا۔ وہ چیزوں کو ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پالتو طوطوں کو دیکھ کے خوش ہوتا، ہوا میں ٹانگیں چلاتا، قلقلاریاں مارتا۔ اُس کی سب معصوم حرکتیں دل موہ لینے والی تھی۔

☆☆☆

اشعر بڑی دیر سے بیدار ہوا۔ چھٹی کا دن تھا وہ جی بھر کے سویا تھا۔ کسی نے ڈسٹرب بھی نہیں کیا تھا۔ اُس کی آنکھ خود ہی کھلی۔ اُس نے بیڈ سے اتر کے گلاس وینڈو سے پردے ہٹائے تو خوشگوار دھوپ کی کرنیں کمرے میں در آئیں۔ سامنے لان کا منظر واضح تھا۔ پیا کری پہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ دریکٹا نیچے گھاں پہ بیٹھی طیب کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گر جاتا پھر گرتا پھر اٹھتا۔ دریکٹا تالیاں بجا کے اُس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اشعر بھی نیچے لان میں آ گیا۔

”وہ طاہر لغاری کے پاس بیٹھ گیا وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ اشعر کی توجہ طیب کی طرف تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کی طرف آنے لگا۔ دریکٹا اُس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اشعر نے آگے بڑھ کر طیب کو گود میں اٹھا لیا۔“

وہ اُس کے پاس آ کے خوش تھا۔ اُس کی شرٹ کے بٹنوں اور ریٹ وائچ کو بار بار چھیڑ رہا تھا۔ کبھی اُس کے بال پکڑ لیتا اور کبھی اپنی چھوٹی انگلی اُس کی آنکھوں میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اشعر اُس کی شرارتوں اور معصوم حرکتوں کو انجوائے کر رہا تھا۔ دریکٹا بھی اُن کے پاس آ کے بیٹھ گئی۔ طیب اب اُس کی گود میں جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرے کپڑے نکال دو اور پھر ناشتہ بناؤ۔ پہلے میں فریش ہوں۔“ اشعر کا مخاطب سو فیصد دریکٹا ہی تھی۔ لہجے میں شوہرانہ تحکم بڑا واضح تھا۔ طاہر انگل سامنے بیٹھے تھے ورنہ وہ جی بھر کے حیران ہوتی۔ لیکن اب تو اُس نے حیران ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ نکتہ وہ طاہر انگل کے سامنے ہی تو ”شوہریت“ جتا تھا۔

اُس نے ماڑہ کو شادی کے بعد طیب کے ساتھ ہر قسم کے تعلق سے منع کر دیا تھا۔ وہ پھر بھی اُسے لے کر ڈاکٹر کے پاس گی۔

جب وہ ناراض ہوا تو شریں خالہ اُن کے گھر لڑنے پہنچ گئیں۔ ورنہ وہ حقیقت اُس پہ کبھی نہ کھلتی کہ بیٹا اُس کی سگی ماں نہیں ہے۔

اس زہریلے سچ نے اُسے پہلی بار زلایا تھا اور دوسری بار وہ ڈاکٹر کی رپورٹس دیکھ کے رویا۔ ماڑہ کے ساتھ وہ مزید نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر وہ ماں بن جاتی تو شاید وہ اُس کے ساتھ زندگی گزار ہی دیتا لیکن اب ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ماڑہ کے ساتھ وہ ویسے بھی تو ایک اذیت مسلسل میں تھا۔ شریں خالہ نے نادانستگی میں جو کڑوا جج اُڑا تھا وہ باسط کو اُن سے بہت دور لے گیا تھا۔ کاش وہ اس سچ سے آگاہ نہ ہوتا یونہی بے خبری میں زندگی گزار جاتی۔

ماڑہ کے ساتھ ساتھ شریں خالہ کو بھی تو سزا ملنی چاہیے تھی۔ وہ کون سا اُس کی سگی خالہ تھی۔ ماڑہ کی ماں تھی۔ اور ماڑہ اب اُس کے لیے پرانی ہو گئی تھی۔ صرف ایک اجنبی عورت۔

اب باسط کا اُس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا۔

☆☆☆

کوریر دوپہر میں وہ لفافہ دے گیا تھا۔ بیٹا نے ٹیبل پہ رکھ دیا اور ماڑہ کو آواز دے کے دیکھنے کے لیے کہا۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ بیٹا خالہ کے بلانے پہ اُن کی طرف آ گئی۔ اُنہوں نے ٹیبل پہ پڑے لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

”دیکھ لو پتہ نہیں کہاں سے آیا ہے کس نے بھیجا ہے۔“ اُن کے لہجے سے ہی لفافے سے متعلق اُن کی عدم دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔

ماڑہ نے اُلٹ پلٹ کے دیکھا۔ یہ اسی کے نام تھا اور باسط کی طرف سے آیا تھا۔ وہ وہیں کرسی گھسیٹ کے بیٹھ گئی۔ انجانے دوسوں اور خیالات سے اُس کا دل کانپ رہا تھا۔ جانے اس لفافے میں کیا تھا جو باسط نے بھیجا تھا۔ اُس کی خاموشی سے بیٹا بھی اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کیا ہے کس نے بھیجا ہے؟“ ”پتہ نہیں کھول کے دیکھتی ہوں۔“ اُس کے خیالات اس سے جانے کہاں کہاں جا رہے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اندر موت کا پروانہ تھا اس کے لیے۔ باسط نے بڑی بے دردی سے اُسے اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیا تھا۔

وہ تیور کے ادھر ہی گری۔

بیٹا کو ہاتھ پاؤں پڑ گئے۔ اُس نے مشکل سے ماڑہ کو سیدھا کیا اور گھبرا کے سب کو زور زور سے آوازیں دینے لگی۔ سب سے پہلے حمزہ اور ایاز باہر نکلے۔ بیٹا اور ایاز نے ماڑہ کو اٹھا کے کاؤچ پر لٹایا۔ بیٹا پانی لے آئی۔ اور ماڑہ کے منہ پہ چھینٹے مارے۔ ”ہوا کیا ہے؟“ حمزہ پریشانی سے بولے۔ ”کوریر کوئی لفافہ دے گیا تھا میں نے کہا دیکھو کس کا ہے۔ اس نے کھولا۔ دیکھا اس کے بعد سے یہ حالت ہے اس کی۔“ ”کہاں ہے لفافہ؟“ ”وہ ٹیبل پہ ہے۔“ بیٹا نے اٹھا کے پہلے خود دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ لفافہ پیر زسٹ اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔

حمزہ نے اٹھایا۔ ماڑہ کی طلاق کے کاغذات اُن کا منہ چڑا رہے تھے۔

ماڑہ کی بے ہوشی کا راز اسی لفافے میں بند تھا۔ طلاق کے کاغذات بکے ساتھ ایک چھوٹا سا خط بھی تھا۔ حمزہ نے

اس قدر تیر ہوئی وقت کی رفتار کہ بس

کل بھی صدیوں کی مسافت سے پرے تھے دونوں

درمیان آج بھی پڑتی ہے وہ دیوار کہ بس

مائرہ کھڑکی والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کتنی دیر سے بیٹھی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ باہر بہت رونق اور شور تھا۔ ہلسی مذاق، تہقہ، باتوں کی آوازیں، دنیا کی رنگینیاں سب کچھ ہی تو تھا۔

اگر کچھ اجڑا تھا کہیں کوئی تبدیلی آئی تھی تو وہ صرف اور صرف اُس کے خیالات میں۔ ورنہ باقی دنیا ویسی کی ویسی ہی تو تھی۔

اُس کا ہنسنا بولنا سب ختم ہو گیا تھا۔ ایک اُداسی اور کرب تھا جس نے دل میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ شریں اور اورنگزیب کے لیے جوان بیٹی کے دوسری بار اجڑنے کا صدمہ بہت بڑا تھا۔ اورنگزیب تو بیمار پڑ گیا تھا۔ شریں مائرہ کو دیکھ دیکھ کے روتی۔ وہ مجھ کے رہ گئی تھی۔ وہ خوشگوار رہی، وہ تازگی اور اُس کی شخصیت کا جادو جو سرچھنر کے بولتا تھا سب ماضی کا حصہ بن کے رہ گیا تھا۔

شریں مائرہ کی طلاق کے بعد بہن اور بہنوئی سے لڑنا چاہتی تھی اُن سے جواب طلب کرنا چاہتی تھی جو کچھ باسط نے اُس کے ساتھ کیا تھا۔ پر مائرہ نے روک دیا تھا۔ لڑائی کرنے سے جھگڑنے سے جانے والے کارداں پلٹ نہیں سکتے تھے۔ اُس کے پاس بھی تو ماتم کرنے کے لیے کچھ ہونا چاہیے تھا۔

مائرہ کے سامنے آئینہ تھا۔ اُس آئینے میں سب کچھ واضح تھا۔ شاہ زیب کے ساتھ شادی، اُس کی والہانہ محبت، باسط کے ساتھ زندگی کا دوسرا دور، باسط کی دہری شخصیت اُسے ذہنی اذیت دینا اور بالآخر محبتوں کی حد۔

اُس نے شاہ زیب کی قدر نہیں کی۔ اور باسط نے اُسے قدر کے قابل نہیں جانا۔

مکانات عمل کتنا مکمل اور واضح تھا۔

اُس میں کہیں کوئی جھول اور کی نہیں تھی۔

انصاف تک مکمل تھا۔

☆☆☆

طاہر انکل اور اشعران دنوں بڑی باقاعدگی کے ساتھ عمر زیب کو دیکھنے ہا اسپتال جا رہے تھے۔ اشعر نے دریکتا کو کبھی بھی ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔

دریکتا کو طاہر انکل سے بڑی شکایتیں تھیں۔ ویسے تو وہ اُسے بہت چاہتے تھے بالکل لاسب اور شرہ آپنی کی طرح۔ لیکن ایک پھانس اُس کے دل میں گڑی ہوئی تھی۔ اشعر اُسے کتنی اہمیت دے رہا تھا کیا کر رہا تھا کیا سمجھ رہا تھا سب کچھ

طاہر انکل کے علم میں تھا اس کے باوجود انہوں نے کبھی اشعر سے کوئی پوچھ پچھ نہیں کی اُسے سمجھایا تک نہیں کہ تم بیوی کو بیوی کا مقام دو۔ وہ اتنے بچے تو نہیں تھے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے انجان بنے ہوئے تھے۔ اُن کے اعلیٰ درجہ کی بے حسی پہ

دریکتا کو ان دنوں بہت غصہ آنے لگا تھا۔

اشعر کا بیڈروم علیحدہ تھا کیا یہ انہیں نظر نہیں آتا تھا؟

وہ اپنی بات کرنے کے بعد منتظر تھا کہ کب حکم پہ درآمد ہوتا ہے۔

”آپ طیب کو دیکھیں میں جا کے نکالتی ہوں کپڑے۔“ وہ بھی بڑے گھریلو انداز میں بولی۔ اشعر کا کمر اوپر والے پوریشن میں تھا۔

اُس کے ساتھ ہی اشعر کا پرانا بیڈروم تھا جو اب دریکتا اور طیب کے استعمال میں تھا۔ اُس کے کپڑوں کی الماری اپنے بیڈروم میں ہی تھا جہاں وہ تاحال مقیم تھا۔

دریکتا نے ایک پینٹ شرٹ جو سامنے نظر آئی نکال دی۔ وہ بھی طیب کو بازوؤں میں جھلاتا پیچھے آ گیا۔ دریکتا نے کپڑے بیڈ پر رکھ دیے۔ ”میچنگ نائی اور موزے بھی نکال دو۔“ اُس کا لہجہ سادہ اور آپ جناب کے تکلف سے مبرا تھا

آج اس بار اُسے سچ سچ حیرت ہوئی۔ ایک کونے میں نائیاں اور موزے ترتیب سے رکھے تھے۔ اُس نے اپنی پسند سے ایک نائی اور موزوں کا جوڑا لگ کر دیا۔ اُس کا کام مکمل ہو گیا تھا۔

دریکتا نے طیب کو لینے کے لیے بازو آگے بڑھائے۔ طیب اشعر کے ساتھ سختی سے چمٹ گیا۔ اُس کا موڈ نہیں تھا دریکتا کے پاس جانے کا۔ تب ہی وہ اشعر کے سینے

میں منہ چھپانے لگا۔ وہ جھنجھلائی گی۔ ”طیب میں کہتی ہوں میرے پاس آؤ۔“ اُس نے طیب کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ پر وہ شرارت کے موڈ میں تھا۔ اُس نے اشعر کی شرٹ مضبوطی سے پکڑ لی۔ ”آپ تو ہمارے پاس آتی نہیں

ہیں۔ مگر یہ میری محبت کو پہچان گیا ہے تب ہی تو دامن نہیں چھڑو پارہا ہے۔“ اشعر کا لہجہ اور مسکراہٹ بنا کی معنی خیز تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور چہرے سے نا دیدہ پسینے کے قطرے صاف کرنے لگی۔ طیب کو شاید خود ہی اُس کی حالت زار پر رحم آ گیا اب اُس کی طرف بازو بڑھا رہا تھا۔

”جاؤ طیب۔“ اشعر نے بازو کھولے اور اُسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ دریکتا نے اُسے اٹھایا اور باہر جانے کے لیے

پلیٹی۔ اشعر آگے راستے میں حائل تھا۔ طیب پھر اُس کی طرف جانے کے لیے چل رہا تھا۔ دریکتا کو جانے کیوں طیب پہ غصہ آ گیا۔ ”طیب آرام کرو۔“ طیب صاحب پہ اُس کے نرم لہجے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مزے سے دوبارہ اشعر کے پاس چلا

گیا۔ ”آپ جائیں میں اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ ناشتہ بنا لیں۔ میرے لیے۔“ اشعر نے اُسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا پر دریکتا خوشگوار حیرت میں گھری ہوئی تھی۔ اشعر کا جملہ نظر انداز کرنے والا نہیں تھا میں اپنے بیٹے کے ساتھ

کھیل رہا ہوں۔ اُس کے لب مسکرانے والے انداز میں کھل گے۔ ایک سرمستی کی حالت میں بیڑھیوں سے نیچے اتری۔ اُس کا

توانگ انگ جیسے جھوم اٹھا تھا اور دل ایک ہی جملے کی گردان کر رہا تھا۔ ”میں اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔“ اشعر کی سمت جانے والے راستوں کا فاصلہ اور بھی کم ہو رہا تھا۔

”یہ تو بہت ہی اچھا ہے نیک دل شہزادے کی طرح۔“ اُس کے دل نے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔

☆☆☆

ایسے ٹوٹے ہیں تمناؤں کے پندار کہ بس

میں نے جھیلے ہیں محبتوں میں وہ آزاد کہ بس

اک دھماکے میں زمانے میرے ہاتھ سے گئے۔

جانے بوجھتے یہ خاموشی کیا معنی رکھتی تھی۔  
وہ منہ انداز میں سوچنے پر مجبور ہو رہی تھی۔  
نہ جانے ایسا کیوں تھا؟

☆☆☆

مائرہ خاموش بیٹھی تھی شریں کتنی دیر سے سمجھا رہی تھی کہ ہنسا بولا کرو۔ جو ہوا بھول جاؤ۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اس غم کو سینے سے لگا کے کب تک بیٹھی رہو گی؟“  
”ای کیسے بھول جاؤں سب کچھ۔ میں ماں بھی نہیں بن سکتی۔ جس وجہ سے مجھے باسط نے چھوڑا ہے۔“ وہ دھیرے دھیرے پھر سے سلگنے لگی کسی شمع کی مانند۔  
”تم بانجھ تو نہیں ہو۔ طیب کو جنم دیا ہے تم نے۔ اولاد ہے تمہاری۔ حقیقت ہے وہ جا کے لے آؤ اُسے۔ تمہاری اپنی سگی اولاد ہے۔ اُس میں کھوکے بھول جاؤ گئی سب کچھ۔“  
شریں اس وقت پرانی باتیں بھول گئی تھی۔ اُس نے مائرہ کو طیب کے زیادہ قریب نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ روتا رہتا ماں کی آغوش کے لیے۔ کبھی ذہین اور کبھی وریکٹا کی گوویں ہوتا۔ مائرہ نے تین چاروں کے علاوہ اُسے کبھی اپنے پاس تک نہیں سلایا۔ اُسے خود فیڈ بھی نہیں کروایا۔  
اب شریں اُسی طیب کو واپس لانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

مائرہ کا دل خود تڑپ رہا تھا۔

طیب کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی تھی دل کے سمندر میں  
پراسے کس منہ سے واپس لاتی؟

سائرہ نے طیب کی ساگرہ کا آنکھوں دیکھا حال اُسے سنایا تھا جو دریکٹا نے چند ماہ پہلے منائی تھی۔ وہ طیب کی صحت مندی، اُس کی خوب صورت حرکتوں، معصوم شرارتوں کا تذکرہ کرتی تو مائرہ کا دل طیب کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے پھل پھل جاتا۔

زندگی کتنی بے رنگ اور بوجھل تھی۔

طیب اُس کے پاس آجاتا تو زندگی پھر سے خوب صورت اور انگلیوں سے بھر پور ہو جاتی تھی۔  
مائرہ کو اس بات کا کھل یقین تھا۔

اب رات کی تنہائیوں میں طیب کے معصوم وجود کی کمی اُسے بُری طرح محسوس ہوتی۔ طیب کے چھوٹے چھوٹے بازو اُسے اپنے گرد لیے محسوس ہوتے تو خوشی ہی خوشی اُس کے وجود میں اتر جاتی۔

☆☆☆

اُن کمی کو سن لینا

اُن لکھے کو پڑھ لینا

چاندنی کے رستوں پہ منزلوں کو پالینا

کھیل ہیں رفاقت کے یا کہ یہ محبت ہے

اک اوپہ مرجانا

سب جہاں سے لڑ جانا

اک ہار ملنا اور

انگلیوں کا کٹ جانا

یوسٹوں کی بدنامی

یا کہ یہ محبت ہے

چاند بے حجاب آنا

ساحلوں پہ لہروں کا

پتھروں سے نگرانا

انتظام قدرت ہے

یا کہ یہ محبت ہے

اک نجیف لمحے کا زندگی پہ چھا جانا

اس بہار موسم کا

عین جہر میں آنا

دقت کی شرارت ہے

یا کہ یہ محبت ہے

بونے گل بکھر جانا

باغ کا نکھر جانا

بعد بارش برسات آسماں پہ قطروں کا

قوس ایک دھر جانا

شونخی سفارت ہے

یا کہ یہ محبت ہے

سفر واپسی پہ جب

فصل گل روانہ ہو

اس کے غم میں

چوں کا ٹوٹ کے بکھر جانا

بیڑ کی سخاوت ہے

یا کہ یہ محبت ہے

یا کہ یہ محبت ہے

اشعر طیب کو بازوؤں میں لیے ہوا میں اچھال رہا تھا۔



جی پچھ نہیں ہے اپنے لاڈ لے سپوت کو۔ پہلے وہ سارے سوالوں کے جواب حاصل کرے گی۔ اس کے بعد ہی بہاروں کی دادی میں قدم رکھے گی۔

وہ اتنی گئی گزری نہیں ہے۔

اشعر لغاری کو بھی تو معلوم ہونا چاہیے۔

☆☆☆

ماڑہ شریں اور اورنگزیب کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی تھی۔ ”میں طیب کو دریکتا سے لے آؤں گی۔ نوید اور ہارون چچا بتا رہے تھے کہ عمر چچا صحت یاب ہو رہے ہیں۔ میں ان کے پاس جاؤں گی اور اپنے گھر میں طیب اور عمر چچا کے ساتھ رہوں گی۔ میں اپنی غلطیوں کی تلافی کروں گی۔ میں نے سب کچھ کھو دیا ہے کچھ محبتیں بچی ہیں۔ انہیں کھونے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے۔ میرا گھر خالی کروا دیجیے ابو۔“

ماڑہ اورنگزیب سے مخاطب تھی۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا کہ ماڑہ کو سچائی سے کیسے آگاہ کریں۔ وہ گھر انہوں نے نیلام کر دیا تھا یہ کہہ کر کہ اسے میں نے کرائے پدے دیا ہے۔ ماڑہ کو ابھی تک یہی خوش فہمی لاحق تھی کہ وہ شاہ زیب کے چھوڑے ہوئے کاروبار کی مالک ہے۔

اورنگزیب سر جھکائے شرمندہ شرمندہ سے بتا رہے تھے۔ وہ ماڑہ سے آنکھیں نہیں ملا پارہے تھے۔ ماڑہ کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ ابو اس کے ساتھ بھی ایسا کر سکتے ہیں۔ عمر چچا اور دریکتا کی جائیداد پہ قبضہ کرنے کا پلان اس کے سامنے ہی تو بنا تھا۔ پر ابو اور عاشر بھائی اس کی جائیداد بلکہ شاہ زیب کی چھوڑی ہوئی جائیداد کے ساتھ ایسا کر چکے تھے۔ سگے رشتوں پہ اندھا اعتبار تھا اسے۔ کس بڑی طرح یقین ٹوٹا تھا۔ ابھی تو باسط کے لگائے ہوئے زخم بھی نہیں بھرے تھے۔ انہوں نے اسے بالکل خالی ہاتھ کر دیا تھا۔

اسے دریکتا کا خیال آیا۔ اس نے بھی تو بتایا اورنگزیب پہ۔ اپنوں پہ اندھا اعتبار کیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ماڑہ کو وہیں سے سبق لینا چاہیے تھا۔ دریکتا تو اورنگزیب کے بھائی کی بیٹی تھی۔

پر ماڑہ تو اورنگزیب کی اپنی بیٹی تھی۔

بچ دریا میں اس کا سفینہ ڈوبا تھا۔

کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔

اورنگزیب اور شریں تو آنکھیں ہی نہیں ملا پارہے تھے اپنی سگی اولاد تک سے۔ ماڑہ کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ سرد مہری تھی۔

وہ اب ایک پل بھی حویلی میں رہنے کی روادار نہیں تھی۔

وہ اپنے پرانے ٹھکانے پہ لوٹنا چاہتی تھی۔

طیب اور عمر چچا کے پاس۔

آج بڑے دنوں بعد اسے اپنا احتساب کرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ شاہ زیب کی قبر پہ جا کے دل کھول کے روئی۔

مٹی میں مٹی ہوئے شاہ زیب سے معافی مانگی۔

دریکتا صوفے پہ بیٹھی بڑی محویت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے اشعر خود طیب کو اس کے پاس سے اٹھا کے لے گیا تھا۔ طیب کی تلقاریاں اس کی بے پناہ خوشی کا مظہر تھیں۔

اشعر اسے دریکتا کے پاس چھوڑنے آیا تو اس نے دوبارہ اشعر کے پاس جانے کی ضد شروع کر دی۔

اسی دن والا حساب تھا وہ اس کے سینے سے لپٹ گیا تھا۔

”میں اسے اپنے بیڈروم میں لے کے جا رہا ہوں۔ جب سو جائے تو اپنے پاس لے آئے گا۔“ اشعر طیب کو اٹھائے اس کے پاس سے گزرا تو دریکتا کو ردنا آ گیا۔ ”میرا کسی کو کوئی خیال ہی نہیں ہے میں کس کے پاس جا کے شکایت کروں۔ آخر مجھے کیوں اتنا دکھ ہوتا ہے۔ جب اشعر لغاری مجھے انور کرتا ہے۔ بتایا اورنگزیب، تائی شریں اور میرے خاندان کے کچھ اور لوگ اشعر کا میچ کچھ اور ہی بناتے رہے۔ نہ یہ جارحیت پسند ہے اور نہ انتقامی مزاج رکھتا ہے اور نہ ہی میں نے ابھی تک اس میں کوئی آوارہ مزاجی دیکھی ہے۔ نہ ہی عیاش طبع ہے (سارہ خود دلچسپی لیتی ہے مرنے سے اس پہ) دریکتا نے دلیل بھی ڈھونڈ رکھی تھی۔“

تو پھر سب کیوں ہے ایسا۔ کیوں اشعر کے غلط میچ کو میرے سامنے پیش کیا گیا تاکہ میں برگشتہ ہو جاؤں۔ وہ خلع بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ کل رات ہی تو طاہر انکل نے اسے کتنی حقیقتوں سے آگاہ کیا تھا۔

شاہ زیب کے کاروبار کی عاشر اور تائی اورنگزیب کے ہاتھوں بتا ہی۔

عمر زیب کے کاروبار اور حسابات میں گڑبڑ۔ اس کے بینک اکاؤنٹ کا خالی ہونا۔ اسے اور عمر زیب کو منظر سے ہٹانے کے لیے گاؤں بھیج دینا۔ اور عمر زیب کی صحت اور پھر اشعر لغاری کی فرضی فائرنگ کو جواز بنانا۔ ماڑہ کے گھر کی نیلامی۔

عمر زیب کے وفادار ملازموں کو کاروبار سے الگ کرنا۔

اسے اشعر لغاری سے خلع دلوانے کے لیے ایزی چوٹی کا زور لگانا۔

عاشر بھائی اور شریں تائی کی معنی خیز باتیں۔

سارہ کا اظہار افسوس اور طنز یہ انداز گفتگو۔

عمر زیب کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے سے کترانا۔

سب کچھ واضح تھا۔

طاہر لغاری نے کم و بیش سب کچھ اسے بتا دیا تھا۔

غم و غصے کا ایک طوفان اسے ساتھ بہا لے جانے کے لیے بے قرار تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے سے کتنے پردے سر کے تھے۔ اس روشنی میں پردوں کے ہٹنے کے بعد سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

ان میں اشعر لغاری بھی واضح تھا۔ اور اسے وابستہ وہ مہم سا جذبہ بھی اپنا آپ منوار ہا تھا۔ شور مچا رہا تھا۔ احتجاج کر رہا تھا۔ زور و شور سے ایک ہی بات کر رہا تھا کہ یہی تو محبت ہے۔ اب تو دل کے دروازے کھول دو۔ اب کاہے کا ڈرنا۔ اب کیسا شرمانا۔ کھل کے اقرار کر لو۔ مگر نہیں۔ ابھی نہیں۔ وہ اسے نظر انداز کیوں کرتا ہے۔ لڑیاں کیوں ہے اور طاہر انکل

پر آنسوؤں سے یہ آگ کہاں بچھنے والی تھی۔

پچھتاوے سے زندگی بھر کی ندامت کہاں ختم ہونے والی تھی۔

وہ شاہ زیب کی موت کی اپنی خوشگوار زندگی کے خاتمے کی، اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے خود ہی دور کرنے کی ذمہ دار تھی۔

مازہ بری طرح رو رہی تھی۔

ڈوبتا سورج بھی اُس کے ساتھ شرمندہ تھا۔

☆☆☆

مازہ دریکتا کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔

وہ اکیلی ہی جا رہی تھی۔ شریں شرمندہ تھی پر وہ بھی اُس کے ساتھ جانا چاہتی تھی اکیلے میں دریکتا کا سامنا کرنا اُس کے لیے محال تھا۔ مازہ کے ساتھ اُسے بھی کچھ حوصلہ مل جاتا۔ وہ گاڑی میں اُس کے ساتھ بیٹھی تو مازہ عدم توجہگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔

وہ شریں کی طرف دیکھ تک نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

عمر چچا کا گھر خالی پڑا تھا۔ بہت اجنبی اور پرایا پرایا سا لگ رہا تھا۔ اور نگزیب عاشر کے ساتھ گاؤں چلے گئے تھے۔ عمر محنت یاب ہو رہا تھا یہ خبر ہارون اور نوید نے سنا لی تھی جو اُن کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی انہیں اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا خوب اندازہ تھا۔ اور عمر کو جواب دہی کا احساس بھی۔

وہ عمر سے معافی مانگ لیں گے۔ آخری حل اُن کے پاس یہی تھا۔

عمر کا ظرف بڑا تھا۔ وہ انہیں معاف کر دے گا۔ اور نگزیب کو یقین تھا۔ ہارون اور نوید برابر عمر کے پاس ہاسپٹل جا رہے تھے۔ لیکن اور نگزیب کو ابھی تک ہمت نہیں ہوئی تھی عمر کا سامنا کرنے کی۔

☆☆☆

مازہ شاہ زیب کے بیڈروم میں کھڑی تھی۔ اسی کمرے میں وہ دو لہن بن کے آئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کمرے میں اُس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ کسی کی سانسوں کی ہلکی آواز محسوس ہو رہی تھی۔ یہ آواز صرف اُس کے محسوس کرنے کی حد تک تھی۔ حقیقت میں اس کا وجود نہیں تھا۔

شاہ زیب کے کپڑوں کی سرسراہٹ بھی واضح تھی۔ اُس کی خوشبو یہیں کہیں موجود تھی وہ بول رہا تھا آہستہ آہستہ۔ مازہ کان لگا کے سننے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ شاہ زیب کی آواز ہی تھی۔ ”مازہ تم ہار گئی ہو۔ میرے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے وہ محبت نہیں دی جس کا میں حق دار تھا۔ مازہ میں نے تو تم سے ٹوٹ کے محبت کی۔ اپنے پاپا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی پھر بھی تم نے میری آرزوؤں کو سیراب نہیں ہونے دیا۔ تم نے میرے طیب کو اکیلا چھوڑ دیا۔ تم مطلبی اور خود غرض ہو مازہ۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ تم اکیلی رہ گئی ہو۔ اپنی خود غرضی اور سفاکی سمیت اکیلی رہ گئی ہو۔“

اب آواز کے ساتھ ساتھ شاہ زیب کا وجود بھی واضح ہو گیا تھا۔ شاہ زیب نے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جو

مرنے سے پہلے آخری بار اُس کے جسم پہ موجود تھے۔

مازہ نے دہشت سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں نہیں میں اکیلی نہیں ہوں۔“ وہ چیختی چلی گئی۔ نیچے سے شریں بیڑھیاں جڑھ کے بھاگتی اُس کی طرف آئی۔ مازہ پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اب شاہ زیب غائب ہو چکا تھا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ اُس کے کپڑوں کی سرسراہٹ، نہ سانسوں کی مہک نہ اُس کی آواز۔

کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اور صرف مازہ کا اندرونی خوف اور پچھتاوے تھے۔

☆☆☆

مازہ اور شریں کو ظاہر نے عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور ساتھ ہی دریکتا کو آواز دی۔ مازہ بے تابی سے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی کچھ ہی دیر کے بعد دریکتا طیب کو اٹھائے اندر داخل ہوتے ہوتے وہیں ٹھٹھک کے رک گئی۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ مازہ بھاگتی یہاں آسکتی ہیں۔ بے اختیار اُس نے طیب کو سینے سے چمٹا لیا جیسے اُس کے چھن جانے کا اندیشہ ہو۔

”آؤ آگے دریکتا تمہارے گیٹ آئے ہیں۔“ دریکتا کی گھبراہٹ وہ بھانپ گئے تھے۔

طیب دو اجنبی مہمانوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

مازہ اُس کی طرف بڑھی۔ دریکتا نے بے بسی سے ظاہر انگل کی طرف دیکھا۔ جیسے اُن سے مدد مانگ رہی ہو۔ مازہ نے جھپٹ کے طیب کو اُچک لیا اور اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ وہ اس اچانک افتاد سے گھبرا کے رونے لگا۔ ”ماما ماما“۔ وہ امداد طلب لگا ہوں سے دریکتا کو دیکھتا مسلسل ماما ماما کی گردان کیے جا رہا تھا۔ جبکہ مازہ اُسے دیوانوں کی طرح چوم رہی تھی۔ ”میرا بیٹا، میرا طیب، میرا شہزادہ۔ میں ہوں ناں اپنے بیٹے کی ماما۔“ بہت عرصے کے بعد سب کچھ گنوا کے اُسے یاد آیا تھا کہ وہ طیب کی ماما ہے۔

دریکتا نے بڑی مشکل سے اُسے مازہ کی گود سے الگ کیا تو وہ رونے لگی۔ ”طیب میرا ہے میں اسے لینے آئی ہوں۔ پلیز اسے مجھ سے جدا نہ کرو۔ میں مر جاؤں گی۔“ اُس وقت آپ کہاں تھیں جب اسے آپ کی ضرورت تھی۔ یہ صرف میرا ہے میرے پاپا کا ہے میں نہیں دوں گی اسے۔“ دریکتا ضد میں آگئی تھی۔

”پلیز میں طیب کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔ میں نے بہت سزا پائی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ طیب مجھے دے دو۔“ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے رونے چیخنے کی آوازیں سن کے اشر بھی اس طرف آ گیا۔

اندر کا منظر بڑا حیران کرنے والا تھا۔

مازہ دریکتا سے طیب کو لینے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر ہو رہی تھی۔ ”نہیں نہیں میں نہیں دوں گی۔“ شریں خاموش تماشا بنی ہوئی تھی۔

وہ بے بسی سے کبھی مازہ اور کبھی دریکتا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ظاہر لغاری کا بھی یہی حال تھا۔ دریکتا نے ایسے رشت میں طیب کو اپنا یا تھا جب اُس کی جنم دینے والی ماں نے بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

وہ اُس کے لیے راتوں کو جاگتی تھی اپنے آرام کی قربانی دی تھی۔ اس گھر میں اپنے ساتھ لے کے آئی تھی کہ وہاں حویلی میں کوئی اُس کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نہ سگی ماں اور نہ نانی اور نہ نانا۔

طیب کے لیے دریکتا ہی سب کچھ تھی۔  
دوسری طرف ماڑہ تھی۔ طیب کو جنم دینے والی ماں۔ وہ اُس کا خون تھا۔ جس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

طیب اس کشمکش سے گھبرا کے بڑی طرح رورہا تھا۔  
اشعر آگے بڑھ آیا۔ اُس نے طیب کو دریکتا سے لے لیا۔ ”میرا بیٹا میرے پاس آئے۔“ اُس نے طیب کو پیار سے چمکارا۔ ماڑہ اُسے حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ طیب اشعر کے پاس جا کے پُر سکون ہو گیا۔ ”آپ سب بیٹھیں۔“ اُس نے ماڑہ، شریں اور دریکتا کو اشارہ کیا۔

ملنے ملانے سلام دعا کے مرحلے اب طے ہو رہے تھے۔ ماڑہ شرمندہ سی تھی۔  
دریکتا البتہ رورہی تھی۔ اُسے شاید آنے والے لمحات کا اندازہ ہو گیا تھا۔  
”طیب آپ ہی کا بیٹا ہے اور آپ ہی اس کی ماں ہیں۔“ اسے آپ سے کوئی نہیں الگ نہیں کر سکتا۔ دریکتا نے پھوپھو ہونے کے ناطے اس کی دیکھ بھال کی لیکن یہ آپ کا خون ہے۔ آپ آج ادھر ہی رکھیں کل صبح طیب کو لے جائیے گا اپنے ساتھ۔ تب تک اس کی اجنبیت بھی ختم ہو جائے گی۔ کیوں دریکتا۔“ وہ تائیدی نگاہ سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کیا بولتی۔ اُس کے گلے میں آنسوؤں نے پھندا ڈال دیا تھا۔ مزید سننے کی اُس میں تاب نہیں تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ گئی اور تقریباً بھاگ کے بیڑھیاں چڑھ کے اوپر آئی۔

اشعر طیب کو ماڑہ کے پاس چھوڑ کے اُس کے پیچھے آیا۔  
وہ اوندھی لیٹی بڑی طرح رورہی تھی۔  
اشعر نے کندھے سے پکڑ کر اُسے سیدھا کیا۔ دریکتا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ ماڑہ کو اپنا فیصلہ سنا چکا تھا اور دریکتا کو پتہ تھا اب اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اشعر نے اُس کے بال سہلائے۔ ”ماڑہ طیب کی ماں ہے۔ بھلا اُسے اپنی ماں سے دور کرنے کا ظلم کیوں کیا جائے۔ خون کی اپنی کشش ہے ایک دن طیب کو اپنی ماں کے پاس لوٹنا تھا۔ وہ آپ کے پاس امانت تھا۔ ہنسی خوشی اس حقیقت کو تسلیم کر لیں تو دل مطمئن ہو جائے گا۔ طیب اپنی ماں کے پاس جا رہے کسی اور کے پاس نہیں۔“

اشعر بہت نرم لہجے میں بات کر رہا تھا۔  
وہ دریکتا کے بہت پاس بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے ایسا موقع نہیں آیا تھا وہ رورہی تھی ورنہ ضرور محسوس کرتی۔  
طیب ماڑہ کے پاس ہی سویا۔

اُس کے روم روم میں سکون تھا۔ اس کے لیے وہ دریکتا کی شکر گزار تھی۔  
☆☆☆

باسط نے سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔  
اُس کے پارٹنر نے اُس کا فیصلہ خوش دلی سے مان لیا تھا۔  
باسط نے کینیڈا شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ فی الحال وہ پاکستان واپس جانا نہیں جاتا تھا۔ نہ سوال جواب کا سامنا کر سکتا تھا کیونکہ حمزہ احمد اور مینا سمیت ماڑہ کے گھر والے بھی اُس سے ناراض تھے۔

کچھ عرصے بعد حالات معمول پر آجاتے تو اُس نے واپس اپنے ملک آ کے نئی زندگی نئے سرے سے شروع کرنی تھی۔

وہ تیز تیز اپنے سارے کام منسارہا تھا۔  
اُس نے سیٹ بھی بک کروالی تھی۔

باسط تیار ہو کے باہر نکلنے ہی والا تھا جب ڈورنیل زوروار آواز میں بجی۔ اُس نے خود آ کے دروازہ کھولا۔  
باہر چار مسلح پولیس والے مخصوص یونیفارم میں ملبوس اُس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔  
واپسی کے راستے اور فرار کی راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ اس کا اندازہ بہت پہلے سے تھا باسط کو۔ پر اُسے عین آخری وقت میں شکست ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہر بار صفائی سے قانون کی نگاہوں میں دھول جھونکتا آیا تھا جو ایک عرصے سے اُس کے پیچھے لگی تھیں۔ کالے ہندوں اور کالے کرتوتوں کا یہی انجام ہونا تھا۔

باسط کو ایک لمبا عرصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا تھا۔  
ایک پولیس والے نے ہتھکڑیاں اُس کے بازوؤں میں پہنائیں اور دوسرے نے ٹھوکا دے کے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

باسط تھکے ہارے قدموں سے پولیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا۔  
☆☆☆

ماڑہ دریکتا کے ساتھ مل کے گھر کو جانے سٹوار نے میں لگی ہوئی تھی۔ اُن دونوں نے خود مل کے سارے کمروں کی سٹیجنگ کی تھی۔

عمر کا کمر اٹھیک کیا تھا۔ نئے پردے اور نیا قالین بچھایا تھا۔ دریکتا نے تازہ پھول توڑ کے گل دان میں سجا کے چھوٹی تپائی پر رکھے۔ طیب ان تمام سرگرمیوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

وہ ماڑہ کا دوپٹہ پکڑے اُس کے پیچھے پیچھے گھوم رہا تھا۔  
☆☆☆

نوید، ہارون اور نگزیب تاپا، اشعر اور طاہر کے ساتھ عمر کو ہاسپٹل سے گھر لانے کے لیے گئے تھے۔  
گاؤں سے سب رشتہ داران کے گھر آئے ہوئے تھے۔

عمر زیب اتنے ماہ ہاسپٹل میں رہ کے پہلی بار گھر آ رہے تھے۔  
دریکتا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

وہ دونوں سے ادھر پہا کے گھر پہنچے تھے۔ طاہر انکل نے ہی اُسے خوشخبری سنائی تھی کہ عمر بالکل صحت یاب ہو گیا ہے۔ تم تیاری کرو اسے خوش آمدید کہنے کی۔

تب سے وہ اور ماڑہ گھر کی حالت خود ٹھیک کرنے میں لگ گئی تھی۔  
وہ دونوں بے تابی سے انتظار کر رہی تھیں کہ کب عمر گھر آتے ہیں۔

ماڑہ نے نبھلا ڈھلا کے طیب کو نئے کپڑے پہنائے تھے۔ وہ بہت صحت مند اور پیارا لگ رہا تھا۔  
باہر گیٹ پہ ایک سے زائد گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی تو دریکتا اور ماڑہ کے ساتھ ساتھ نوزیہ اور فرح بھی

گیٹ کی طرف بڑھیں۔  
چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ دو گاڑیاں اکٹھے اندر داخل ہوئیں۔

سب سے پہلے طاہر اترے اور دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ عمر گاڑی سے نیچے اترے۔ سامنے ماثرہ طیب کو اٹھائے کھڑی تھی۔ وہ بھاگ کے عمر چچا کے گلے لگ گئی۔ اتنے میں اشعر بھی دوسری گاڑی سے اتر آیا اور طیب کو خود اٹھایا لیا۔ ماثرہ رو رہی تھی۔ آنسو عمر کی آنکھوں میں بھی تھے۔

”یہ لیں طیب کو بھی تو اٹھائیں کیسے آپ کی طرف دیکھ رہا ہے۔“ اشعر نے طیب کو اُن کی طرف بڑھایا۔ طاہر ہاسپٹل میں سب کچھ بتا چکے تھے۔ اُنہوں نے طیب کو سینے سے چمٹالیا۔ ”میرا بیٹا میرا شاہ زیب۔“ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑے۔ اس بار در یکتا، ماثرہ، فوزیہ، فرح کے ساتھ شریں بھی رو رہی تھی۔ طاہر کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

قدرت نے غم کے بعد خوشی دی تھی۔

سب خوش تھے۔ عمر زیب نے طیب کو گود میں اٹھایا ہوا تھا اُس کے ساتھ لا ذکر رہے تھے۔ ”اے اللہ عمر کے گھرانے کی خوشیوں کو ہمیشہ قائم رکھنا۔“ طاہر نے دل کی گہرائی سے دعا دی تھی۔

☆☆☆

طاہر لغاری اور اشعر رات کو کافی لیٹ گھر واپس آئے۔

عمر نے رات کا کھانا کھلائے بغیر اُٹھنے نہیں دیا۔ اُن کی باتیں ہی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔ عمر نے اشعر سے کہا بھی کہ رات ادھر ہی رُک جاؤ۔ پر اُس نے سلیقے سے معذرت کر لی۔

طاہر بہت خوش تھے۔ عمر صحت یاب ہو کے گھر آ گیا تھا۔ اُس کے گھر کی خوشیاں لوٹ آئی تھی۔ زندگی کا ٹوٹا سا راہیں سے جڑ گیا تھا۔

شاہ زیب کی جگہ ماثرہ اور طیب نے لے لی تھی۔

قدرت کی منشاء اور مرضی اسی میں تھی۔

ماثرہ نے بھی قسمت کے لکھے کو قبول کر لیا تھا۔

قدرت کے فیصلوں کی مصلحت وہ جان چکی تھی۔

اور یقیناً شاہ زیب کی روح بھی اب سکون میں تھی۔ کیونکہ رات اپنے بیڈروم میں سوتے ہوئے اُسے بالکل بھی ڈر نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

عمر طیب کے ساتھ بہت خوش تھے۔ ماثرہ صبح ناشتے کے وقت کبھی دودھ کا گگ کبھی آلیٹ اور کبھی بریڈ عمر کی طرف بڑھاتے ہوئے۔ کھانے پر اصرار کرتے ہوئے۔ مکمل طور پر ذمہ دار بہو کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔

در یکتا کو اُس کی یہ تبدیلی بہت خوشگوار لگی تھی۔

اُسے اب پاپا اور طیب کی طرف سے نگر مند ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماثرہ اُن کی دیکھ بھال بہتر طور پر کر سکتی تھی۔

اُس نے عمر زیب سے بہت ساری معافیاں مانگی تھیں۔

اُنہوں نے کھلے دل سے سب کچھ معاف کر دیا تھا۔

عمر کو طیب کے ساتھ ماثرہ پھر سے مل گئی تھی۔ ایک نئی زندگی کی امید۔ ایک نئی اُمنگ۔ وہ سب کچھ پرانے زخم پرانی تلخیاں بھول گئے تھے۔

اُن کا آج طیب کی صورت میں سامنے تھا۔

اُس کے ساتھ ہنستے مسکراتے، شرارتیں کرتے وہ خود بھی بچہ بن گئے تھے۔ وہ خوشیوں بھرے دن لوٹ آئے تھے۔ اُن کی دسترس میں تھے جو کچھ عرصہ قبل بچھڑ گئے تھے۔

عمر اپنے رب کے شکر گزار تھے جس نے طویل سیاہ رات کے بعد روشن چمکدار اجلا دن نصیب کیا تھا۔

اب طیب اور ماثرہ ہی اُن کی زندگی تھے۔

☆☆☆

سات دن ہو چکے تھے در یکتا کو پاپا اور ماثرہ کے ساتھ خوشیاں سمیٹتے ہوئے۔ اچانک وہیں بیٹھے بیٹھے ہی اُسے طاہر انکل اور اشعر کا خیال آیا۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی۔ اُن دونوں میں سے کسی نے بھی اُسے پوچھا نہیں تھا۔ نہ کوئی آیا تھا وہ خود ہی گھر جانے کے لیے پرتو لے لگی۔

اپنے کمرے میں آ کے کپڑے وغیرہ بیگ میں ڈالے پھر پہلے پاپا کو بتایا۔ وہ اور ماثرہ بھی اُس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ پاپا اور ماثرہ کے ساتھ سبز بیلوں سے ڈھکے گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ طاہر لغاری اُن سب کو دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ موسم خوشگوار تھا۔ وہ ادھر لان میں ہی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔

اشعر گھر میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ طاہر انکل نے در یکتا کو کھانے میں خصوصی اہتمام کرنے کا مشورہ دیا۔ عمر ماثرہ کے ساتھ پہلی بار اُن کے گھر آیا تھا۔

رات کے کھانے سے کچھ دیر پہلے اشعر کی واپسی ہوئی۔

بڑی چہل پہل سی تھی۔

طیب اُس کی طرف بھاگ کے آیا۔

طیب کو گود میں اٹھائے وہ عمر انکل اور در یکتا کی طرف آیا۔ عمر کھڑے ہو کر ملے اُسے گلے سے لگایا۔ در یکتا نے البتہ ایک اچھتی ہوئی نظر ہی ڈالی۔ اشعر نے بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔

عمر اور ماثرہ کھانا کھا کے گھر واپس گئے۔ طاہر انکل نے در یکتا کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ پہلے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اصل بات کی طرف آئے۔

”جب وہ خلع کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا تب تمہیں پتہ ہی ہوگا کہ اورنگزیب تمہارے تایا نے کون کون سے دھکانڈے استعمال نہیں کیے۔“ وہ پہلو بدل کے رہ گئی جانے طاہر انکل پرانی باتیں کیوں دہرا رہے تھے۔ ”تمہارے ذہن میں بہت سارے شکوے اور شکایتیں ہوں گی۔ ان ساری باتوں کا تعلق تمہارے تایا کے نامناسب رویے سے ہے۔ اشعر تمہیں بیاہ کے لے آیا پر وہ تمہیں موقع دینا چاہتا تھا کہ تم خود سے اُسے پرکھو، جانو اور تب خود فیصلہ کرو کہ آیا وہ کس طرح کا انسان

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریٹریوم ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ پیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

نے شکلوں کے شکایتوں کی نوبت ہی نہیں آنے دی تھی۔ اُس کا ہم سفر کتنا احساس اور کھجدار تھا۔

دریکتا نے بڑے غرور سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔

اشعرا اُس کا مان، انا، خودداری سب کچھ ہی تو تھا۔

صد شکر کہ وہ اُسے پہچان گئی تھی۔

اشعرا کی شریک نگاہیں کچھ نئی کہانیاں رقم کرنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ اور دریکتا میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔

اُس کی اپنی مرضی بھی تو یہی تھی۔

ختم شد



ہے۔ کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا اُسے بیان کیا گیا ہے یا ویسا ہے جیسا تم نے پایا ہے۔ تمہارے ذہن پہ بہت بوجھ تھا۔ تم مجبوری میں رخصتی کے لیے راضی ہوئی تھی وہ اس مجبوری سے فائدہ اٹھانے والوں میں سے نہیں تھا۔

اب تو تمہیں پتہ چل گیا ہوگا کہ وہ کس قسم کا نوجوان ہے۔ سواپنے دل کو ہر قسم کے منفی خیالات سے پاک کر لو۔ مجھے اشعر نے بتایا تھا کہ تم آج کل بہت غصے میں ہو۔ میں نے سوچا اس سے پہلے کہ میں بھی اس غصے کی لپیٹ میں آؤں۔ سب کچھ بتا دوں۔“

آخر میں وہ اُسے شرارتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تو وہ شرمندہ ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دل میں اُن کی سمجھداری کی قائل ہوگی تھی۔ واقعی اُس وقت ظاہر انکل یا اشعر میں سے اُسے کوئی کچھ کہتا تو وہ غلط ہی سوچتی۔ اب درست غلط سب کچھ اُس کے سامنے تھا۔

”اب جاؤ آرام کرو رات کانی ہوگی ہے۔ میری سب دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔“

اُسے سونے کا کہہ کر وہ خود بھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ دریکتا کو اپنے سامنے مزید شرمندہ ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

☆☆☆

اشعرا اپنے پرانے بیڈروم میں تھا جو اُس نے کبھی دریکتا اور طیب کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ دو تکیے سر کے پیچھے رکھے نیم دراز تھا۔ دریکتا اندر آ تو گئی تھی پر تذبذب کا شکار تھی۔

اشعرا نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔ بیڈ سے نیچے اتر آیا۔ ”میں اب مزید دوسرے بیڈروم میں اکیلا نہیں سو سکتا۔ چنانچہ آپ کو سب بتا دیا ہوگا۔ میں نے کہا تھا اپنی بہو کو خود ہی سمجھائیں میں اُس کے ساتھ دماغ نہیں کھپا سکتا۔“ اشعرا نے مسکراہٹ ہونٹوں میں ہی دہرائی اور اُس کا بازو پکڑا۔ دریکتا نے چھڑانا چاہا پر نہیں اشعرا نے دوسرا بازو بھی پکڑ لیا۔ ”اب نہیں، میں دوسرے بیڈروم میں سوتا تھا تو چپکے چپکے روتی تھی۔ مجھے بتاتی نہیں تھی پر۔“ اشعرا کھل کے ہنسا۔ ”جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے اپنی انسلٹ فیل ہوتی تھی اس لیے رونا آتا تھا۔“

وہ اشعرا کی قربت سے خائف ہو رہی تھی۔ ”میں تو چاہ رہا تھا کہ مجھے خود جانو، پرکھو، ورنہ میری بیوی تھی تم جملہ حقوق میرے نام تھے اور میں..... لیکن میری مضبوطی کی گواہ تم خود ہو۔ ہے ناں؟“ اشعرا نے اچانک اُسے خود سے قریب کر لیا۔

دریکتا نے پیچھے ہٹنا چاہا اشعرا کی گرفت سخت تھی۔ ”اب بھی بھاگو گی؟“ اشعرا نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کی مزاحمت کمزور پڑی۔ ”پانگل لڑکی میں بھی تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ پہلے تم میری غیرت پھر ضد بن گئی اور اب میری محبت ہو۔“ ”سچ“ دریکتا نے بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھا۔ ”ہاں سو فیصد سچ۔“

”اشعرا میں بھی آپ سے محبت کرنے لگی ہوں۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ مجھے آپ سے محبت ہوگی ہے۔“ وہ بے چارگی سے بولتی اُسے بہت اچھی لگی۔ ”اب تو کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ تمہیں مجھ سے محبت جو ہوگی ہے۔“ اشعرا سے محبت لٹاتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دریکتا نے اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اُس نے بھی اشعرا کی محبت کو قبولیت بخش دی تھی۔

اشعرا نے بڑی نرمی سے اُسے ہانہوں میں سمیٹتے ہوئے سب محبت بھرے جذبوں کو پذیرائی بخش دی تھی۔ اُس